تاریخ پبلی کیشنز کا کتابی سلسلہ (29)

سہ ماہی

تاریخ

ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلی کیشنز
18-مزنگ روڈ لاہور

خط و کتابت (برائے مضامین)

بلاک 1 ،اپارٹمنٹ ایف - برج کالونی، لاہور کینٹ

فون:042-6665997

ای میل:mubarakali21@yahoo.com

خط و کتابت (برائے سرکولیشن)

پبلشرز	:	تاریخ پبلی کیشنز
		18-مزنگ روڈ' لاہور
فون	:	042-7236634
قیمت فی شمارہ	:	100 روپے
سالانہ	:	400روپے
قیمت مجلد شمارہ	:	150 روپے
بیرون ممالک	:	2000روپے (سالانہ معہ ڈاک خرچ)
		رقم بذریعہ بنک ڈرافٹ بنام فکشن ہاؤس لاہور، پاکستان
اہتمام	:	ظہور احمد خاں
کمپوزنگ	:	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	:	اکرم پرنٹرز لاہور
سرورق	:	عباس
تاریخ اشاعت	:	اپریل2006ء
تقسیم کار	:	فکشن ہاؤس
		18-مزنگ روڈ' لاہور
فون	:	042-7249218-7237430
ای میل	:	fictionhouse2004@hotmail.com

فہرست

مضامین

☆معجزہ، اتھارٹی اور فیض رسانی	رضی الدین عاقل/ترجمہ: غافر شہزاد	7
☆آغاز کی نشان دہی	کرشن کمار/ترجمہ: ظہور چوہدری	44
☆سنگھ پریوار اور مطالعہ تاریخ	تانیکا سرکار/ترجمہ: ڈاکٹر اقبال کاردار	58
☆سماجی اور مذہبی ہم آہنگی کی تاریخی بنیادیں	احمد سلیم	68

کلاسک

☆ایک مغل شہزادے کی تعلیم	ظفر قریشی دہلوی	79
☆سترہویں صدی میں ہندوستان کی پارچہ بافی	مولانا شان الٰہی زبیری	86

تحقیق کے نئے زاویئے

☆مغل حرم	ڈاکٹر مبارک علی	107
☆تقسیم کے بعد کا سندھ	ڈاکٹر مبارک علی	113

تاریخ کے بنیادی مآخذ

مآثرِ عالمگیری

مصنف: محمد ساقی مستعد خاں

ترجمہ: مولوی محمد فدا علی طالبؔ

مضامین

معجزہ، اتھارٹی اور فیض رسانی

''دہلی سلطنت کے صوفی لٹریچر میں کرامات کی حکایات''

رضی الدین عاقل/ترجمہ: غافر شہزاد

دہلی سلطنت کے صوفیاء کے بارے میں موجود علم عمومی طور پر صوفیاء کے حکمرانوں سے تعلقات، اسلام کو پھیلانے اور ہندوؤں سے مسلمان بنانے، ثقافت اور مذہب کے مختلف پہلوؤں کو ملانے اور یکجا کرنے کے بارے میں سوالات کے گرد گھومتا ہے۔ اکثر یہ ترغیب دی جاتی کہ صوفیاء اپنے آپ کو سیاست اور اپنے عہد کی حکومت سے دور رکھیں وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ سیاست میں شمولیت مادیت اور دنیاداری کی جانب لے جاتی ہے، جس سے دور رہنے کی ان کی خواہش تھی۔ اس دوری کا یہ سبب بھی تھا کہ صوفیاء خیال کرتے تھے کہ شریعت کے نقطہ نظر سے سلطنت ایک غیر قانونی ریاست ہے۔ اسی لئے صوفیاء کے مختلف سلسلوں جیسے چشتیہ سے تعلق رکھنے والوں نے نہ صرف حکمرانوں سے پیسہ وزمین قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ اس وقت تک امراء کو اپنے حلقہ ارادت میں شامل نہ کیا جب تک انہوں نے سرکار کی نوکری نہ چھوڑی، جب تک اپنی تمام جائیداد بیچ کر غرباء میں تقسیم نہ کر دی۔ کسی بھی شکل میں ریاست سے تعلق قابل برداشت نہ تھا۔ سیاست سے شدید نفرت نے صوفیاء کو سیاسی اثر ورسوخ کے مراکز سے دور رکھا اور انہوں نے اپنے جماعت خانے یا خانقاہیں کم ذات کے ہندوؤں کے علاقے میں بنائیں۔ روحانیت سے خالی اور محروم طبقہ اسلامی بھائی چارے اور برابری کے سلوک، جیسا کہ خانقاہوں میں ہونے والی سرگرمیوں جیسے لنگر وغیرہ سے ظاہر ہوتا تھا، بہت خوش ہوا۔ صوفیاء کے پیش کردہ سچے اسلام کی

دلکش شکل نے اس انقلاب کا راستہ ہموار کیا جس کی وجہ سے بہت بڑی تعداد میں نچلے طبقے نے اسلام قبول کیا۔ تاہم صوفیاء نے عمومی طور پر اور چشتیوں نے خصوصی طور پر غیر مسلموں کی مذہبی روایات کے متعلق نرم رویہ اختیار کیا۔ صوفیاء نے مذہب کی تبدیلی کی جانب عدم توجہی اختیار کی۔ حقیقت میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ دہلی سلطنت کے صوفیاء کے ہاں اس طرح کی ایک مثال بھی موجود نہیں ہے۔

اس عہد کے ذرائع کے بارے میں ابتدائی تحقیق ظاہر کرتی ہے کہ پیش کردہ مذکورہ بالا خیالات کے بارے میں دوبارہ سوچا جائے اور بڑے کینوس پر نظر ثانی کی جائے، مگر یہاں ہمارا مقصد بہت محدود ہے۔ ابتدائی طور پر ہم اپنی توجہ سلطنت عہد میں چشتی صوفیاء کے ملفوظات اور تذکرہ جات میں بیان کی جانے والی نظر انداز کرامات اور صوفیاء کے معجزات کی جانب مبذول کریں گے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے اس عہد یا قریبی عہد کے سہروردی اور قادری صوفیاء کی تحریروں کو حوالہ کے طور پر پیش کریں گے (یہ قابل ذکر ہے کہ مختلف صوفی سلسلوں کے درمیان امتیاز دھندلا جاتا ہے یہاں تک کہ کوئی صوفی انفرادی سطح پر اپنے سلسلے کی روایات کی حفاظت کی کوشش کرے) ان میں سے بہت سے لطائف مختلف روایات میں بار بار آتے ہیں، دہرائے جاتے ہیں اور عام ہیں۔ ہمارا مقصد تاریخی حوالے سے ان کے سچا یا درست ہونے کا جائزہ لینا نہیں ہے۔ اس کے بجائے ہم اس متن کو سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ کس طرح ان کہانیوں اور کرداروں نے جنم لیا اور کیسے حالات پیدا ہوئے جنہوں نے معاشرے میں صوفی شیخ کی اتھارٹی کو پروان چڑھایا۔ ہم جائزہ لیں گے اگر ان کہانیوں کا کوئی تعلق اس عہد کی سماجی و سیاسی تاریخ سے رہا ہوگا۔

ان تحریروں میں لطائف کی ایک بڑی تعداد سلطان، علماء اور دیگر دنیاوی اثر و رسوخ رکھنے والے لوگوں کی مخالفت، بے عزتی اور توہین آمیز رویئے سے متعلق ہے جو شیخ کے جلال کو بیدار کرتے ہیں ایسے موقع پر مخالفین کو زیر کرنے، غالب آنے، ڈرانے اور بعض اوقات مکمل شکست دینے کے لئے معجزے ظاہر ہوتے ہیں۔ شیخ کی ناراضگی، مخالف کی اچانک اور تکلیف دہ موت کا سبب بنتی ہے۔ لہٰذا چشتی سلسلے کے حضرت بابا فرید الدین گنج شکر (d:1265) کی مخالفت اور ان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی وجہ سے اس کے مخالفین جن میں والئی ملتان اور اجودھن کا قاضی شامل تھے، کی موت واقع ہوئی (5) بعض اوقات شیخ فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیتا ہے اور اس جگہ سے ہجرت کر

جاتا ہے۔مثال کے طور پر خواجہ معین الدین چشتی (d:1236)(6) نے اپنے خلیفہ خواجہ بختیار کاکی (d:1335)(7) سمیت دہلی سے اجمیر کی جانب ہجرت کا فیصلہ کیا تا کہ شیخ الاسلام نجم الدین صغرا (Sughra) کے ساتھ کشمکش سے بچا جا سکے۔تاہم خواجہ بختیار کاکی کو عوامی اور سیاسی ضرورت کے سبب واپس آنا پڑا۔(8) اسی طرح سے خواجہ نظام الدین اولیاء (d:1325)(9) سلطان جلال الدین فیروز خلجی (96-1290) (10) سے ملاقات سے بچنے کے لئے اجودھن چلے آئے۔ بعدازاں انہوں نے کہا کہ اگر علاؤ الدین خلجی (R:1296-1316) نے مداخلت جاری رکھی (11) تو وہ یہ جگہ بھی چھوڑ دیں گے۔واقعات بتاتے ہیں کہ بادشاہ کی دشمنی اس وقت ختم ہوئی جب شیخ نے اعلان کر دیا کہ حکومتی معاملات سے اس کی کوئی دلچسپی نہیں ہے، اور وہ مسلمانوں اور ان کے بادشاہ کی خوشحالی کے لئے دعا گو ہے۔(12) ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جب دشمنی بالکل ختم کر دی گئی مثال کے طور پر سلطان محمد بن تغلق نے ناصر الدین محمود چراغ دہلوی (d:1356)(13) کے جلال کا سامنا نہ کیا۔کہا جاتا ہے کہ سلطان نے شیخ کو ایک موقع پر ہراساں کیا تھا۔(14)

اس چپقلش کی وجہ شیخ کی ولایت ہے جو عملی طور پر حکمران کی علاقائی قوت پر قابض ہو جاتی ہے اگر کوئی بڑا شیخ کسی علاقے پر اپنی ولایت یا روحانی حکمرانی کا دعویدار ہے جس پر بادشاہ نے فوجی قوت سے قبضہ کر لیا ہے ایسی صورت میں بادشاہ کی سرپرستی میں آنا شیخ کے لئے ہتک آمیز ہوتا ہے۔شیخ سلطان سے امداد لینے اور اس کے دربار میں آنے سے انکار کر دیتا ہے جس سے حکمران کی بالادستی اور دربار کے اخلاقی ضابطے پر زد پڑتی ہے نتیجتاً، شیخ سلطان کو اپنی درگاہ میں آنے کی اجازت نہیں دیتا تا کہ اسے سلطان کو اسی خوش دلی کے ساتھ خوش آمدید نہ کہنا پڑے جیسا کہ وہ بہت سے مریدین کے ساتھ پیش آتا ہے۔(15) شیخ کی ولایت سیاسی معاملات اور ریاست کے مقدر پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے بادشاہت عطا کرنے، بحران کے وقت لوگوں کی حفاظت اور بیماروں کو شفا عطا کرنے کی خوبی کے سبب شیخ لوگوں میں بہت مقبول ہوتا ہے درباریوں اور سپاہیوں میں شیخ کے بہت سے مریدوں کی موجودگی انتہائی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔(16) لہٰذا شیخ کی سلطان کے دربار کی رسومات سے لاتعلقی، بادشاہ وقت کو اپنی درگاہ میں آنے کی اجازت سے انکار، حکمران کی طاقت کی جڑوں پر قبضہ (یعنی دربار کے شرفاء اور عام سپاہی) یہ سب سیاسی قوت کے لئے ایک چیلنج ہوتا ہے۔

یہ شیخ کی بے رحم موت کے بعد خود بخود ختم ہوگئی۔ صوفیاء کے نقطہ نظر کے مطابق شیخ کے ساتھ اس سلوک کے نتائج خلجیوں کے لئے بہت خوفناک نکلے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جس دن شیخ کو قتل کیا گیا ایک خوفناک آندھی چلی۔ اس کے ایک عرصہ بعد تک دہلی اور اس کے نواح میں بارش نہ ہوئی اور قحط پڑ گیا۔ (17) شیخ عبدالحق محدث بتاتے ہیں کہ شیخ ابوبکر طوسی کے قلندروں نے Sidi Muwallih کو قتل کیا تھا۔ شیخ کی موت کے روز خوفناک آندھی نے جلال الدین خلجی کو صوفیاء پر اعتقاد کرنے پر مجبور کر دیا۔

صوفیاء اور بادشاہ کے درمیان اقتدار کی دعویداری کی چپقلش میں درباری حنفی علماء نے بادشاہ کی حمایت میں شیخ کے خلاف شریعت کی روگردانی پر اعتراضات اٹھائے جیسے سماع (19) کا سننا اور نماز جمعہ کی ادائیگی سے انکار۔ (20) شیخ نے علماء کی جانب تحقیر آمیز نظروں سے دیکھا اور نوجوان وکام کے متلاشیوں کو بادشاہ کی ملازمت نہ کرنے کی نصیحت کی۔ بہت سارے مقابلوں میں شیخ کو فاتح دکھایا گیا۔ بعض اوقات اپنے بہتر شرعی علم کے سبب، بعض موقعوں پر شفاء اور روحانی قوت سے پرواز کرنے کے سبب اور بعض اوقات اپنے دشمنوں کی موت کا سبب بنتے ہوئے۔ صوفیاء کے حلقے سے جو پیغام سامنے آیا وہ بہت بلند اور واضح تھا کہ جس شخص نے شیخ سے ٹکر لی برباد ہوگیا۔ (21)

ذرائع میں صوفیاء اور سیاسی قوتوں کی باہمی دشمنی کے بے شمار حوالوں کی موجودگی کی وجہ سے ہم یہاں اپنے آپ کو نظام الدین اولیاء اور دو دہلی سلاطین قطب الدین مبارک شاہ خلجی اور غیاث الدین تغلق (R:1321-25) تک محدود رکھیں گے۔ ہم بیان کریں گے کہ باہمی کشیدگی کی وجہ کیا تھی، مد مقابل گروہوں نے کیا ہتھیار استعمال کئے اور اس جنگ سے کیا نتیجہ نکلا۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی بائیوگرافی قوام العقائد جو کہ ابتدائی معلوم حوالہ ہے، میں درج ہے کہ سلطان قطب الدین نے شیخ رکن الدین سہروردی کو ملتان سے بلوایا تھا۔ (22) جب شیخ دربار میں پہنچا بادشاہ نے اس سے معذرت کی کہ اس کو دور سے آنے کی زحمت اٹھانا پڑی، یہاں قلعے کی دیواروں سے باہر ایک شخص مقیم ہے جو اس سے لاتعلق ہے۔

شیخ رکن الدین سمجھ گئے کہ بادشاہ نظام الدین اولیاء کے بارے میں بات کر رہا ہے انہوں نے بادشاہ کو شیخ کے بارے میں کچھ بھی کہنے سے منع کر دیا۔ اور چشتیوں کی روحانی فتوحات کی بڑھا

چڑھا کر تصویر پیش کی۔ سلطان نے یہ کہتے ہوئے اپنے الفاظ واپس لے لئے کہ اس کی شیخ سے کوئی مخاصمت نہیں ہے اور یہ کہ وہ کسی دوسرے شخص کی شکایت کے بارے میں بات کر رہا تھا۔(23)

اسی متن میں کہیں اور مذکور ہے کہ ایک مرتبہ بادشاہ نے مدہوشی کے عالم میں ملک Talbugha Bughda کو اپنی پگڑی اتارنے کے لئے کہا، جو اسے اس کے پیر نظام الدین اولیاء نے عطا کی تھی، جب اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا، بادشاہ انتہائی غصے میں آ گیا اس نے تلوار باہر نکالی اور اسے چیلنج کیا کہ اگر اس نے اس کا حکم نہ مانا تو اس کی گردن اڑا دے گا۔ اپنی جان کی قیمت پر بھی وہ شیخ کی دی ہوئی پگڑی نہیں اتار سکتا، اس شخص نے جواب دیا۔ سلطان نے حیرانی کا اظہار کیا اور اسے جانے دیا۔(24)

بعدازاں، شیخ نظام الدین کے خلیفہ ناصر الدین چراغ دہلوی نے بادشاہ اور شیخ کے درمیان اس کشیدگی کا حوالہ دیتے ہوئے مریدوں کو بتایا کہ ایک مرتبہ شیخ کے ایک دشمن نے بادشاہ کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ شیخ کسی قسم کا تحفہ قبول کرنے سے انکاری ہے مزید بادشاہ کو بتایا گیا کہ شیخ اپنے مریدوں سے تحائف قبول کر لیتا ہے۔ بادشاہ نے اپنے درباریوں کو منع کر دیا کہ وہ شیخ کے ہاں حاضری کے لئے نہ جائیں اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کے لئے جاسوس مقرر کر دیئے گئے اور مزید حکم جاری کیا کہ معلوم کیا جائے کہ شیخ کا لنگر کس طرح چلتا ہے؟ جب شیخ کو اس کے بارے میں معلوم ہوا تو اس نے اپنے خدام سے لنگر کی مقدار میں اضافہ کے لئے کہہ دیا۔ کچھ وقت کے بعد جب بادشاہ نے پوچھا کہ شیخ کا دربار کیسے چل رہا ہے، اس کو بتایا گیا کہ لنگر کی مقدار دوگنی کر دی گئی ہے۔ بادشاہ کو شرمندگی ہوئی اور اس نے کہا کہ اسے گمراہ کیا گیا ہے اور یہ کہ شیخ کے معاملات عالم الغائب سے ہیں۔(25)

امیر خورد نے سیر الاولیاء میں حضرت نظام الدین اولیاء سے قطب الدین کی دشمنی کی دو وجوہات بیان کی ہیں: پہلی، بادشاہ نے ایک جامع مسجد تعمیر کی اور اس کی تکمیل کے بعد پہلے جمعہ کو اس نے تمام علماء اور مشائخ کو نماز پڑھنے کی دعوت دی۔ نظام الدین اولیاء نے یہ کہہ کر دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اس کے گھر کے نواح میں ایک مسجد ہے اور زیادہ افضل ہے، کہ وہ وہاں جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ روایت بن چکی تھی کہ سلطان کو خوش کرنے کے لئے ہر مہینے کے پہلے

دن صوفیاء دربار میں حاضری دیں۔ نظام الدین اولیاء کی نمائندگی ان کے خادم اقبال نے کی۔ امیر خورد نے بتایا۔

درباریوں نے بادشاہ کو یاد دلایا کہ شیخ نماز کے لئے اور نہ ہی ملنے کے لئے آیا۔ اس نے اپنا ایک خادم دربار میں بھیج دیا۔ بادشاہ نے حکم جاری کیا کہ اگر شیخ اگلے مہینے کی پہلی تاریخ کو نہیں آتا تو اسے زبردستی لایا جائے۔ جب شیخ کو اس کی اطلاع ملی وہ اپنی ماں کی قبر پر گیا اور بیان کیا کہ بادشاہ اس کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اور اگر اس ماہ کے آخر تک یہ معاملہ طے نہ ہوا تو آئندہ وہ یہاں نہیں آئے گا۔ جوں جوں مہینے کی پہلی تاریخ نزدیک آتی گئی شیخ کے مریدین فکرمند ہونا شروع ہو گئے۔

نئے مہینے کے آغاز سے پہلے آخری رات خسرو خان نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی اور دھوکے سے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ (26) اس طرح یہ معاملہ طے ہو گیا نظام الدین اولیاء کو دربار میں حاضری کی ضرورت نہ رہی۔

دونوں کے درمیان کشیدگی کی وجہ کے بارے میں شیخ جمالی سیر العارفین میں ایک اور اہم واقعہ بیان کرتے ہیں۔ علاؤ الدین خلجی کی موت کے بعد قطب الدین نے اس کے جانشین خضر خان کو بھی قتل کر دیا جو کہ حضرت نظام الدین اولیاء کا مرید تھا۔ اور حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس نے جائزہ لیا کہ زیادہ تر امراء اور سپاہی شیخ کے مریدین میں سے ہیں اس نے آنے والے خدشات کا اظہار کیا اور اپنے خاص اعتماد کے شخص قاضی محمد غزنوی سے شیخ کے ذریعہ آمدن کے بارے میں پوچھا۔ قاضی، جس کی شیخ کے ساتھ کوئی عقیدت نہ تھی، اس نے بتایا کہ درگاہ کے اخراجات امراء کے پیش کردہ تحفے تحائف اور نذرانہ جات سے پورے ہوتے تھے۔ سلطان نے جیسا کہ امیر خورد نے بھی لکھا ہے کہ احکامات جاری کئے کہ کوئی شخص دربار پر حاضری نہ دے گا اور نہ ہی شیخ کو نذرانہ جات دے گا، جب حضرت نظام الدین اولیاء نے یہ سنا تو اپنے خدام سے درگاہ کے اخراجات کو دوگنا کرنے کے لئے کہہ دیا۔ اور اپنے خادم کو ہدایت جاری کی کہ مطلوبہ رقم درگاہ میں پڑی الماری سے بسم اللہ پڑھ کر حاصل کی جائے، معجزاتی طور پر سکّوں کے مہیا ہونے کی خبر جب بادشاہ تک پہنچی وہ ششدر رہ گیا۔ (27)

جمالی مزید لکھتا ہے کہ بعد میں سلطان نے شیخ نظام الدین اولیاء کو قاصد بھیجا اور اطلاع دی.

کہ ملتان سے شیخ رکن الدین سہروردی دربار میں حاضری کے لئے تشریف لا رہے ہیں، اور شیخ سے دربار میں موجود رہنے کے لئے کہا گیا۔ شیخ نظام الدین اولیاء نے بادشاہ کی دعوت قبول نہ کی۔ اس نے سہروردی شیخ ضیاء الدین رومی (28) جو کہ سلطان کا پیر تھا کو بھی پیغام بھیجا جس میں اس نے کہا کہ اپنے مرید سے کہے کہ وہ درویشوں سے جھگڑا کرنے سے باز رہے۔ اس وقت ضیاء الدین بستر مرگ پر تھا، لہٰذا وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کر سکا۔ اس کے بعد وہ جلدی ہی مر گیا۔ بادشاہ اور شہر کے مذہبی رہنما اس کی قبر پر دعا کے لئے اکٹھے ہوئے، جب نظام الدین اولیاء وہاں پہنچے، عزت و توقیر دکھانے کے لئے ہر شخص ان کی سمت دوڑا۔ سلطان قطب الدین یہ سب دور سے حاسدانہ نظر سے دیکھ رہا تھا۔ کچھ بااثر لوگوں نے شیخ کو بادشاہ کی قدم بوسی کے لئے کہا، شیخ نے نرمی سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ اس وقت سلطان قرآن کی تلاوت کر رہا ہے اور یہ مناسب نہیں کہ مداخلت کی جائے۔ محل میں واپس آ کر بادشاہ نے محضر نامہ جاری کیا اور علماء سے کہا کہ وہ شیخ کو ہفتہ میں ایک مرتبہ یا کم از کم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو دربار میں آنے کے لئے راضی کریں۔ (29)

جلد ہی سرکردہ مذہبی رہنماؤں کا ایک طائفہ شیخ نظام الدین اولیاء سے ملا اور انہیں بادشاہ کا پیغام پہنچایا اس نے اس بات کی وکالت کی کہ شیخ کو دربار میں حاضری دینا چاہئے تاکہ بادشاہ کے ساتھ چپقلش ختم ہو جائے۔ شیخ نے واضح جواب نہ دیا، طائفہ نے بادشاہ کو بتایا کہ شیخ نے رضامندی ظاہر کر دی ہے۔

مہینے کے آخر میں دو درباری جو کہ شیخ کے مرید بھی تھے، شیخ کے پاس یہ معلوم کرنے کے لئے آئے کہ کیا انہوں نے دربار میں حاضری کا فیصلہ کر لیا ہے، شیخ نے نفی میں جواب دیا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ بادشاہ کے حکم سے انکار شہر میں کوئی فتنہ نہ برپا کر دے، مریدین نے مشورہ دیا کہ شیخ کو اپنے پیر فرید الدین گنج شکر سے اس معاملے میں مدد مانگنی چاہئے۔ شیخ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس طرح کے چھوٹے معاملات میں مدد مانگ کر اسے شرمندگی ہوتی ہے۔ اور مزید کہا کہ سلطان کی شکست عنقریب ہونے والی ہے۔ شیخ کو اپنی فتح پر پورا یقین تھا جیسا کہ اس نے گذشتہ رات خواب میں دیکھا کہ وہ قبلہ رخ منہ کر کے ایک اونچے پلیٹ فارم پر مسند نشیں ہے۔ اس دوران غصے میں پاگل ایک بیل اپنے نوکیلے سینگوں کے ساتھ اس پر حملے کی کوشش کرتا ہے وہ اس وقت اٹھ جاتا ہے، بیل کو سینگوں سے پکڑتا ہے اور نیچے گرا دیتا ہے اسی وقت بیل مر جاتا ہے اس

دوران خسرو خان چند حواریوں کے ساتھ بادشاہ پر حملہ کر کے اس کو قتل کر دیتا ہے۔(30)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذکورہ بالا دونوں حوالے قوام العقائد اور خیر المجالس صرف شیخ کے ساتھ سلطان کی دشمنی کا ذکر کرتے ہیں مگر خوفناک موت کے بارے میں زیادہ بیان نہیں کرتے۔ سیر الاولیاء میں درج ہے کہ حکمران کی موت شیخ کے ساتھ مخالفت کی وجہ سے ہوئی۔ اگر چہ شیخ کو اپنی فتح کا پورا یقین تھا مگر اس نے بادشاہ کی موت کی پیشین گوئی نہیں کی شاید اس لئے کہ اس سے دارالخلافے میں سیاسی ابتری پھیل سکتی تھی۔ بعد میں جمالی اس طرح کی کوئی مشکل محسوس نہیں کرتا کہ وہ اپنے قارئین کو شیخ کی فتح کے بارے میں یقین نہ دلائے۔ شیخ کو اس طرح ظاہر کیا گیا کہ وہ بادشاہ کی موت کی پیشین گوئی کرے جو کہ اس نے غضب ناک بیل کی صورت میں بیان کیا۔ بادشاہ اور شیخ کے درمیان چپقلش میں سہروردی تعلق کو بھی اس حکایت میں بیان کیا گیا بادشاہ نے چشتی شیخ سے مقابلے کا طریقہ یہ نکالا کہ ملتان سے سہروردی شیخ کو بلایا۔ آنے والے صوفی نے تاہم حضرت نظام الدین اولیاء کی روحانی طاقت کا اعتراف کیا اور بادشاہ کو شیخ کے غصے کو بڑھاوا دینے سے روکا۔ جمالی نے مزید لکھا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء نے سلطان کے روحانی استاد ضیاء الدین سہروردی کو قاصد بھیجا اور اسے چشتی صوفیاء کے معاملات میں دخل اندازی سے روکا۔

طاقت کے لئے چپقلش اور باہم رضامندی سے رہنا دہلی سلطنت میں چشتی سہروردی تعلق کی ایک امتیازی پہچان تھی۔ اپنے علاقے میں مخالف سلسلے کے شیخ کو زیادہ عرصہ رہنے کی اجازت مقامی (Incumbent) صوفی ہرگز نہیں دیتا تھا مسافر کو اب یہاں سے کوچ کرنا چاہیئے، علامتی انداز میں صوفی اس کا اظہار کر دیتا تھا۔ لہٰذا سہروردی صوفی بہاء الدین ذکریا (31) نے بالواسطہ طور پر شیخ قطب الدین بختیار کاکی کو ان کے جوتے اس سمت میں رکھتے ہوئے ملتان سے دہلی جانے کا مشورہ دیا۔ (32) شیخ جمالی جو خود بھی سہروردی تھے، انہوں نے سیر العارفین میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ تحریر کیا ہے کہ خواجہ بختیار کاکی نے ملتان کو منگولوں کے خوفناک حملے سے معجزانہ طور پر بچانے کے بعد دہلی کی جانب ہجرت کی۔ جب ملتان کے حاکم ناصر الدین قباچہ نے شیخ سے کچھ دیر رکنے کی درخواست کی تو شیخ نے کہا کہ یہ شہر حضرت بہاء الدین ذکریا کی حفاظت میں ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ (33)

مختلف صوفی سلسلے کے شیوخ کے درمیان اکثر اوقات علامتی طور پر معجزوں کی جنگ ہو جاتی ہے بابا فریدالدین گنج شکر ستان میں۔ مثال کے طور پر احدالدین کرمانی کی درگاہ میں ایک معجزے کے بارے میں بتاتے ہیں۔ کرمانی نے مقامی حکمران کو جو کہ اس پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا، موت سے ہم کنار کر دیا۔ فریدالدین نے اپنی باری آنے پر موجود صوفیاء کو کعبہ کی سیر کروائی اور تھوڑی دیر بعد واپس لے آئے۔ درویشوں نے ان کی روحانی طاقت کا اعتراف کیا۔ انہوں نے جواباً، اپنے خرقے میں سر کو چھپایا اور غائب ہو گئے جبکہ خرقہ خالی رہ گیا۔(35) ابتداء میں جب شیخ فریدالدین نے ملتان کا دورہ کیا اس دوران مقامی صوفی شیخ بہاء الدین ذکریا نے کوئی معجزہ دکھانے کے لئے کہا۔ شیخ نے کہا کہ اگر میں اس کرسی کو جس پر تم بیٹھے ہوئے ہو اسے کہوں کہ زمین سے اوپر اٹھ جائے اور ہوا میں معلق رہے، تو ایسا ہی ہوگا۔ جیسے ہی شیخ نے جملہ ختم کیا، کرسی ہوا میں اڑ گئی۔ خواجہ زکریا کو کرسی کو دوبارہ زمین پر لانے کے لئے اپنے ہاتھوں سے تھامنا پڑا۔ سہروردی صوفی کو چشتیوں کی مافوق الفطرت صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑا۔(36)

یہ اور اس طرح کی دیگر بہت سے حکایات مختلف سلسلوں سے تعلق رکھنے والے صوفیاء کے درمیان طاقت اور ان کے سخت مقابلوں کے بارے میں بتاتی ہیں۔ ایک دوسرے کی روحانی قوتوں اور علاقے کے بارے میں جان لینے کے بعد اس طرح کی امکانی چپقلش سے احتراز کیا جاتا۔ اس طرح کی ایک مثال بابا فریدالدین گنج شکر کے ایک مسافر کو کہے گئے الفاظ ہیں جو جودھن سے ملتان تک کے محفوظ سفر کے لئے اجازت لینے کے لئے آیا تھا۔ "یہاں سے وہاں جہاں چشمہ ہے، بہاء الدین زکریا کا علاقہ ہے، اس سے پرے میرے کنٹرول میں ہے۔ یہاں سے بیان کیا گیا ہے کہ دونوں شیوخ سے ان سے متعلقہ علاقے میں سفر کی اجازت لینے کے بعد مسافر اپنی منزل پر بحفاظت پہنچ گیا۔(37) اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ روحانی سلطنت کا تصور سیاسی طاقت کے کتنا متوازی اور قریب ہے۔ یہ بہت سوں میں سے ایک کی نمائندگی کرتا ہے جس میں مذہبی اور سیاسی قوت اور اثر کے حلقے قدیم ہندوستان میں کس طرح باہم شیر وشکر ہو گئے۔

مختلف طریقوں سے ایک دوسرے کو غیر اہم بنانے کی کوشش میں ان کے اختلافات مخالفین کے ساتھ اکثر ظاہر ہوئے ہیں چشتی صوفیاء کی دولت سے لاتعلقی سہروردی صوفیاء کے انداز سے بالکل الٹ ہے جو اس حوالے سے جانے جاتے تھے کہ انہوں نے بہت کچھ جمع کر رکھا ہے۔(39)

دولت اور جائیداد کے حصول کے بارے میں باہمی اختلافات نے دونوں سلسلے کے باہمی تعلقات کو سلطنت عہد میں مضبوط نہ ہونے دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ناگور کے دورے کے دوران، بہاء الدین ذکریا کے بیٹوں میں سے ایک دولت کے اجتماع پر تنقید سے بہت سخت نالاں تھا یہ جان کر کہ حمیدالدین ناگوری (40) جمعہ کی نماز نہیں پڑھتے، اس نے شیخ کے خلاف اس بات کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور علماء کے ایک گروہ کی حمایت حاصل کر لی جنہوں نے شیخ سے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کا تقاضا کیا۔ شیخ نے غصّے اور ناراضگی سے جواب دیا کہ وہ اپنے فرائض درحقیقت پورے کر رہا ہے، چونکہ ناگور جہاں وہ رہ رہا ہے ایک گاؤں ہے اور قصبہ نہیں ہے (41) لہٰذا جمعہ کی نماز کی ادائیگی اس پر لازم نہیں ہے۔ بظاہر جمعہ کی نماز صرف شہری مسلمان آبادیوں کے لئے محدود کر دی گئی خصوصاً جن قصبوں میں جامع مسجد ہے۔ حمیدالدین ناگوری نے بہاء الدین ذکریا کے دہلی آنے پر دولت کے ارتکاز کا موضوع پھر کھول لیا۔ باہمی دلیلوں سے یہ بات واضح ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ درویش کے طور پر سہروردیوں کا مقام کسی طرح سے بھی حضرت محمدؐ سے اونچا نہیں ہے جنہوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ غربت میرا فخر ہے ذکریا کے پاس اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں تھا۔

چشتی صوفیاء کی زندگیوں سے کئی اور حوالے ظاہر کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے روحانی تربیت کے دفاع میں حضرت محمدؐ کی روایات کی چھان بین کی۔ اس سلسلے میں ہم نظام الدین اولیاء اور سلطان غیاث الدین تغلق کے درمیان دشمنی کو حوالے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ امیر خورد نے لکھا ہے کہ بادشاہ نے شیخ کی دشمنی کے بارے میں ایک محضر نامہ جاری کیا جس میں شیخ کو اپنی سماع میں دلچسپی کے دفاع کے بارے میں کہا گیا۔ شیخ زادہ حسام الدین جو کہ شیخ کا غیر مطمئن چیلہ تھا اور نائب حکیم قاضی جلال الدین الزامات کی بوچھار کرنے والوں کے رہنما تھے۔ شیخ کو ذاتی طور پر سلطان کی زیر صدارت ایک بہت بڑے اجتماع میں پیش ہونا پڑا۔ اس کے خلاف کیس یہ تھا کہ امام ابوحنیفہ کے مطابق موسیقی حرام ہے دلائل اس کے گرد گھومنے لگے کہ وہ احادیث جو حنفی مکتبہ فکر کے لئے قابل توجہ نہیں ہیں کو کیا قبول کیا جا سکتا ہے حضرت بہاء الدین ذکریا کے پوتے مولانا علم الدین جنہوں نے موسیقی کو جائز قرار دینے پر عالمانہ مضمون بھی لکھا تھا، اور مسلمان دنیا کے کئی ملکوں کا سفر بھی کیا ہوا تھا، نے حضرت نظام الدین اولیاء کی حمایت کی۔ اس

نے گواہی دی کہ ان سرزمینوں پر بغیر پابندی کے سماع کی اجازت ہے۔ بادشاہ نے نظام الدین اولیاء کی بات مان لی اور اس پر کوئی فیصلہ کرنے سے انکار کردیا۔ ایک دوسرے حوالے کے مطابق بادشاہ نے سماع کو شیخ کے لئے جائز قرار دے دیا مگر دیگر مسلمان گروہ جیسے قلندر یا حیدری (43) ہیں، ان کے لئے نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ دربار سے واپسی کے بعد حضرت نظام الدین اولیاء نے ضیاالدین بارانی (مرید، درباری ومصنف) کومولانا محی الدین کاشانی اور شاعر امیر خسرو کے ساتھ طلب فرمایا۔ آپ نے انہیں بتایا کہ علماء ناراضگی اور جنگ کی کیفیت سے بھرے ہوئے تھے۔ آپ نے شکایت آمیز لہجے میں کہا کہ قانون دانوں کی تشریحات کو حدیث رسول اللہ پر ترجیح دی گئی۔ آپ نے حیرانی کا اظہار کیا کہ ایک شہر جس میں ایسی تضحیک وتوہین کی گئی ہو، کیسے پروان چڑھ سکتا ہے۔ درحقیقت یہ بہت عجیب ہوگا اگر اس شہر کو اینٹوں کا ڈھیر نہ بنادیا گیا۔ شیخ نے پیشین گوئی کی کہ علماء کے غیر مستحکم اعتقاد اور گناہ کے نتیجے میں شہر تباہی، قحط اور وبائی امراض کی نذر ہو جائے گا۔ (44) امیر خورد نے لکھا ہے کہ اس لعنت کی وجہ سے چار سال کے اندر وہ تمام علماء جو دربار میں موجود تھے ان کو دولت آباد کے لئے جلاوطن ہونا پڑا۔ دہلی کے شہر کو قحط اور وبائی امراض نے آن لیا، شیخ کا کہا ہوا ہر لفظ درست ثابت ہوا۔ (45)

سیر الاولیاء میں دربار کی روئیداد کا ذکر کرتے ہوئے جمالی نے اس کشمکش کا پس منظر بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ قطب الدین مبارک شاہ کے قتل کے بعد اس کے بعد آنے والے خسرو خان کہ جس نے حکومت پر ناجائز قبضہ کیا تھا، شہر کے درویشوں میں ایک بڑی رقم تقسیم کی۔ تین اہم شیوخ نے یہ رقم لینے سے انکار کردیا مگر نظام الدین اولیاء نے پانچ لاکھ ٹنکے قبول کر لئے جو بھیجے گئے تھے جو انہوں نے غرباء میں تقسیم کردیئے۔ دیگر شیوخ جنہوں نے نذرانہ قبول کیا تھا اس کو ٹرسٹ کے لئے رکھ لیا۔ چار ماہ بعد جب غیاث الدین تغلق نے خسرو خان کو شکست دے کر منصب حکمرانی سنبھالا اس نے رقم کی تلاش شروع کردی جس کی وجہ سے خزانہ خالی ہوگیا تھا۔ نظام الدین اولیاء نے وضاحت کی کہ جو رقم انہیں وصول ہوئی تھی وہ عوام کے خزانہ سے تھی لہٰذا انہوں نے اپنی ذات پر کچھ نہ خرچ کرتے ہوئے تمام رقم مستحقین میں تقسیم کردی۔ سلطان اس جواب پر خاموش ہوگیا مگر وہ دل سے شیخ کا دشمن بن گیا اور جب سماع کے جائز ہونے کا معاملہ دربار میں بادشاہ کے حضور

پیش ہوا۔ معاملات اس وقت اختتام پذیر ہوئے جب بادشاہ نے شیخ کو دربار میں طلب کرنے پر اظہار افسوس کیا، جیسے ہی شیخ اپنے جھونپڑے میں واپس پہنچے، اطلاع ملی کہ حکمران اپنے رویئے پر اس قدر شرمندہ ہوا کہ اس نے قاضی جلال الدین کو اپنے عہدے سے معزول کر دیا۔(46)

مذکورہ بالا تذکرے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین مبارک شاہی کے ساتھ کشمکش کے علاوہ شیخ کو چشتی سلسلے کا یہ قانون کہ دربار نہیں جانا چاہئے، توڑنے پر مجبور کیا گیا۔ اسے مجبور کیا گیا کہ وہ حکمران کی عدالت میں حاضر ہوں اور جواب دیں اس کا بہت خراب نتیجہ نکلا کہ نائب حاکم جس نے حکم کے تحت دربار میں شیخ کو بلایا تھا، اپنے عہدے سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ وہ علماء جنہوں نے شیخ کی مخالفت کی تھی، زبردستی ان کو دولت آباد بھیج دیا گیا۔ کئی دہائیوں تک دارالخلافت میں قحط اور وبائی امراض پھیلی رہیں۔ سلطان بذات خود زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا۔ اس واقعے کے تھوڑا عرصہ بعد دارالخلافہ کے نواح میں اس کا انتقال ہو گیا اور شہزادہ جونا خان کے حصے میں حکمرانی آ گئی جیسا کہ حضرت نظام الدین اولیاء نے قوام العقائد میں تحریر کیا ہے۔ مگر اس کا مذکورہ بالا تذکرے سے کوئی تعلق نہ ہے۔(47) کہا جاتا ہے کہ اس کے بارے میں ''سیر الاولیاء'' کی خاموشی کے پیچھے ہوسکتا ہے سیاسی وجوہات ہوں، کیونکہ اس کتاب کا زیادہ تر حصہ اس حکمراں کے عہد میں تحریر کیا گیا۔(48) یہ وجہ قوام العقائد پر واجب نہیں آتی جو کہ بہامنید (Bahamanid) عہد میں 1354 عیسوی میں تحریر کی گئی۔

دہلی سلطنت کے ادب میں بے شمار ایسے لطائف موجود ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہت کا تاج صوفیاء کے منتخب کردہ لوگوں کو پہنایا گیا۔ درباری تاریخ ان واقعات کی توثیق کرتی ہے۔ اس طرح کی باتیں ایسے معاشرے میں اکثر پھیل جاتی ہیں جہاں بڑے بیٹے کو بادشاہ بنانے یا وراثت کے قوانین کی مضبوط روایت نہ ہو جہاں ناجائز طریقے سے اقتدار پر قبضہ کرنا عام ہو۔(49) دہلی کی سلطنت میں ایسا ہی تھا، اس کا تعلق اس واقعے سے جوڑا جاتا ہے کہ قطب الدین بختیار کاکی ایک مرتبہ معین الدین چشتی، اوحادالدین کرمانی، اور شہاب الدین سہروردی کے ہمراہ بیٹھے پیغمبروں کی کہانیاں سن رہے تھے۔ اس وقت سلطان التمش کی عمر بارہ برس تھی، اس کا وہاں سے گزر ہوا صوفیاء نے اس کی طرف ایک نظر دیکھا خواجہ معین الدین چشتی فوراً گویا ہوئے ''اس بچے کی اس وقت تک موت نہیں آ سکتی جب تک یہ دہلی کا بادشاہ نہیں بن جاتا۔''(50) اس عہد کے

ایک اور وقوعہ نگار منہاج السراج نے ایک دوسرا واقعہ قلم بند کیا ہے بخارا میں ایک نوجوان غلام ہونے کے سبب سلطان کو کچھ انگور خریدنے کے لئے بھیجا گیا۔ راستے میں اس سے نقدی گم ہوگئی وہ ڈر سے رونے لگا۔ بچے کو اس مشکل میں دیکھ کر ایک درویش نے اس کے لئے کچھ انگور خریدے اور اس سے کہا کہ وعدہ کرے کہ جب بادشاہ بن جائے گا وہ صوفیاء کی عزت کرے گا۔ منہاج نے لکھا ہے کہ سلطان نے قسم کھائی کہ خوش قسمتی اور حکمرانی جو اُسے حاصل ہوئی وہ اس درویش کی برکت کے سبب ہوئی۔ (51) بعدازاں نظام الدین اولیاء نے اپنے سامعین کو بتایا کہ التتمش شہاب الدین سہروردی اور اوہادالدین کرمانی سے مل چکا تھا اور ان میں سے کسی ایک نے اسے بشارت دی تھی کہ وہ بادشاہ بنے گا۔ (52)

جس طرح کے چیلنج کا سامنا اس کے لئے ضروری تھا اس وقت کے سیاسی اور مذہبی تقاضوں کا حل مہیا کرتا ہے دوسری جانب باہمی چپقلش اور اتحاد کی باتیں شیخ کے سیاسی معاملات میں دلچسپی کو ظاہر کرتی ہیں صوفیاء کا یہ کردار خصوصاً چشتی صوفیاء نے اس سے خود کو دور رکھا، جیسا کہ پہلے تحریر کیا جا چکا ہے تاہم اس سے مسئلہ کا مستقل حل نظر آتا ہے۔ درحقیقت صوفیاء کے سیاسی کردار کے بارے میں بہت بیان کیا گیا ہے۔ (53) معجزات کا مزید بیان شیخ کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی کی تصدیق کرتا ہے، ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ شیخ کی ولایت ہی حکمران اور صوفی کے درمیان وجہ نزع تھی۔ حکمرانوں کے لئے، صوفی کی شخصیت کی یہ صلاحیت کہ وہ اپنی مرضی کے شخص کو بادشاہت عطا کردے، یا کسی دوسرے سے جس نے اس کی اتھارٹی کو قبول نہ کیا، اس سے چھین لے، سپاہیوں، درباریوں میں اس کے عقیدت مندوں کی بڑی تعداد کا ہونا، ان کی حکومت کے لئے لمحہ فکریہ تھا۔ جو چپقلش پیدا ہوتی اس میں بادشاہ نے علماء اور مخالف صوفی سلسلے کے صوفیاء کی مدد حاصل کی۔ ہتھیاروں میں شیخ نے اپنی معجزاتی قوت کا استعمال کیا تا کہ مخالف کو ختم کیا جا سکے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء اور دہلی کے سلاطین کے باہمی اختلاف میں کس طرح مخالفین کو ایک ایک کر کے ختم کیا گیا۔ شیخ کی جلالی طبیعت عام لوگوں کو بھی متاثر کرتی تھی، جیسا کہ اس کی ناراضگی کے بارے میں یقین کیا جاتا تھا کہ اس کی وجہ سے شہر میں قحط اور وبائیں پھوٹتی ہیں اگر صوفی کی ناراضگی تباہی لاسکتی ہے تو اس کی برکات سے بحران کے دنوں میں لوگوں کو تحفظ بھی مل سکتا ہے۔ منگولوں کے حملوں میں بچانے والا کردار بہت اچھی طرح بیان کیا گیا ہے۔

جس نے تیرہویں صدی سے چودہویں وسط صدی تک اسلامی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ ملتان کے حکمران ناصرالدین قباچہ نے صوفیاء کو گزارش کی کہ منگولوں کے خلاف کہ جنہوں شہر کو تباہ کر دیا تھا، مدد کریں۔

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کہ جو اس وقت ملتان میں تھے انہوں نے قباچہ کو ایک تیر دیا اور کہا کہ اپنے محل کی چھت سے رات کو حملہ آوروں کی جانب پھینک دے۔ اور جیسا کہ شیخ نے نصیحت کی، باقی رسومات ادا کرے۔ اگلی صبح اس علاقے میں کوئی حملہ آور موجود نہ تھا۔ یہ یقین کر لیا گیا کہ اس روحانی تیر نے دشمنوں کی صفوں میں تباہی پھیلا دی اور ان کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ منگولوں سے نجات دلانے کے بعد قباچہ نے شیخ بختیار کاکی سے گذارش کی کہ وہ ملتان میں ٹھہریں اور شہر کو اپنی برکتوں سے نوازیں۔ بادشاہ نے دراصل اس وقت کے نمائندہ شیخ بہاءالدین سہروردی کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو روکنے کے لئے شیخ کے معجزے کو استعمال کیا۔(54)

تاہم جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے ذکریا نے شیخ کو بتایا کہ اس کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ دہلی چلا جائے لہٰذا خواجہ بختیار کاکی یہ کہتے ہوئے ملتان کو چھوڑ گئے کہ یہ علاقہ شیخ بہاءالدین ذکریا کے زیرِ تصرف ہے اور اس کو ان کی حفاظت میں ہمیشہ رہنا چاہئے۔ ایک دوسری رپورٹ کے مطابق خواجہ عبدالغیاث سے گذارش کی گئی کہ وہ منگولوں کو یمن میں شکست سے دوچار کریں۔ شیخ نے تارتاریوں کی جانب پھینکنے کے لئے ایک چھوٹی لکڑی کا ٹکڑا دیا جس نے ان کی صفوں میں بے اطمینانی کی لہر دوڑا دی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے لگے یہاں تک کہ تمام مر گئے۔ کہا گیا کہ دراصل وہ سفید لباس پہنے ہوئے لوگوں کی فوج کے ہاتھوں جہنم بھیج دیئے گئے۔(55)

اس بات سے فوجی قوت کا اندازہ ہوتا ہے جس نے لوگوں کو صوفیاء کی جانب مدد کے لئے متوجہ کیا۔ یہ یقین کہ صوفیاء میں علاقے کی قسمت بدلنے کی طاقت ہوتی ہے، اس کو اور تقویت ملی کہ جب یہ دعویٰ کیا گیا کہ شہر تباہ ہو جائیں گے اگر درویشوں کی برکتیں اٹھ جائیں گی۔(56) درحقیقت، خواجہ نظام الدین اولیاء کے مطابق کسی خواجہ کریم نے یہ کہہ دیا کہ جب تک شیخ کی قبر دہلی میں ہے کوئی بے عقیدہ شخص اس کو فتح نہیں کرسکتا۔(57) ایک دوسری کہانی ہمیں چنگیز خان کے ہاتھوں خوارزم کی شکست کا حال بتاتی ہے کہ جس نے نجم الدین کبرا کی بے عزتی کی۔(58) دوسری طرف ذرائع اس سوال پر روشنی ڈالتے ہیں کہ ایک بڑی صوفیاء کی تعداد کی موجودگی میں کس

طرح منگولوں نے مسلمانوں کی دنیا پر قبضہ کر لیا۔ جب منگولوں نے نیشاپور کا محاصرہ کیا، گورنر نے فریدالدین عطار کو مدد کے لئے پکارا۔ شیخ نے کہا کہ اب بہت دیر ہو چکی ہے، خدا پر یقین پختہ رکھو اور اس کے جلال کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ لہٰذا منگولوں کے حملوں کو عذابِ الٰہی کی علامت قرار دیا گیا۔ اور اس مرحلے کے بعد شیخ کے کرنے کے لئے اس کے اختیار میں کچھ نہ رہا۔(59)

منگولوں کے مسائل کے علاوہ صوفیاء سے کچھ مافوق الفطرت قوتوں سے نبرد آزماء ہونے کے، لئے بھی مدد کی درخواست کی گئی۔(60) اس سلسلے میں کئی حوالے ملتے ہیں کہ جب صوفیاء اور شیوخ نے قرآنی آیات تحفظ کے لئے بتلائیں۔ نظر لگ جانا، اور کالے جادو ٹونے کا حوالہ بھی ذرائع پیش کرتے ہیں نظام الدین اولیاء اور ان کے بعد آنے والے چراغ دہلوی کا پختہ یقین تھا کہ نظر بد اور جادو تباہی لا سکتے ہیں۔(62) بعد میں آنے والے اس طرح کے عقائد پر سخت تنقید کرتے ہیں۔(63) چراغ دہلوی نے اپنے سامعین کو بتلایا کہ بابا فریدالدین گنج شکر، نظام الدین اولیاء اور کئی دوسروں کی بیماری کی وجہ کالا جادو تھا۔ انہوں نے اس بت کی نشاندہی بھی کی کہ جو آٹے کا بنایا گیا تھا، جس کے مختلف حصوں میں سوئیاں چبھو دی گئی تھیں، یہ یقین کیا جاتا ہے کہ آٹے کا یہ بت ہی دراصل بابا فرید کی شدید بیماری کا سبب تھا جو تب صحت یاب ہوئے جب اس کو ٹکڑوں میں توڑ دیا گیا۔(64) صوفیاء کے مزارات پر حاضری، ان کے مقدس نوادرات اور تعویذ جو زائرین میں تقسیم کئے جاتے تھے، صحت یابی کے لئے مؤثر سمجھے گئے۔ فوائدالفواد کی ایک حکایت کے مطابق، زائرین کی ایک بڑی تعداد بابا فرید کے جماعت خانہ میں آئی اور تعویذ لکھنے کے لئے کہا، نظام الدین اولیاء جو اس وقت شیخ کے نوجوان شاگرد تھے، اس طرح کے لوگوں کی بڑی تعداد سے مل کر تھک جاتے تھے۔(65)

نظام الدین اولیاء کی والدہ نے بھی ان سے کہا تھا کہ وہ شہداء اور بزرگوں کی قبروں کی زیارت کے لئے جائیں۔ ان کی جسمانی صحت کہا جاتا ہے کہ اس وقت بہتر ہوگئی جب وہ قبرستان گئے ورانہوں نے اپنی صحت کے لئے دعا کی۔(66) صوفیاء اس یقین پر زور دیتے ہیں کہ شیخ کبھی مرتے نہیں ہیں اور جب اپنی تربت میں آرام کررہے ہوتے ہیں تو وہ اپنا سماجی کردار تب بھی ادا کرتے رہتے ہیں جیسا کہ زندگی میں کرتے رہے ہیں۔(67) اس تناظر میں اس جھگڑے کی

تحسین کی جا سکتی ہے کہ جو دو کانداروں، قلندروں، صوفیاء اور علماء کے درمیان عبداللہ انصاری کی میت پر ہوا، یہ اعلان کیا گیا کہ مختلف گروہوں کے لوگ باری باری آئیں گے۔ اس کی میت کو اٹھائیں گے اور پھر قبرستان لے جائیں گے، سب نے کوشش ناکام کی صرف صوفیاء کے، کہ جو اس قابل تھے۔ انصاری کا نام تاریخ میں ایک صوفی کے طور پر لیا جاتا ہے۔ (68)

تیار گئے تعویذ، مزارات، ٹینک و دیگر نوادرات کہ جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں شفا کی قوت ہے۔ کئی اور طریقے بھی دوا کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ بابا فرید کا ایک شاگرد شدید کمر کے درد میں مبتلا تھا۔ شیخ نے اسے آگے جھکنے اور اپنی کمر چھونے کے لئے کہا۔ درد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ (70) شیخ کے اس کردار کو شیخ نظام الدین اولیاء کی اس بات سے اور بھی تقویت ملتی ہے آپ نے کہا کہ جب شیخ اپنے ہاتھوں سے کسی کو چھوتا ہے تو اس کا اثر ہوتا ہے۔ (71) چھونے کے ساتھ، پھونک مارنا کو بھی شفایابی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے اس کے پیچھے خیال یہ کارفرما ہے کہ ایک شخص کی بیماری کے پیچھے ایک یا دوسری قسم کا جن ہوتا ہے صوفیاء جن کے پاس روحانی علم اور قوت ہوتی ہے، وہ اس جن کو قابو کرنے یا تباہ کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ متاثرہ شخص کو سکون پہنچانے کے مجاز ہوتے ہیں۔ (72) بیماری کو درست کرنے کے علاوہ ہمارا واسطہ ایسے واقعات سے بھی پڑتا ہے کہ جب شیخ نے اپنے ہاتھوں سے مردے کو زندہ کر دیا۔ اس طرح کی ایک حکایت کے مطابق شیخ بختیار کاکی کے اس معجزے کی بدولت ہزاروں غیر مسلم نے اسلام قبول کر لیا۔ (73)

بعض ذرائع ہمیں شیخ کی شفایابی کے بارے میں ناکامی کے متعلق بھی بتاتے ہیں، اس کے لئے کہا جاتا ہے کہ جیسے خدا کا فیصلہ بہتر ہے۔ خواجہ نظام الدین نے، بابا فریدالدین گنج شکر کے اس طرح کے ایک معجزے کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے سامعین کو بتایا کہ ایک مرتبہ ایک دوست تاج الدین مینائی ان سے ملنے آیا اور اس نے اپنے بیمار بچے کی صحت کے لئے پوچھا تو وہ شے اپنی جگہ سے غائب پائی گئی، جب اس کی تلاش کی تمام کوششیں ناکام ہو گئی، مینائی کو اپنے گھر واپس ناامید جانا پڑا۔ اس کے بعد جلد ہی اس کا بیٹا مر گیا۔ اس کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے اس شے کے بارے میں پوچھا تو یہ اپنی جگہ موجود پائی گئی نظام الدین اولیاء نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کے دوست کے بیٹے کی قسمت میں موت تھی لہٰذا یہ معجزاتی چیز غائب ہو گئی۔ (74)

ایسے مواقع کے بارے میں بھی لٹریچر ملتا ہے کہ جب لوگوں نے وبائی امراض اور قدرتی آفات سے محفوظ ہونے کے لئے صوفیاؒ سے گذارش کی۔ شیخ کی برکات نے لوگوں کو مختلف تکالیف سے محفوظ رکھا۔ نظام الدین اولیاء اس طرح کے دعووں کو مضبوط انداز سے پیش کرنے کے لئے گجرات کی مثال دیتے کہ جہاں وبائی امراض پھیلنے سے شہر خالی ہو گیا۔ اس سے نجات اسی وقت ملی کہ جب وہاں ایک درویش آ گیا۔(75)

دہلی سلطنت کی موجودہ تاریخ اس عہد کے مستقل مسئلے قحط اور بارش کے نہ ہونے کی جانب اشارہ کرتی ہے صوفیاء کی حکایات اس معاملے پر روشنی ڈالتی ہیں کہ اس مسئلے کو عوام اور بادشاہ نے کیسے حل کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بارش کا نہ ہونا خدائی عذاب کی علامت ہے لہٰذا لوگوں کو نماز کی جانب دھیان دینا چاہئے خدا اس طرح خوش ہو گیا اور یوں خوب بارش ہوتی۔(76) کہا جاتا ہے کہ اس طرح دہلی میں کافی عرصہ بارش نہ ہوئی، رہائشی لوگوں نے صوفی نظام الدین عبدالموید کو گذارش کی کہ وہ دعا کریں تاکہ بارش ہو۔ شیخ نے اونچی آواز میں کہا اے اللہ تعالیٰ بارش بھیج، وگرنہ میں اس دنیا میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔ شیخ کی یہ دعا قبول ہوئی اور شہر میں اتنی بارش ہوئی کہ سیلاب آ گیا۔ ایک دوسرے موقع پر بہت سے لوگ اور درویش ایک کھیت میں جمع ہو کر بارش کے لئے دعا مانگ رہے تھے۔ موید نے کپڑے کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ہوا میں لہرایا، فوراً بارش شروع ہو گئی اور پھر بہت موسلا دھار بارش ہوئی۔(78) نصیرالدین چراغ دہلوی نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ بارش نہ ہوئی، بادشاہ نے اپنا قاصد صوفیاء کے پاس بھیجا اور کہا کہ اس کا کام جنگیں لڑنا ہے جب کہ ان کا کام لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے دعا مانگنا ہے۔ صوفیاء سے بارش کی دعا کے لئے کہا گیا۔ حمیدالدین ناگوری نے مشورہ دیا کہ ایک محفل سماع کا بندوبست کیا جائے، محفل سماع کے انعقاد کے ساتھ ہی بہت شدید بارش ہوئی۔(79) بعد میں صوفیاء کی دعاؤں سے لائی جانے والی بارشوں کا ذکر کرتے ہوئے جمالی نے آخری حکمران التمش کا واقعہ لکھا ہے(80) صوفیاء کا دعویٰ تھا کہ قحط سالی اور بارش کا نہ ہونا دراصل غضب الٰہی کے مظہر ہیں اس کی وجہ لوگوں سے گناہوں کا سرزد ہونا اور حکمرانوں کی مسائل کو حل کرنے میں ناکامی ہے التمش کا یہ اعلان کہ اس کا کام جنگیں لڑنا ہے اور صوفیاء کا کام لوگوں کی فلاح کو یقینی بنانا ہے، بحران کے ایام میں نظر انداز نہ کیا گیا۔ صوفیاء کے کردار نے مزید اپنے مؤثر ہونے کو معاشرے میں تقویت دی۔

ذرائع سے اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ صوفیاء نے مسافروں کی کس طرح مدد کی۔
حیران کن حکایات بتاتی ہیں کہ شیخ کا کرشمہ اس کی ولایت کی حدود سے بھی آگے نکل جاتا تھا۔(81) شیخ نے نہ صرف زمان و مکان کی حدود کو توڑا، بلکہ ایک ہی وقت میں ایک سے زائد جگہوں پر اس کی موجودگی کے شواہد بھی ملتے ہیں نظام الدین اولیاء اکثر مکہ میں نظر آتے تھے۔(82) اگرچہ وہ زندگی بھر مکہ نہ گئے۔ان کی اس مسئلے پر خاموشی اس بات کی غماز ہے کہ ان کا ایک وقت میں ایک سے زائد جگہوں پر موجود ہونا ممکنات میں سے ہے۔اس کا اظہار ان حکایات میں بھی ہوتا ہے کہ جب شیخ خود کو دور دراز فاصلوں پر لے جاتا ہے کہ وہ قیدیوں کو شیطانوں سے چھڑا سکے۔اس طرح کی کہانیاں شیخ کی شخصیت کو ماورائی بناتی ہیں۔علماء کی شکست اور ان کا شیخ کی ایسی ماورائی قوتوں کا اعتراف شیخ کی مقبولیت میں اضافہ کا سبب بنیں۔(83) اگرچہ صوفیاء اپنی ایسی ماورائی صلاحیتوں کی تشہیر پسند نہیں کرتے تھے۔خواجہ شاہی معطب (84) یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ان کی موت کے بعد اگر کسی کو کوئی تکلیف ہے تو ان کی قبر پر تین مرتبہ حاضری دے اس کی مشکل دور ہو جائے گی۔مزید وہ کہتے تھے کہ اگر افاقہ نہ ہو تو اسے چوتھے روز بھی زیارت کے لئے آنا چاہئے اور اگر چوتھے دن بھی مشکل دور نہ ہو تو اسے پانچویں دن آ کر ان کی قبر تباہ کر دینی چاہئے۔(85) ہم نے اوپر دیکھا کہ جب تک خواجہ کریم کی قبر دہلی میں تھی منگول اس شہر کو فتح نہیں کر سکے۔تاہم حضرت نظام الدین اولیاء نے ایسے صوفیاء کے لئے نفرت کا اظہار کیا ہے جو اپنی تشہیر کے لئے معجزاتی قوتیں استعمال کرتے ہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اولیاء کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنی کرامت کو چھپائیں، یہاں تک کہ انبیاء پر بھی اپنے معجزات کے اظہار پر پابندی تھی۔(86)

یہی وجہ ہے کہ تمام بزرگ جلالی نہیں تھے۔حقیقت میں یہ عاجزی تھی۔کوئی بہت بڑی کامیابی نہ تھی کہ جس کی وجہ سے لوگ شیخ کی عزت کرتے تھے شیخ اور مرید کے درمیان تعلق کو باہمی خلوص اور مدد کی نظر سے دیکھنا چاہئے لوگ شیخ کی عزت کرتے تھے اور یوں شیخ کی برکات و سرپرستی سے مستفید ہوتے تھے امیر خورد لکھتے ہیں کہ لوگوں نے خواجہ معین الدین چشتی کے اس فیصلے کے خلاف کہ قطب الدین بختیار کاکی کو دہلی سے دور لے جاؤ، اس طرح ردعمل ظاہر کیا کہ شیخ لوگوں کی آہ وزاری سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے شاگرد کو شہر میں رہنے کی اجازت دی۔(87) شیخ فریدالدین گنج شکر کو ہانسی جانا پڑا کیونکہ وہاں کے مقامی لوگوں کو دارالخلافے میں آنے میں

مشکلات پیش آتی تھیں۔(88) بعدازاں اجودھن کے لوگوں نے ان کو کنارہ کشی کی زندگی ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔(89) نظام الدین اولیاء نے اپنے سامعین کو بتایا کہ ان کو اپنے جماعت خانے کے ایک زائر نے نصیحت کی، شاید نظر نہ آنے والی کسی شخصیت نے کہ وہ دہلی میں غیاث پور میں ٹھہریں اس وقت جب شیخ ذہنی طور پر جائزہ لے رہا تھا کہ انہیں کسی تنہا جگہ پر جانا چاہئے۔(90) جب چراغ دہلوی نے شہر کو چھوڑنے کی خواہش کا اظہار کیا اور کسی چھوٹی غیر معروف جگہ پر قیام کا خیال کیا ان کے پیر نے ان کو حکم دیا کہ وہ لوگوں میں رہیں اور کام کریں۔(91) کسی مخصوص جگہ سے شیخ کا رخصت ہو جانے کو اچھا تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر حضرت نظام الدین اولیاء کا یقین تھا کہ پنجاب کا علاقہ بابا فریدالدین کی برکات کی وجہ سے منگولوں کی قتل و غارت گری سے محفوظ تھا، اسی سال جب شیخ کا وصال ہوا، منگولوں نے حملہ کیا اور علاقے پر قبضہ کرلیا۔(92)

صوفیاء کی معاشرے میں حکمرانی کو نہ صرف سلاطین، علماء، گھومتے پھرتے درویشوں، قلندروں اور غیر مسلم یوگیوں نے تسلیم کرنے سے انکار کیا بلکہ شیخ کی قوت اور حرمت کو بھی چیلنج کیا گیا قلندر جو جماعت خانہ میں آتے تھے اکثر مسائل کھڑے کر دیتے ذرائع میں کئی معلومات ملتی ہیں کہ یہ قلندر صوفیاء جیسے بابا فریدالدین گنج شکر، حضرت نظام الدین اولیاء اور چراغ دہلوی کے بارے میں منصوبہ بندی یا غیر منصوبہ بندی سے تکالیف و قتل میں شامل ہوتے۔(93) ان حکایات میں دکھایا گیا کہ زیادہ تر شیخ کو اپنے کشف سے ان کے حملوں سے قبل ان کے ارادہ کا علم ہو جاتا۔ دو کیسوں میں کہ جن میں سدی مولئی اور چراغ دہلوی شامل تھے قلندروں کو حملے کے لئے خاص وقت اور موقع دیا گیا کہ وہ شیخ کو قتل کریں ان حکایات سے پتہ چلتا ہے کہ چشتیوں کا ان مخالف گروہوں کے ساتھ رویہ ہمدردانہ تھا۔ یہاں تک کہ چراغ دہلوی زخمی ہوئے مگر حملہ آوروں کو معاف کر دیا گیا۔(94) ان واقعات سے نہ صرف ان گروہوں کے تشدد کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ معلوم بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات شیخ کے سیاسی مخالفین ان کی خدمات کرائے پر حاصل کرتے تھے کہ انہیں ختم کیا جا سکے۔ مزید ان احکامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ گھومنے پھرنے والے درویش نفسیاتی طور پر ابنارمل ہوتے تھے۔(95)

ان قلندروں کے مقابلے میں آنے والے یوگی، برہمن، سنیاسی اور گرو جو ہندو تھے، کم تشدد پرست ہوتے تھے کم از کم ان صوفیاء کے ملفوظات میں ایسا ہی ہے۔ ان میں سے کچھ شیخ کی ماورائی

قوتوں کو دیکھنے کے لئے آتے تھے، اگر چہ شیخ کی کراماتی صلاحیت ان پر غالب آ جاتی تو روحانی قوت رکھنے والے یہ لوگ اسلام قبول کر لیتے اور شاگرد بن کر ولی کے عہدے تک جا پہنچتے۔ بصورت دیگر شرمندہ ہو کر واپس بھاگ جاتے۔ بعض اوقات یوگی دور دراز پہاڑوں سے شیخ کو یہ بتانے آتے کہ اس کی بزرگی و عظمت کے بارے میں ان کو اس وقت پتہ چلا جب وہ غاروں میں استغراق کر رہے تھے۔(96) کئی مرتبہ باہم کرامات کا مقابلہ ہو جاتا جس میں غیر مسلم روحانی پیشواؤں کو شکست ہوتی۔ ان مقابلوں میں شیخ کی فتح کو اس کی ولایت کی اتھارٹی کے دعویٰ کے طور پر پیش کیا جاتا۔(97)

مذکورہ بالا تمام بحث جو ان ذرائع سے واضح ہوتی ہے، واشگاف انداز میں صوفیاء کی دہلی سلطنت کے معاشرے اور سیاست میں اتھارٹی کی حیثیت کو نمایاں کرتی ہے۔ ایک اہم ذریعہ جس سے شیخ کی اتھارٹی اور بھی تسلیم کی جاتی وہ اس کی غیر معمولی صلاحیتیں تھیں اگر چہ جہاں زیادہ تر نظر انداز اور نا قابل اعتبار کئے جانے والے صوفیاء کے ذرائع سے بات کی ہے، تاہم مستند تذکرہ جات اور ملفوظات بھی ایسی حکایات سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کہانیاں چشتی شیخ حضرت نظام الدین اولیاء کی بیان کردہ ہیں بعد میں آنے والے صوفیاء جیسے چراغ دہلوی، شیخ جمالی، اور عبدالحق محدث نے ان معجزات کی تفصیلات میں نہ صرف اضافے کئے ہیں بلکہ کئی نئی چیزیں بھی شامل کی ہیں ان سب کے لئے معجزہ ہر صوفی سلسلے کے لئے لازم تھا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ یہ معجزہ جات مزارات کے متولیوں کے پیش کردہ ہیں جو کم علم زائرین سے فوائد حاصل کرنے کے لئے گھڑے گئے ہیں، قابل اعتبار نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں نمائندہ صوفیاء خود یقین رکھتے تھے کہ اولیاء جو کہ خدا کے دوست ہوتے ہیں، اگر انہوں نے طریقہ اختیار کیا تو ان میں ماورائی صلاحیتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ان کی رائے میں تاہم صوفیاء کو چاہئے کہ جو قوتیں ان کو حاصل ہو گئی ہیں ان کے فخریہ اظہار سے اجتناب کریں۔

مزید، اگر چہ زیادہ تر معجزات کائناتی نوعیت کے ہیں وہ ان صوفیاء سے منسوب ہیں جو پڑھے لکھے تھے حقیقت میں صوفیاء اپنے وقت کے نہ صرف عالم فاضل لوگ تھے بلکہ انہوں نے فارسی زبان میں تخلیقی اظہار بھی کیا جو کہ اشرافیہ کی زبان تھی۔ لہٰذا عوامی شہرت یا مشہور اعتقاد جیسی اصطلاحات صوفیاء کی رسومات کو بیان کرنے میں قابل اعتراض ٹھہرتی ہیں صوفیاء نے اپنے

تجربات اور حیثیت کو اسلام کی عظیم روایت ۔۔۔ جو کہ قرآن کی بتائی ہوئی روایت ہے جو کہ حضرت محمدؐ کی بتائی ہوئی روایت ہے اور اسلام کے ابتدائی دور کی نمائندہ مذہبی شخصیات کی روایت ہیں ۔۔۔ میں رکھا۔ صوفیاء و شیخ کی معجزاتی قوتوں کی دعویداری دراصل حضرت محمدؐ کی تعلیمات اور زندگی سے پھوٹتی ہے۔

صوفیاء دعویٰ کرتے تھے کہ وہ تو صرف حضورؐ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ صوفیاء کے مریدین اپنے آپ کو حضرت محمدؐ کی جماعت (اہل سنت والجماعت) سے خیال کرتے تھے اور امید رکھتے تھے کہ وہ اس دنیا اور دوسری دنیا دونوں میں کامیاب ہوں گے۔ اس مقابلے میں شیخ کے مخالفین کی نہ صرف بے عزتی ہوگی بلکہ جہنم رسید ہوں گے۔ عوام کی رائے میں انہیں شیخ کے سامنے جھکنا چاہئے اور کامران ہونا چاہئے یا شیخ کے کرشمے اور بزرگی کی تصدیق سے انکار کرنے کا مطلب معاشرے میں تباہی اور نقصان کے لئے تیار رہنا چاہئے، زیادہ تر نے حقیقت میں صوفیاء کی اتھارٹی کو ماننے کا راستہ اختیار کیا۔

References

1. Literature on Sufi cults produced on this line is numerous, but see K.A. Nizami, ed, *Politics and Society During the Early Medieval Period.* Collected Works of Muhammad Habib, 2 vols (PPH, Delhi, 1974 and 1981); Yusuf Husain, *Glimpses of Medieval Indian Culture* (Asia, Bombay, 1957); K.A. Nizami, *Some Aspects of Religion and Politics in India During the 13th Century* (Aligarh Muslim University, Aligarh, 1961); Baba Shaikh Farid - *Life and Teaching* (Baba Farid Memorial Society, Patiala, 1973); S.A.A. Rizvi, *A History of Sufism in India,* Vol. I,

Early Sufism and its History in India to 1600 A.D. (Munshiram Manoharlal, Delhi, 1978); I.H. Siddiqui, "The Early Chishti Dargahs", in C.W. Troll, ed, *Muslim Shrines in India -- Their Character, History and Significance* (OUP, Delhi, 1989).

2. The word karama denotes the miracles or marvels of a saint. It is believed in the Sufi circle that the ability to perform miracles is bestowed by God to his 'friends' or auliya (sing. wali), L. Gardet, 'Karama', in *The Encyclopaedia of Islam,* New Edition (E.J. Brill, Leiden, 1978), Vol. IV, pp. 615-16.

3. For this purpose, we have utilized both the 'forged' and 'authentic' Sufi sources from the Delhi Sultanate. For the classification of the sources on this line, see Muhammad Habib, "Chishti Mystics' Records of the Sultanate Period", *Medieval India Quarterly,* Vol. I, 1950, pp. 1-42. For a brief and tentative discussion on the usefulness of the so-called 'spurious' Sufi sources, see Raziuddin Aquil, "Conversion in Chishti Sufi Literature (13th-14th Centuries)", *The Indian Historical Review,* Vol. 24, Nos 1 and 2, edited by Anup Taneja and Kalyani Subramanyan (ICHR and Motilal Banarsidass, Delhi, 1997-98), pp.70-94.

4. Born in a respectable family sometime in A.D. 1175 at Kahtawal (or Kahotwal), near Multan, Farid-ud-Din, then known as Mas'ud, was mystically inclined even as a student, which had earned him the sobriguet, diwana bachcha. He went on to be a leading saint of the Chishti order. His tomb is at Ajodhan, now called Pak Pattan, in Pakistani Punjab. For biographical material on the Shaikh's life, see Amir Khwurd, *Siyar-ul-Auliya* (Markaz Tahqiqat-i-Farsi Iran wa Pakistan, Lahore, 1978), pp. 67-101; Shaikh Jamali, *Siyar-ul-Arifin,* British Museum, Ms. Or. 5853, OIOC, British Library, London, fols. 43a-65b; Shaikh 'Abdul Haqq Mohaddis Dihlawi, *Akhbar-ul-Akhyar fi Asrar-ul-Abrar* (Kutubkhana Rahimiyya, Deoband, n.d.), pp. 58-60; 'Ali Asghar, *Jawahir-i-Faridi* (Victoria Press, Lahore, 1884). Also see Khaliq Ahmad Nizami, *The Life and Times of Shaikh Farid-ud-Din Ganj-i-Shakar* (Aligarh Muslim University, Aligarh, 1955); Baba Shaikh Farid - Life and Teaching, op. cit.
5. *Siyar-ul-Auliya,* pp. 94-95; Siyar-ul-Arifin, fol. 45b; *Jawahir-i-Faridi,* p. 220.
6. Born c. A.D. 1141 in Sijistan, Mu'in-ud-Din established the Chishti order of Sufism in the subcontinent. After

travelling to the major centres of Islamic learning and culture in Central Asia, Iran and the Middle East, Mu'in-ud-Din settled down in India in the advanced stage of his life. His tomb at Ajmer is a major centre of pilgrimage for Muslims and non-Muslim alike. For biographical material, see *Siyar-ul-Auliya,* pp. 55-58; *Akhbar-ul-Akhyar,* pp. 28-31. Also see, P. M. Currie, *The Shrine and Cult of Muin al-Din Chishti of Ajmer* (OUP, Delhi, 1989).

7. Spiritual successor of Mu'in-ud-Din Chishti, Qutb-ud-Din was born at Ush in Transoxania. After long journey's undertaken with his preceptor, Qutb-ud-Din finally established himself in Delhi, despite the volatile political culture of the city in the early decades of the thirteenth century. For biographical material, see *Siyar-ul-Auliya,* pp. 58-67. Also see Rizvi, *A History of Sufism in India,* op. cit., pp. 133-38.
8. *Siyar-ul-Auliya,* pp. 64-65.
9. Successor of the Chishti saint Farid-ud-Din, Nizam-ud-Din was born in c. A.D. 1243-44 at Badaun in a family that had migrated to India from Bukhara. After completing his education, with specialization in hadis (Traditions of the Prophet) and fiqh (jurisprudence),

Nizam-ud-Din was looking for a job of qazi (judge) in Delhi before being introduced to Islamic mysticism by Farid-ud-Din's brother Najib-ud-Din Mutawwakil. For biographical material, see Muhammad Jamal Qiwam, *Qiwam-ul-Aqaid,* Urdu translation by Nisar Ahmad Faruqi (Rampur, 1994); *Siyar-ul-Auliya,* pp. 101-65; *Siyar-ul-Arifin,* fols. 75b-100b; and Akhbar-ul-Akhyar, pp. 61-66. Also see K.A. Nizami, The Life and Times of *Shaikh Nizam-ud-Din Auliya* (Idarah-i-Adabiyat-i-Delhi, Delhi, 1991).

10. *Siyar-ul-Auliya,* p. 145.
11. Ibid., pp. 144-45; *Akhbar-ul-Akhyar,* p. 64.
12. *Akhbar-ul-Akhyar,* pp. 63-64. For other accounts of Ala-ud-Din Khalji's hostility towards the Shaikh, his subsequent faith in the miraculous ability of the latter and acceptance of the princes, Khizr Khan and Shadi Khan, in the jama'at-khana as disciples of the Shaikh, see *Qiwam-ul-Aqaid,* pp. 91-96. Also see Zia-ud-Din Barani, *Tarikh-i-Firuz Shahi,* British Museum, Ms. Or. 6376, OIOC, British Library, London, fols. 153a-b.
13. Last of the five 'great' saints of the Chishti order, Chiragh-i-Dehli was born at Awadh (Ayodhya). His father, a textile merchant, died when the Shaikh was still

a young boy. He received his education in the traditional Muslim disciplines from the leading scholars of the place. He gave up his family business at the age of twenty-five so as to devote his time to prayers and meditation. Moving to Delhi at the age of forty-three, he became a disciple of Nizam-ul-Din Auliya. His tomb is in Delhi. For biographical material, see *Siyar-ul-Auliya,* pp. 246-57; *Siyar-ul-Arifin,* fols. 126a-130b; *Akhbar-ul-Akhyar,* pp. 86-92. Also see K.A. Nizami, *The Life and Times of Shaikh Nasir-ud-Din Chiragh* (Idarah-i-Adabiyat-i-Delhi, Delhi, 1991).

14. *Siyar-ul-Auliya,* pp. 255-56; *Akhbar-ul-Akhyar,* p. 87.
15. For a study of the 'authority' connotation of the Shaikh's wilayat, leading to conflict with the rulers and the victory of the shaikh as recorded in the sources of the Delhi Sultanate, see Simon Digby, *"The Sufi Shaikh and the Sultan: A Conflict of Claims to Authority in Medieval India",* Iran - Journal of Persian Studies, Vol. 28, 1990, pp. 71-74.
16. Amir Hasan Sijzi, *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Persian text with Urdu translation by Khwaja Hasan Sani Nizami (Urdu Academy, Delhi, 1991), Vol. IV, 21st meeting; *Siyar-ul-Auliya,* p. 89; *Tarikh-i-Firuz Shahi,* fols.

158b-160a.

17. *Tarikh-i-Firuz Shahi,* fols. 96b-99a.

18. *Akhbar-ul-Akhyar,* p. 79. For *Abu Bakr Tusi,* also see ibid., pp. 79-80. Among modern secondary works, see Nizami, *Some Aspects of Religion and Politics in India*, op. cit., pp. 288-91; Simon Digby, *"Qalandars and Related Groups: Elements of Social Deviance in the Religious Life of the Delhi Sultanate of the Thirteenth and Fourteenth Centuries",* in Y. Friedman, ed, Islam in Asia, Vol. I, South Asia (Jerusalem, 1984), pp. 67-68.

19. Of the four schools of Sunni jurisprudence, the Hanafites have been dominant in north Indian Islam. The Hanafite ulama of the Delhi Sultanate considered music assemblies organized by the Shaikh illegal. The controversy surrounding Nizam-ud-Din's justification of sama is discussed here. Also see Bruce B. Lawrence, *"The Early Chishti Approach to Sama",* in M. Israel and N.K. Wagle, ed, Islamic Society and Culture - Essays in Honour of Professor Aziz Ahmad (Manohar, Delhi, 1983), pp.69-93.

20. See, for example, the theologians reaction to Shaikh Luqman Sarakhsi and his miraculous escape by riding a wall, *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. I, 7th meeting.

21. *Afzal-ul-Fawa'id* (collection of the discourses of

Nizam-ud-Din Auliya), compilation attributed to Amir Khusrau, Urdu translation (Maktaba Jam-i-Noor, Delhi, n.d.), p. 138.

22. For material on Rukn-ud-Din Suhrawardi, see *Siyar-ul-Arifin*, fols. 100b-107a; *Akhbar-ul-Akhyar*, pp. 69-72. For Sultan Qutb-ud-Din's invitation to Rukn-ud-Din, also see *Tarikh-i-Firuz Shahi*, fol. 183a.
23. *Qiwam-ul-Aqaid*, p. 52.
24. Ibid., pp. 98-99.
25. *Khair-ul-Majalis* (collection of the discouses of Nasir-ud-Din Chiragh-i-Dehli compiled by Hamid Qalandar), edited by Khaliq Ahmad Nizami (Aligarh Muslim University, Aligarh, 1959), 87th meeting.
26. *Siyar-ul-Auliya*, pp. 160-61. Recounting this story, 'Abdul Haqq mentions the name of Nizam-ud-Din's mother as Bibi Zulekha, *Akhbar-ul-Akhyar*, pp. 303-04. For Khusrau Khan's rebellion and execution of the sultan, see *Tarikh-i-Firuz Shahi*, fols. 185b-189a.
27. *Siyar-ul-Arifin*, fols. 87b-88a.
28. For a brief biographical note, see *Akhbar-ul-Akhyar*, p.79.
29. *Siyar-ul-Arifin*, fols. 88a-89a. Barani notes that the Shaikh had greeted the Sultan, but the latter did not respond, *Tarikh-i-Firuz Shahi*, fol. 183a. Also see

Akhbar-ul-Akhyar, p. 79.

30. *Siyar-ul-Arifin,* fols. 89a-90a.

31. Born at Kot Karor, near Multan, in c. A.D. 1182-83, Baha-ud-Din became a disciple and khalifa of Shaikh Shahab-ud-Din Suhrawardi at Baghdad during the course of his journey through the Middle East. Returning to India, Baha-ud-Din founded the influential Suhrawardi order at Multan, which competed with the Chishtis for power and prestige in the thirteenth and fourteenth centuries. For biographical material, see *Siyar-ul-Arifin,* fols. 11b-31b; *Akhbar-ul-Akhyar,* pp. 32-34.

32. *Siyar-ul-Auliya,* p. 71.

33. *Siyar-ul-Arifin,* fols. 34a-b.

34. For Auhad-ud-Din Kirmani's mystical career and poetical works, see B. Forouzanfar, ed, *Manaqeb-e Owhad al-Din Hamed Ibn-e Abi-Alfakhr-e Kirmani,* A Persian Text from the VII Century A.H. (BTNK, Tehran, 1969); P. L. Wilson and B.M. Weischer, Heart's Witness: *The Sufi Quatrians of Awhaduddin Kirmani* (Imperial Iranian Academy of Philosophy, Tehran, 1978); B.M. Weischer, ed, *Ghazaliyat wa Rubaiyat Shaikh Auhaduddin Kirmani* (Verlag Borg, Hamburg, 1979).

35. *Rahat-ul-Qulub* (collection of the discouses of

Farid-ud-Din Ganj-i-Shakar, compilation attributed to *Nizam-ud-Din Auliya*), Urdu translation (Maktaba Jam-i-Noor, Delhi, n.d.), pp. 32-33.

36. Ibid., pp. 14-15.
37. *Siyar-ul-Arifin,* fols. 21b-22a.
38. See Richard M. Eaton, *"The Political and Religious Authority of the Shrine of Baba Farid",* in Barbara D. Metcalf, ed, *Moral Conduct and Authority - The Place of Adab in South Asian Islam* (University of California Press, Berkeley, 1984), pp. 333-56.
39. For accounts of the indifference of the Chishti towards wealth, see Rizvi *A History of Sufism in India,* op. cit., p. 123. For the reports of accumulation of wealth by the Suhrawardis, see *Siyar-ul-Auliya,* p. 169.
40. Hamid-ud-Din was a khalifa of Mu'in-ud-Din Chishti. For a biography in Urdu, see Ihsan-ul-Haqq Faruqi, *Sultan-ut-Tarikin* (Dairah Mu'in-ul-Ma'arif, Karachi, 1963).
41. Rizvi, *A History of Sufism in India,* op. cit., p. 129. Also see *Siyar-ul-Auliya,* p. 168.
42. Rizvi, *A History of Sufism in India,* op. cit., pp. 128-29. Also see *Siyar-ul-Arifin,* fols. 9b-10a.
43. *Siyar-ul-Auliya,* pp. 537-40.

44. Ibid., pp. 541-42.
45. Ibid., p. 542.
46. *Siyar-ul-Arifin,* fols. 97b-99b. Barani refers to the recovery of the amount distributed by Khusrau Khan, but makes no mention of Nizam-ud-Din Auliya in this context. See *Tarikh-i-Firuz Shahi,* fols. 199b-200a.
47. For the betowal of kingship upon the prince shortly before the death of the sultan, see *Qiwam-ul-Aqaid,* p. 96. Ibn Battuta, *'Aja'ib-ul-Asfar,* Urdu translation by Maulwi Muhammad Husain (Islamabad, 1983), p. 92. For Barani's account of the ruler's accidental death, see *Tarikh-i-Firuz Shahi,* fols. 209b-210a.
48. Simon Digby, *"The Sufi Shaikh and the Sultan",* op. cit., p. 74.
49. Ibid., p. 75.
50. *Fawa'id-us-Salikin* (conversations of Shaikh Qutb-ud-Din Bakhtiyar Kaki, compilation attributed to Shaikh Farid-ud-Din Ganj-i-Shakar), Urdu translation (Maktaba Jam-i-Noor, Delhi, n.d.), p. 15.
51. *Minhaj-us-Siraj, Tabaqat-i-Nasiri,* edited by Abdul Hayy Habibi (Anjuman Tarikh-i-Afghanistan, Kabul, 1963-64), Vol. I, pp. 441-42.
52. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. IV, 61st meeting. For a different

version of the account of bestowal of kingship to Iltutmish, see Nizam-ud-Din Ahmad, *Tabaqat-i-Akbari*, Ms. I.O. Islamic 3320, OIOC, British Library, London, fol. 28a. K.A. Nizami accepts these stories as true (Studies in Medieval Indian History and Culture, Allahabad, 1966, p. 16), while Rizvi rejects them as myths, *A History of Sufism in India*, op. cit., p. 135, fn. 2.

53. See Raziuddin Aquil, *"Sufi Cults, Politics and Conversion: The Chishtis of the Sultanate Period", The Indian Historical Review,* Vol. 22, Nos 1 and 2, edited by Indira B. Gupta (ICHR and Motilal Banarsidass, Delhi, 1995-96), pp. 190-97.

54. *Rahat-ul-Qulub* (collection of the discourses of Farid-ud-Din Ganj-i-Shakar, compilation attributed to Nizam-ud-Din Auliya), Urdu translation (Maktaba Jam-i-Noor, Delhi, n.d.), p. 34; *Siyar-ul-Auliya,* p. 60; *Siyar-ul-Arifin,* fols. 34a-b. For the hostility between Qubacha and Zakariya, see *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. IV, 4th meeting.

55. *Rahat-ul-Qulub,* p. 34.

56. *Asrar-ul-Auliya* (collection of the conversations of Farid-ud-Din Ganj-i-Shakar, compiled by Shaikh Badr-ud-Din Ishaq), Urdu translation by M. Muinuddin

Durdai (Nafis Academy, Karachi, 1975), pp. 183-84; *Fawa'id-us-Salikin,* p. 15; *Rahat-ul-Qulub,* p. 32.

57. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. I, 8th meeting.
58. See Digby, *"The Sufi Shaikh and the Sultan",* op. cit., p.71.
59. *Afzal-ul-Fawa'id,* op. cit., p. 64.
60. In Muslim folk-belief, the pari or fairy is reported to be a female jinn. Identified as companions of God and worshipped by the pre-Islamic Arabs, jinns have survived in Islamic societies as malevolent supernatural acreatures. It is believed that there are two types of jinns -- Muslim and infidel. The latter are supposed to be more wicked and difficult to be controlled. For a note on the places where they live, their behaviour towards human beings, particularly the illnesses afflicted by them, and the precautions taken to avoid falling in their trap, see the entry *'Djinn',* in *The Encyclopedia of Islam,* New Edition (E.J. Brill, Leiden, 1965), Vol. II, pp. 546-50.
61. *Rahat-ul-Qulub,* pp. 16, 65, 87; *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. V, 29th meeting.
62. Fawa'id-ul-Fu'ad, Vol. II, 23rd meeting; Khair-ul-Majalis, 35th meeting.
63. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. II, 23rd meeting. The Mu'tazila

was a 'rationalist' movement which emerged in the 'Abassid Caliphate'. Though within the parameters of orthodox Islam, the leaders of this school advocated a certain degree of intellectual liberty. They, however, used political power, for some time, to suppress those who dared to disagree with them. For an overview of their doctrines, see D. Gimaret, 'Mu'tazila', in *The Encyclopaedia of Islam,* New Edition (E.J. Brill, Leiden, 1990), Vol. VII, pp. 783-93.

64. *Khair-ul-Majalis,* 35th meeting; *Siyar-ul-Arifin,* fols. 49a-50b.
65. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. IV, 51st meeting. For the later use of amulets among Muslims in India, see Jafar Sharif, Islam in India or the *Qnaun-i-Islam - The Customs of the Muslamans of India,* translation by G. A. Herklots and revised by William Crooke (London, 1975), pp. 254-55.
66. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. II, 17th meeting.
67. Ibid., Vol. II, 5th meeting.
68. *Khair-ul-Majalis,* 33rd meeting. For similar contestations over the body of saints in medieval Christianity, see A. Gurevich, Medieval Popular Culture Problems of Belief and Perceptions, translation by Jano M. Bak and Paul A. Hollingsworth (Cambridge University Press, Cambridge,

1988), p. 39.

69. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. II, 18th meeting; ibid., Vol. IV, 3rd meeting; Siyar-ul-Auliya, p. 88; Siyar-ul-Arifin, fols. 59b-60a.
70. *Siyar-ul-Auliya,* p. 96.
71. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. IV, 51st meeting.
72. Sudhir Kakar, Shamans, Mystics and Doctors: *A Psychological Inquiry into India and its Healing Traditions* (OUP, Delhi, 1982), p. 29.
73. Raziuddin Aquil, *"Conversion in Chishti Sufi Literature"*, op. cit., p. 79.
74. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. II, 18th meeting; *Siyar-ul-Auliya,* p. 88; *Siyar-ul-Arifin,* fols. 59b-60a; *Jawahir-i-Faridi,* p.236.
75. *Rahat-ul-Muhibbin* (conversations of Nizam-ud-Din Auliya, compilation attributed to Amir Khusrau), Urdu translation (Maktaba Jam-i-Noor, Delhi, n.d.).
76. *Asrar-ul-Auliya,* p. 235.
77. He was a contemporary of Khwaja Qutb-ud-Din Bakhtiyar Kaki and Sultan Shams-ud-Din Iltutmish. *Akhbar-ul-Akhyar,* p. 52.
78. *Asrar-ul-Auliya,* p. 237. 'Abdul Haqq notes that the cloth belonged to the Sufi's mother, Bibi Sara, herself a pious

woman, *Akhbar-ul-Akhyar,* pp. 300-01. 'Ali Asghar adds that the lady had received the cloth from Bakhtiyar Kaki, *Jawahir-i-Faridi,* p. 175.

79. *Khàir-ul-Majalis,* 8th meeting.
80. *Siyar-ul-Arifin,* fols. 113a.
81. For some of the stories, see *Qiwami-ul-Aqaid,* pp. 39-40; 60-62; 77-84.
82. *Qiwam-ul-Aqaid,* p. 57; *Akhbar-ul-Akhyar,* p. 63.
83. *Qiwam-ul-Aqaid,* pp. 33-35.
84. For brief biographical note, see *Akhbar-ul-Akhyar,* p. 55.
85. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. III, 2nd meeting.
86. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. IV, 3rd meeting. For the miracles of the Prophet, see A.J. Wensinck, *'Mu'djiza', The Encyclopaedia of Islam,* op. cit., 1990, p. 295.
87. *Siyar-ul-Auliya,* pp. 64-65.
88. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. IV, 44th meeting.
89. Ibid., Vol. IV, 21st meeting; *Siyar-ul-Auliya,* p. 88.
90. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. IV, 19th meeting.
91. *Khair-ul-Majalis,* 9th meeting.
92. *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. V, 2nd meeting.
93. Ibid., Vol. IV, 26th meeting; *Siyar-ul-Arifin,* fols. 129a-130b.
94. The Suhrawardis by contrast disliked these wandering

mystics, *Fawa'id-ul-Fu'ad,* Vol. I, 3rd meeting; *Khair-ul-Majalis,* 38th meeting.

95. For a detailed discussion of the activities of these deviant groups, their social background and the way they were treated by the Sufi shaikhs of different silsilas, see Simon Digby, *"Qalandars and Related Groups"*, op. cit., pp. 60-108.

96. *Qiwam-ul-Aqaid,* p. 63.

97. For some such episodes, see Raziuddin Aquil, *"Conversion in Chishti Sufi Literature"*, op. cit.

آغاز کی نشان دہی

کرشن کمار/ترجمہ:ظہور چوہدری

1857ء کی جنگِ آزادی میں ایسے عناصر موجود ہیں جنہوں نے اسے جدوجہدِ آزادی کی داستان کے رسمی آغاز کے لئے ایک مکمل تعلیمی انتخاب بنا دیا ہے یہ جو قابلِ ذکر تعلیمی موقع پیش کرتا ہے اس کا زیادہ تر تعلق اس کے اُس مقام سے ہے جہاں یہ جدوجہدِ آزادی کے ریکارڈ میں اپنے مشمولات کے ساتھ درج ہے۔ اس کی صورت کو نواحی اختلاف دیتے ہوئے ہم یہ سوال کر سکتے ہیں کہ آیا یہ ہندوستان کی جدوجہد کا آغاز کرنے کا ایک نشان ہے یا محض ایک داستان، جہاں تک سکول کی درسی کتب کا تعلق ہے تو جواب حتمی طور پر اوّل الذکر ہی ہوگا اور پاکستانی درسی کتب کے حوالے سے دیکھیں تو یہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ دونوں ملکوں کی درسی کتابیں یہ تاثر چھوڑتی ہیں کہ باغی قومی آزادی کے ایک خواب سے متاثر ہوئے تھے۔ 1857ء کے تناظر میں شاید ہی کوئی درسی کتاب ایسی ہوگی جو بچوں کو براہِ راست ''قومی'' یا ''قوم پرست'' جیسی کسی اصطلاح کے بارے میں خبردار کرتی ہو۔ تاریخ کی تدریس کے بارے جو کچھ سچ ہے وہی اس موضوع پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں استعمال ہونے والی بہت سی درسی کتب 1857ء کو آزادی کی تحریک کے ایک واضح آغاز کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ اس پیشکش کا مختصر متن اختلافی ہوسکتا ہے مگر عام پیغام واضح ہے۔ بھارتی صورت میں آٹھویں اور بارہویں جماعت کی تاریخ کی درسی کتابوں کو ''جدید ہندوستان'' کا نام دیا گیا ہے اور توقع کی گئی ہے کہ نوجوان قاری کو 1857ء کی بغاوت کا ایک ایسے واقعے کے طور پر ادراک ہوگا جو ہندوستانی تاریخ کے ہم عصر دور میں مضبوطی سے جما ہوا

ہے۔ دراصل ہندوستانی درسی کتب ''جدید ہندوستان'' کی تاریخ کو 18 ویں صدی کے آغاز سے ہی شروع کرتی ہیں۔ اس کی اور اس تاریخ کے انتخاب کی کوئی وضاحت نہیں کی جاتی۔ بچے سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ''جدید ہندوستان'' کی ''پیدائش'' کا اندازہ مغل سلطنت کے زوال میں ڈھونڈے جس کا آغاز اٹھارہویں صدی میں ہوا، ملاحظہ ہو NCERT کی بارہویں جماعت کی درسی کتاب کا باب دوئم جس کا عنوان ''یورپی مداخلت'' ہے اور اسے ہی ہندوستان کا جدید دور میں داخلے کا ایک آلہ قرار دیا گیا ہے۔ مڈل سکول کی جماعتوں پر بھی ''جدید ہندوستان'' کے اس لیبل کا اطلاق کیا گیا ہے۔ تقسیم کچھ یوں ہے کہ چھٹی جماعت کے لئے ''قدیم ہندوستان'' ساتویں کے لئے ''عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان'' اور آٹھویں جماعت کے لئے ''جدید ہندوستان'' کے عنوانات رکھے گئے ہیں۔

بظاہر یہ پیغام کہ ''جدید ہندوستان'' مغلیہ سلطنت کے زوال سے ابھرا اور نتیجتاً ہندوستان میں نو آبادیاتی نظام شروع ہوا ایک عام فہم بات ہے۔ 19 ویں صدی کے نصف اوّل کی سماجی اور ثقافتی بیداری کے دوران میں جو تبدیلیاں یا اصلاحات سماجی اور انتظامی اداروں میں ہوئیں، ان کو ہندوستان کی جدیدیت کے پہلو کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور ظاہر ہے یہ تبدیلیاں نو آبادیاتی قبضے کے پس منظر میں ہوئیں۔ ''ترقی'' کے اس عام نقشے میں 1857ء کا غدر قدرے الجھن پیدا کرتا ہے۔ اس کے سطحی خطوط اتنے ہی آسان اور واضح ہیں جیسے کہ ایک درسی کتاب کے سبق کے ہونا چاہئیں لیکن اس کے مطالب واضح طور پر غیر یقینی اور تشریح کے محتاج ہیں۔ یہ سطحی خطوط اس قدر سادہ اور قابلِ پیشین گوئی نظر آتے ہیں کہ مختلف درسی کتب میں 1857ء کا باب ایک جیسے ہی ڈھانچے کا حامل ہے اور اس پر کوئی حیرانی نہیں ہوتی۔ یہ تقریباً چار حصوں میں منقسم ہے:۔

بغاوت کے عمومی اسباب، فوری وجوہات، اہم واقعات اور ناکامی کی وجوہات ایک درسی کتاب کے باب اور جماعت میں پڑھائے جانے والے سبق کی حیثیت سے، ہندوستانی تاریخ کا کوئی بھی حصہ ایسا حسین تناسب نہیں رکھتا۔ پھر بھی اس حُسنِ تناسب کے نیچے تشریح کی غیر یقینی کیفیت اور غدر کو قومی جدوجہدِ آزادی کی داستان میں فِٹ کرنے کی واضح مشکلات موجود ہیں۔

ثانوی درجے کی کچھ کتابیں بتاتی ہیں کہ 1857ء کا موضوع، مؤرخین کے درمیان بڑے اختلافات کا باعث ہے لیکن بمشکل ہی کوئی درسی کتاب بچوں کو ایسا موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ اس

اختلاف کے بارے میں تھوڑا بہت ہی جان سکیں۔کوئی درسی کتاب آر۔سی۔موجمدار کے اس نزاع کو بیان نہیں کرتی کہ 1857ء کی بغاوت میں قوم پرستی کا عنصر موجود نہیں تھا۔(1)اس مناقشے کا آغاز اس وقت ہوا جب موجمدار موصوف نے اپنے آپ کو اس بغاوت کا ایک قوم پرستانہ احوال لکھنے سے الگ کر لیا جیسا کہ سکولوں کے مؤرخین نے کیا ہے۔مغربی بنگال کے ثانوی سکولوں کے طلبہ کے لئے لکھی گئی۔ایس رائے کی درسی کتاب آر سی موجمدار کے بارے میں بیان ضرور کرتی ہے تاہم لیکن ان کے صرف اس نقطہءنظر تک محدود ہے کہ بغاوت سپاہیوں نے شروع کی تھی اور بعد میں اسے کچھ عوامی حمایت حاصل ہوگئی تھی۔1857ء کے باب کے متبادل عنوانات میں ہم اس نزاع کا تھوڑا بہت اشارہ محسوس کرتے ہیں۔بعض درسی کتب اسے ''1857ء کا غدر'' کہہ کر پکارتی ہیں جبکہ دیگر اس کو آزادی کی پہلی جنگ قرار دیتی ہیں۔

جو کتابیں 1857ء کے غدر کو ''پہلی جنگِ آزادی'' بتاتی ہیں انہیں اس کو ''آزادی کی قومی جدوجہد'' کے سیاق وسباق میں دیکھنے سے کوئی عار نہیں۔ثانوی سکولوں کے لئے U.P کی درسی کتاب کا کہنا ہے ''اس غدر (بغاوت) نے ہندوستانی عوام کی سیاسی بیداری میں اضافہ کیا اور سماجی اصلاحات اور جدیدیت کی تحریکیں پہلے ہی شروع ہو چکی تھیں۔'' بظاہر درسی کتاب کا مصنف بغاوت کی سیاست اور اُس وقت کی سماجی اصلاحات میں کوئی تضاد محسوس نہیں کرتا۔مزے کی بات یہ ہے کہ عام طور پر جس بات پر زیادہ بحث کی جاتی ہے وہ بغاوت کے ''اسباب'' میں وہ روّیے اور عقاید بھی شامل ہیں جن کو وہ سماجی اصلاحات کی تحریکیں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

صرف NCERT کی درسی کتب جو آٹھویں اور بارہویں جماعت کے لئے لکھی گئی ہیں ان میں 1857ء کے واقعات کو سیاسی اور سماجی طاقتوں کے پیچیدہ تعامل کی نمائندگی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ دونوں نمایاں درسی کتب، 1857ء کے سیاق وسباق میں ''قومی'' کی اصطلاح استعمال کرنے کی ممانعت کرتی ہیں۔آٹھویں جماعت کی درسی کتاب (جسے دیوانیڈ دیو نے لکھا ہے) کہتی ہے کہ ''معاشرے میں ایسے کوئی گروہ پیدا نہیں ہوئے تھے جو سماجی اور معاشی زندگی میں بنیادی تبدیلیوں کے لئے لڑتے اور لوگوں کے درمیان قومی اتحاد کے رشتوں کو مضبوط بناتے'' NCERT کی دسویں جماعت کے لئے لکھی گئی اپنی درسی کتاب میں ارجن دیو کہتے ہیں کہ ''اس بغاوت نے ہندوستانی لوگوں کو پہلے کی بہ نسبت سیاسی طور پر زیادہ باشعور بنا دیا تھا۔'' اس

کا مطلب یہ ہوا کہ 19 ویں صدی کے وسطی سیاق وسباق کی وضاحت نہیں کی گئی۔ NCERT کی بارہویں جماعت کی درسی کتب جو کہ بپن چندر کی تحریر کردہ ہے اس میں البتہ مختلف آراء اور تصورات کے جائزے لینے کی کوشش کا ہمیں پتہ چلتا ہے۔ اس میں تصوراتی حُسنِ تناسب کو قائم کر کے نوجوان قارئین کے ذہنوں میں ابھرنے والی کسی الجھن پر غلبہ پانے کی کوشش بھی شامل ہے۔ اس کوشش کو ذرا تفصیل سے جانچنے کی ضرورت ہے۔

اگر چہ بپن چندر غدر کو ''آزادی کی جنگ'' کہنے سے گریز کرتے ہیں لیکن وہ اسے ''انقلابی جنگ'' قرار دینے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب باغیوں نے ضعیف اور کمزور مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو ہندوستان کا شہنشاہ قرار دیا تو سب ایک ہو گئے تھے۔ اس فعل کے ذریعے انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ مغل خاندان کے طویل دورِ حکومت نے ہندوستان کی سیاسی وحدت کو اس کی ایک روایتی علامت بنا دیا تھا۔ اسی واحد اشارے کے ساتھ چندر کہتے ہیں ''سپاہیوں نے فوجیوں کی بغاوت کو ایک انقلابی جنگ میں تبدیل کر دیا تھا۔''

1857ء پر یہ فیصلہ صرف ہندوستانی تاریخ نگاری میں موجود کھنچاؤ کے سیاق وسباق میں واضح کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی اس سوال پر کہ طویل مغلیہ دورِ حکومت کو کس طرح پیش کیا جائے؟ آیا ہندوستان کی وحدت یا اس کی کمزوری اور غلام بنائے جانے کی یاد دہانی کے طور پر! 1857ء کی بغاوت سکول کے اس مؤرخ کو ایک ترغیبی موقع فراہم کرتی ہے جو سیکولرازم کو قوم پرستانہ تاریخ کے ایک تنظیمی تصور کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہ بغاوت سکول مؤرخ کو یہ امر قبول کرنے پر بھی مجبور کرتی ہے کہ مذہبی عقائد اور رواجات نے بھی لوگوں کو اجتماعی قدم اٹھانے پر راغب کیا۔ چندر کی کتاب اس دو عملی سے اختلاف کرتی ہے جب وہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ردِ عمل کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ خصوصیت سے اس طبقے کی بغاوت سے کراہت کو حق بجانب قرار دیتے ہیں کیونکہ وہ باغیوں کو ترقی پسند معاشرتی طریقوں کا مخالف سمجھتے تھے۔ البتہ ہندوستانیوں کی اس تعلیم یافتہ جماعت کو ''غلط فہمی کا شکار'' بیان کیا گیا ہے کیونکہ ان کا یقین تھا کہ برطانوی راج ہندوستان کو جدید بنا سکتا ہے۔ مقابلتاً باغیوں کو زیادہ ''دوراندیش'' کہا جاتا ہے کیونکہ ان کی جبلّی سمجھداری نے انہیں یہ بات سمجھا دی تھی کہ غیر ملکی حکمران بڑے لوگ ہیں، یہیں پر چندر مزید اضافہ کرتے ہیں ''یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تعلیم یافتہ ہندوستانی قوم مخالف یا پھر غیر ملکی

حکومت کے وفادار تھے" اور کیا 1858ء کے بعد کے واقعات یہ نہیں بتاتے کہ اس طبقے نے مضبوط انگریز مخالف تحریک کی قیادت کی۔

جیسا کہ ہم دیکھ سکتے ہیں چندر کی کتاب ایک "اندرونی خود کلامی" کے کردار کو تسلیم کرتی ہے۔ وہ مانتے ہیں کہ بغاوت کی حمایت یا مخالفت دونوں ہی کی منصفانہ طریقے سے درجہ بندی نہیں کی جا سکتی البتہ وہ اس بات کا یقین دلانا چاہتے ہیں کہ بغاوت ہندوستان کی قومی آزادی کی داستان کا ابتدائیہ ہے۔ بغاوت کے مزاحمتی پہلوؤں کو پرعزم طور پر ملائم کر کے وقوع پذیر ہونے دیا گیا ہے۔ "باغیوں" اور "تعلیم یافتہ ہندوستانیوں" کی درجہ بندیوں کا استعمال اس ملائمت کے طریقہ کار کا ایک انداز ہے۔ یہ بات اس لئے بھی نہیں بنتی کیونکہ باغی لیڈروں کے سماجی پس منظر کے متعلق تضادات کے بارے میں معلومات نہیں ملتیں جس نے انہیں "جبلّی سمجھ داری" اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ اگر نوجوان قاری کو یہ تصور کرنے دیا جاتا کہ فرسودہ جاگیردارانہ طبقات، ناپختہ تعلیم یافتہ مڈل کلاس کے مقابلے میں زیادہ بہتر "جبلّی سمجھ داری" کے حامل تھے تو ایسا تصور بپن چندر کی درسی کتاب کے نظریاتی اساسی ڈھانچے میں انقلابی تبدیلی لا سکتا تھا۔ کتاب اپنے آپ کو اس وقت گرہوں میں باندھ لیتی ہے جب وہ 1857ء کے اداکاروں کی عظیم رنگارنگی کو "ترقی پسند" اور "فرسودہ" محرکات میں تقسیم کرتی ہے اور اس میں حصہ نہ لینے والوں کو الگ کر دیتی ہے۔ آخر کار بیان اور دلائل کے ایک دقیق راستے سے گذر کر 1857ء کے غدر کے بارے میں یہ فتویٰ دیتی ہے۔ "یہ اگرچہ ہندوستان کو پرانے طرز اور روایتی لیڈرشپ کے ذریعے بچانے کی ایک ناکام کوشش تھی پھر بھی یہ برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کی، ہندوستانیوں کی پہلی عظیم جدوجہد تھی۔"

دیگر ہندوستانی درسی کتب اس طرز کے پُر پیچ تجزیئے سے پرہیز کرتی ہیں۔ ان میں سے کچھ میں "ساورکر" کا حوالہ ملتا ہے کہ یہ آزادی کی پہلی جنگ تھی۔ بعض "نہرو" کو اسی طرز کے تاثر کے لئے استعمال کرتی ہیں اگرچہ "نہرو" نے اسے لازمی طور پر اسے "جاگیردارانہ بیداری" سے تعبیر کیا ہے جس میں "کچھ قوم پرست عناصر" بھی شامل تھے۔ (2) بچوں کو اس حقیقت کا جائزہ لینے کی اجازت نہیں دی جاتی کہ 1857ء کے واقعات مختلف تناظر میں مختلف نظر آتے ہیں۔ کوئی ہندوستانی درسی کتاب اس علمی چیلنج کو استعمال نہیں کرتی جو 1857ء کے واقعات کو ماضی کے ایک

لمحے کی طرح اس طرح دریافت کرے جیسا کہ ایک مؤرخ کو کرنا چاہئے۔

1857ء کی بغاوت کی تحقیق کرنے کے طریقے میں ایک طریقہ یہ بھی شامل ہوسکتا ہے کہ ٹیکنالوجی کی ترقی بالخصوص ذرائع مواصلات کی ترقی کے اثرات کا بھی جائزہ لیا جائے۔ متبادل کے طور پر یہ چیز بچوں کو اس بات پر راغب کرے گی کہ وہ نوآبادیاتی پھیلاؤ کے جغرافیے کا مطالعہ کریں۔ ادب میں 1857ء کی نمائندگی جستجو کا ایک اور نیا باب کھول سکتی ہے۔ سب سے بڑھ کر 1857ء کی تصویر کا ایک مخفی پہلو بچوں کو کثیر الجہت مطالعے کی طرف راغب اور اب تک ہونے والی تاریخی پرکھ میں موجود ابہام کی پہچان کرا سکتا ہے۔ سکولوں کی تاریخ ان تمام حقِ انتخاب کے دروازے بند کردیتی ہے جب وہ تحریک کی ایسی روکھی پھیکی سی کہانی سناتی ہے جو قوم پرستی کی تاریخی تمثیل میں ملفوف ہے۔ بغاوت کا ڈرامائی آغاز اور پھیلاؤ، تشدد، المیہ اور اس کی تنظیم کی پراسراریت جو اس واقعے کی خصوصیات ہیں، اُس وقت غائب ہوجاتے ہیں جب بچے نوآبادیاتی حکومت کے خلاف ہندوستانی جدوجہد کا مطالعہ شروع کرتے ہیں اور اس طناب کا ذمے دار وہ اسلوب ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ شاید کوئی سکول مؤرخ تاپتی رائے کے بیان کو قبول نہ کرے گا جو انہوں نے اپنے 1857ء کے بندھیل کھنڈ کے مطالعے میں کیا ہے وہ کہتی ہیں ''1857ء کی بغاوت۔۔۔ پس خرامی تھی یا پیش قدمی۔۔۔ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' (3) ایسا نقطہءنظر جو 1857ء کو ایک تاریخ کے طور پر جانچنے کا موقع فراہم کرتا ہے محض ایک ''سبق'' سے زیادہ اہم ہوگا جو بچوں کی تعلیم میں آج جاری وساری ہے۔

پاکستانی درسی کتب کے سلسلے میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں سکول کے مؤرخین کو ایک مختلف قسم کے چیلنج کا سامنا ہے اگر سطحی طور پر مسئلے کی نوعیت ایک جیسی نظر آتی ہے۔ کئی مصنف ''آزادی کی جنگ'' کو تحریک وتشکیل پاکستان کی داستان میں ایک رسمی مقام دیتے ہیں۔ جس باب میں بغاوت کا تذکرہ ہے اس کے بھی ہندوستانی نصاب کی طرح چار حصے ہیں اور فرق صرف شاندار اندازِ بیان کا ہے۔ دونوں ملکوں کے نصاب میں اس واقعے کے سلسلے میں بڑا فرق مسلمانوں کے کردار کا ہے جس پر خوب زور دیا گیا ہے۔ یہاں بغاوت کو مسلمانوں کی انتہائی جرات مندی کی کوشش بیان کیا گیا ہے تاکہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے اور مغلیہ حکومت کو بحال کردیا جائے۔ نیز اس بات پر بھی زور ہے کہ انگریز مسلمانوں کو اپنے لئے ایک خطرہ تصور کرتے تھے۔ مسلمان

حکمرانوں اور دیگر کی قربانیوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انگریز مسلمانوں اور اسلام کی جانب متعصّبانہ رویّہ رکھتے تھے۔ چنانچہ 1857ء کی بغاوت، پاکستان کی تشکیل کے مطالعے میں طویل مغل اقتدار سے جوڑی جاتی ہے۔ درسی کتابیں بغاوت کا جو ایک مختصر احوال بیان کرتی ہیں اس کا ارتکاز یہ ہے کہ نوجوان طلبہ کی توجہ اس بات پر مبذول کرائی جائے کہ ہندوستان میں پہلے سے ہی ایک متحد مسلم طبقہ موجود تھا جو اپنے وقار اور حقوق کے لئے آمادۂ پیکار نظر آتا تھا۔

1857ء کے غدر کی عمومی تصویر پاکستانی درسی کتب میں جونیئر درجے کی کتابوں میں ہائی سکولوں اور ثانوی درجے کی سطح کے مقابلے میں زیادہ واضح ہے۔ مثال کے طور پر سندھ میں انگریزی میڈیم میں پڑھائی جانے والی آٹھویں جماعت کی کتاب جو ارشد صاحب کی تصنیف ہے۔ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اعلان کرتی ہے کہ یہ بغاوت مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کو نکالنے کی ''آخری کوشش'' تھی جب باقی دیگر ذرائع ناکام ہو چکے تھے۔ باب کے آخر میں بحث کو سمیٹتے ہوئے اسی کتاب میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ جنگِ آزادی ایک باقاعدہ منظم شدہ سیاسی تحریک تھی۔ سینئر درجے کی کتابوں میں یہ دعوے البتہ موجود نہیں اور کچھ ایک بغاوت کے پھوٹ پڑنے اور بدنظمی وغیرہ کا تذکرہ کرتی ہیں۔ ''ہیروؤں'' کی فہرست بھی جونیئر درجے سے سینئر درجے تک تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر منگل پانڈے اور جھانسی کی رانی کا ذکر بعض جونیئر درجنوں کی کتب میں تو موجود ہے لیکن سینئر درجے کی نصابی کتب میں شامل نہیں ہے۔ انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کے لئے ربانی اور سیّد کی تحریر کردہ مقبول کتاب میں مرقوم ہے ''بغاوت میں ہندو اور دیگر قوموں نے بھی حصہ لیا لیکن اس میں صرف بہادر شاہ ظفر کا تذکرہ ہے جسے حریت پسندوں کا سپریم کمانڈر کہا گیا ہے۔'' اسی طرح ایم ڈی ظفر کی درسی کتاب میں بھی 1857ء کے ہیروؤں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے اگرچہ بغاوت کے نہایت مختصر موضوع کا عنوان ''جنگِ آزادی'' ہی رکھا گیا ہے۔

دوہری مشکلات

بظاہر پاکستانی سکولوں کے سینئر درجے کے مصنفین اُن دوہری مشکلوں سے آگاہ ہیں جو 1857ء جیسے بڑے واقعے نے برِصغیر کی تاریخ میں پیش کئے ہیں۔ ایک کی بنیادیں اس دوہرے

کردار کی حقیقت میں مضمر ہیں جو پاکستان میں آزادی کی ہر داستان میں لازماً شامل ہے۔ نوآبادیاتی دور کا خاتمہ کیونکر ہوا اس سے ہٹ کر اس داستان کو یہ بھی وضاحت کرنا چاہئے کہ پاکستان کیسے وجود میں آیا؟ اِس دوسرے امر نے کئی سکول مؤرخوں اور دیگر پاکستانیوں کو اس بات کی راہ دکھائی کہ وہ تحریک پاکستان کا ایک طویل اور شاندار پس منظر اکٹھا کریں جس نے آخری ڈیڑھ دہائی میں تحریکِ آزادی کی حتمی شکل اختیار کی۔ 1857ء کی بغاوت، ایسے منصوبے میں خرابی پیدا کرتی ہے۔ 1857ء کے واقعے کی کوئی واضح تصویر ایک ایسا لازمہ پیدا کر دے گی جس سے یہ بات تسلیم کرنا ہوگی کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی ایک مضبوط طاقت کی صورت میں اکٹھے لڑنے کے اہل تھے۔ پاکستان میں 1977ء کے بعد کے نصابی پالیسی نے ایسی مسلمہ شے پر سخت قدغن عائد کر دی ہے۔ یہ پالیسیاں ایک محصور اور نا کہ بند ریاست کے سیاق وسباق میں ارتقا پذیر ہوئی ہیں جہاں مذہب کی تدریس اور تاریخ نویسی جیسی دو علمی صورتوں پر کنٹرول حاصل کیا گیا ہو۔ پاکستان کی تاریخ پر ریاستی اختیار سکول کی درسی کتب کے مصنفین کو اس بات سے منع کرتا ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کی مثالوں سے کوئی اہمیت کی بات ثابت کریں۔

جونیئر درجے کی درسی کتب کے مصنفین نے اختصار نویسی اور جامعیت کے ذریعے اس مسئلے کا حل نکالا ہے۔ آٹھویں جماعت کے طلبہ کے لئے معاشرتی علوم کی کتاب کے مصنفین شمیم احمد نے تحریکِ پاکستان کی ساری داستان کو پندرہ صفحات میں مکمل کر دیا ہے اور یہ داستان 1857ء کی بے چینی کے ایک جامع ذکر سے یوں شروع ہوتی ہے:

''انگریزوں نے مسلمانوں کی طرف سے اپنے خلاف شروع کی گئی جنگِ آزادی کو فراموش نہیں کیا تھا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کو صدیوں تک ان پر حکمران رہنے کی وجہ سے کبھی معاف نہیں کیا تھا چنانچہ ان دونوں طبقوں نے مسلمانوں کو غریب، بے کس اور غیر مؤثر اقلیت بنانے کی سازش کی۔''

یہ شاندار ''شطرنجی'' مصنفین کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ایک ایسی کہانی کا مضبوط فریم تیار کریں جو کہ چودہ سالہ بچوں کو یہ سکھا سکے کہ کس طرح مسلمان پستی کی گہرائیوں سے اٹھے، اپنے آپ کو منظم کیا اور بالآخر اپنے لئے ایک علیحدہ وطن حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ایک بہت دبائی ہوئی کہانی اپنے سامعین کو تفصیلات میں نہیں جانے دیتی کہ اس کا مقصد صرف متاثر کرنا ہوتا

ہے نہ کہ وضاحت کے چاہے جانے کا۔ داستان گو کو ایسا کرنے کے لئے صرف چنیدہ موضوعات کی فہرست کی ضرورت پڑتی ہے۔ 1857ء کے واقعے کی تفصیلات پاکستان کی تشکیل کے ''کیپسول'' نما اندازِ بیان کے لئے غیر ضروری ہیں۔ مطلوبہ مقاصد اور سرکاری اختیار جس سے یہ مقصد حاصل ہو، دونوں صورتوں میں درسی کتاب کے پاس اس کا اور کوئی حل نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ درس غلط ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے جو کردار ادا کرنے کے لئے دیا گیا ہے وہ ضائع ہو گیا ہے۔

چھوٹے درجے کے بچوں کے لئے لکھنے والے مصنفین نے جس طرح اختصار کا طریقہ استعمال کر کے مزاحمتی حقائق سے دامن بچالیا ہے اس طرح یہ سہولت سینئر درجے کے درسی مصنفین کو حاصل نہیں ہے۔ پاکستانی سکولوں کے مؤرخین جنہوں نے ہائی سکول، انٹرمیڈیٹ اور اولیول کے طلبہ کے لئے جدوجہدِ آزادی پر کتابیں لکھی ہیں، اس بات سے بظاہر آگاہ ہیں کہ 1857ء کے واقعے نے تاریخی واقعے کے طور پر کونسی دوہری مشکلوں کو جنم دیا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ بغاوت کے شرکاء کی مذہبی زُمروں میں پہچان اور فرق کی غرض سے کی گئی تقسیم واضح اور عیاں ہے۔ اگر چہ مذہبی عقائد اور عبادات بغاوت کے لئے ترغیبی ذرائع تھے لیکن جہاں تک ہم جانتے ہیں باغیوں کی مخصوص مذہبی شناخت کی اتنی اہمیت نہیں تھی جس سے ان کے رویوں کا تعین کیا جا سکے۔ پاکستانی چنانچہ درسی کتاب کا ایک مصنف ایسے کسی واقعے کو پیش کرتے ہوئے دیئے گئے نظریاتی سانچے کے اندر مشکل میں پڑ جاتا ہے خاص طور پر ''مطالعہ پاکستان'' جیسے مضمون کے سلسلے میں یہ بات زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ جو ہندو 1857ء کی جنگوں میں لڑے ان کا تذکرہ ہی اصل چیلنج ہے کیونکہ اس سے یہ بات پتہ چلتی ہے کہ ایک ایسا دور بھی آیا تھا جب ہندو اور مسلمان دونوں بیک وقت ایک دوسرے کے شانہ بشانہ جنگ میں مصروف تھے۔ چنانچہ ''مطالعہ پاکستان'' کا مقصد مسلم علیحدگی کی تاریخ نویسی کرنا ہے جس کے اندر ایسے ماضی کی نمائندگی کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

تذبذب کا دوسرا ذریعہ داستان کے ڈھانچے کے اندر ہی مضمر ہے۔ اس کی ضرورت یوں ہے کہ مسلم سیاست میں 1857ء کے بعد ہونے والے واقعات کے لئے طالب علم کو تیار کیا جائے۔ پاکستانی کی سکول کی درسی کتب پر اپنے سخت تنقیدی جائزے میں کے۔ کے۔ عزیز نے اس تذبذب اور دوہری مشکل کو صاف صاف بیان کر دیا ہے:

''یہ درسی کتب کے مصنفین کے لئے ایک ذومعنی چیستان ہے'' اگر قابلِ نفرت انگریزوں

کے خلاف، مسلمانوں کی طرف سے چلائی جانے والی یہ تحریک ''جنگِ آزادی'' تھی تو پھر سرسید احمد خاں کو پاکستان کے ایک ''عظیم ہیرو'' اور ''سب سے بڑے مفکر'' کا درجہ کیسے دیا جا سکتا ہے جنہوں نے نہ صرف انگریزوں کا ساتھ دیا بلکہ مقامی مزاحمت کی مذمت بھی کی۔(4) اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ سکول کی درسی کتب کے مصنفین اندرونی طور پر کس قدر مربوط ہیں، عزیز کے دلائل، سینئر درجے کی پاکستانی درسی کتب کے مصنفین کے بغاوت کے بارے میں شاندار تحریروں کی وضاحت ضرور کرتے ہیں۔ اس ضمن میں اولیول کے لئے تحریر کردہ جے حسین اور ایف باجوہ کی کتب کو استثناء قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں کتابیں پاکستان میں تاریخ کی تدریس کے سلسلے میں استعمال ہونے والی دیگر کتب کے مقابلے میں زیادہ مستند ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی کتاب 1857ء کی بغاوت کو آزادی حاصل کرنے کی ایک کوشش قرار نہیں دیتی اگرچہ باجوہ نے بھی عنوان ''جنگِ آزادی'' رکھا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی لیڈرشپ کے بارے میں باجوہ واضح کرتے ہیں کہ ظفر کو ہونے والے واقعات کا نہ تو کوئی علم ہی تھا اور نہ ہی اس میں اس جنگ کو شروع یا ختم کرنے کی طاقت ہی موجود تھی۔ حسین نے ''عظیم بغاوت'' کا عنوان استعمال کیا ہے اور وہ بڑی مہارت سے بغاوت کی علاقائی داستانوں کا تعلق ان عام معاملات سے قائم کرتی ہیں جن کی بنا پر ایسا ہوا۔

پاکستانی سکولوں کے مؤرخین اپنے ہندوستانی ہم عصروں کے ساتھ 1857ء کی بغاوت کی ان دوہری مشکلات میں شریک نہیں ہوتے جو کہ سماجی جدیدیت کی کہانی میں موجود ہیں۔ اس کی بڑی وجہ صرف یہ ہے کہ پاکستانی درسی مصنفین اپنے قارئین کو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ سماجی بیداری اور جدید تعلیم کا آغاز 1857ء کے بعد اور خاص طور پر سرسید احمد خاں کی شخصیت اور ان کی کوششوں سے ہوا۔ ہندوستانی درسی مصنفین کے نزدیک 1857ء کی بغاوت سے پہلے جدید تعلیم کے بانی اور سماجی مصلح مثلاً راجہ رام موہن رائے موجود تھے۔ 1955ء میں پاکستان میں شائع ہونے والی ایک پرانی سرکاری کتاب ''تاریخ پاک و ہند'' جسے ہسٹاریکل سوسائٹی پاکستان نے شائع کیا تھا، بیان کرتی ہے کہ رام موہن رائے بہت روشن خیال ہندو تھے جنہوں نے سماجی اصلاحات کے لئے بینٹینک کی کوششوں کی حمایت کی۔ بعد کی پاکستانی درسی کتب میں سماجی اصلاحات اور تعلیم کے پھیلنے کے تذکرے کو 1857ء کے بعد کے عرصے میں غائب کر دیا گیا۔ بغاوت کو مسلمانوں کی ایک ایسی آخری کوشش قرار دیا گیا جو انہوں نے اقتدار دوبارہ حاصل کرنے

کے لئے کی۔ پاک وہند کی تاریخ میں یہ صراحت جو پاکستان کے پہلے دس سالوں میں شروع ہوئی تھی، آج تک جاری ہے مذکورہ بالا ''تاریخ پاک وہند'' کے مصنفین لکھتے ہیں:

''جنگِ آزادی جسے اکثر اوقات غدر کا نام دیا جاتا ہے، غیر ملکیوں کے قبضے سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لئے ایک صدی کی جدوجہد کا نقطۂ عروج تھا۔'' (5)

1857ء کے پاکستانی اور ہندوستانی نقطۂ نظر کے تقابل کی بحث کو سمیٹتے ہوئے ایک بنیادی مماثلت کا ذکر کریں گے اور وہ بغاوت کے بیان میں، داستانِ آزادی کی رسمی ابتدا ہے۔ ''آغاز'' کو شاندار بنانے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ واقع بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر اس کے ناکام کے نکتے کو لیا جائے گا تو یہ اہمیت ختم ہو جائے گی۔ بغاوت کے اسباب کے سلسلے میں کوئی تحقیق ہمیں ایسی دنیا میں لے جائے گی جہاں بدنظمی کا دور دورہ تھا۔ پرسی وال سپئیر، جدید ہندوستان میں 1857ء کی اہمیت کے بارے میں بیان کرتے ہیں ''یہ ایک آخری اجتماعی احتجاجی تحریک تھی جو روایتی ہندوستان کی جانب سے مغرب کی آمد کے خلاف چلائی گئی تھی۔ (6) اس کے مستقبل کے واقعات پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یعنی انگریزوں کے رویّوں اور طریقوں اور ہندوستانیوں کے انگریزی راج کو قبول کرنے کے رویّوں پر اس نے دیرپا اثرات چھوڑے۔ اگرچہ بغاوت کو ایک عظیم یاد اور مآثر کے طور پر مابعد جدوجہدِ آزادی میں کردار ادا کرنا تھا تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ اس جدوجہد سے اسے منسلک کرنے کی کوئی منطق تھی یا نہیں؟ پھر بھی داستانِ آزادی کے افتتاحی منظر کے طور پر بغاوت، اس داستان کی نوعیت پر ایک وضاحتی مہر ثبت کرتی ہے۔ اس ''مہر'' کا ایک اپنا ڈرامائی، برجستہ وقوعی اور مختلف لڑائیوں کا ایک دُوبدو امتزاجی کردار ہے جیسا کہ ہم آئندہ اس کتاب میں دیکھیں گے کہ 1857ء کی یہ ''مہر'' بھارت اور زیادہ تر پاکستانی داستان ہائے آزادی میں آخر تک ثبت چلی جاتی ہے۔ یہ ''مہر'' دونوں ممالک کے چند درسی مصنفین کو یہ سہولت دیتی ہے کہ وہ تاریخ کے وسیع تر سماجی وثقافتی پہلوؤں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے مٹھی بھر ہیروؤں اور واقعات کے ایک لگے بندھے سلسلے پر انحصار کرتے ہیں۔

اس افتتاحی منظر میں کچھ اور نقوش بھی ابھرتے ہیں۔ وقت کے بہاؤ کو ڈرامائی واقعات کے ایک سلسلے سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ جوں جوں جدوجہدِ آزادی کی کہانی آگے بڑھتی ہے یہ نوجوان قاری کی حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ وہ ڈرامائی واقعات کی از خود پیش بینی کرے۔ جن واقعات میں

ڈرامہ نہیں ہوتا وہ یا تو اہمیت کھو دیتے ہیں یا پھر وقت کی لپیٹ میں آ کر غائب ہو جاتے ہیں۔
جدوجہدِ آزادی کے آخری دس سالوں میں پاکستانی داستان 1857ء کی ''مہر'' سے نجات حاصل کر لیتی ہے جبکہ ہندوستانی داستان اس ابتدائی جنگ کے سائے میں چلتی جاتی ہے۔ دونوں کی داستانوں میں ایک اور نقش یہ ہے کہ ذاتی تجربے کو ماضی کی بابت ایک علمی ذریعہ ماننے سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ 1857ء کا سال ہمیں انفرادی شخصیات کا ایک شاندار سلسلہ پیش کرتا ہے جو ہم عصر سماجی فضا میں بہتر تفہیم کے مطالعے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ درسی کتابیں اپنے نوجوان قارئین کو ان میں سے بعض شخصیات کی بھری شبیہہ پیش کرتی ہیں لیکن ان میں کوئی دلچسپ سوانحی تفصیلات نہیں ہوتیں جو ان کے ربط قائم کرنے میں بچوں کی مدد کر سکیں۔ ان شبیہوں کی مثال مندر میں رکھی گئی دیویوں کی سی ہوتی ہے۔ معتدل شاہدین اور نقاد کو اس مندر میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔
ان شخصیات میں سے ایک غالبؔ ہے جس کی شخصیت اور تجربہ بچوں کو 1857ء کا ایک لاجواب جائزہ فراہم کر سکتا ہے۔ ماسوائے ایس ایف محمود کے ہندوستان اور پاکستان میں کوئی بھی سکول مئورخ، غالب کو ایسا بیان نہیں کر سکتا۔ بغاوت کا ناقد ہونے اور انگریزوں کی سرپرستی حاصل کرنے کے لئے کوشاں غالبؔ کا اگرچہ 1857ء کی بغاوت اور جدوجہدِ آزادی میں کوئی مقام نہیں حالانکہ وہ اپنے عہد کی ایک عظیم ترین ہستی اور بین الاقوامی شہرت کا حامل شاعر تھا۔(7)
اگرچہ 1857ء کا باب ہر درسی کتاب میں ان تبدیلیوں پر ختم ہوتا ہے جو بغاوت کے بعد ہندوستانیوں کے لئے انگریزوں کی حکمتِ عملی اور رویوں میں آئیں یا پھر چند جملے ہندوستانیوں کے لئے جو اس بغاوت سے متاثر ہوئے، یہ بحث کبھی بھی جدید تاریخ کے ساتھ نہیں جوڑی جاتی۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا تو ہم یہ ایک نوجوان قاری کے تناظر سے دیکھیں تو اس کی وجوہات خود بغاوت کے اپنے اندر موجود ہیں پھر اس کو ایک ''ہیرو پرستی'' کے طور پر ناگزیر بنا دیا جاتا ہے۔ اگرچہ کوئی قاری بھی دیکھ سکتا ہے کہ باغیوں کے پاس ماسوائے تشدد کے، اپنے آپ کو منوانے کا کوئی اور ذریعہ موجود نہ تھا اور انگریزوں نے بغاوت کو کچلنے کے لئے بلا پس و پیش بربریت کا مظاہرہ بھی کیا اور یہ بربریت، باغیوں کے تشدد کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھا۔ بغاوت کے بعد دہلی لال قلعے کے نواح میں طبعی طور پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے جو وحشیانہ طریقے اختیار کئے گئے اور حیران کن تعداد میں لوگوں کو پھانسیاں دی گئی تھیں، ان کا پاکستان اور ہندوستان کی درسی کتب میں عکس

بھی نظر نہیں آ تا۔(8) چند سال قبل ہندوستان کے نیشنل بک ٹرسٹ نے خواجہ حسن نظامی کی وہ شاندار کتاب بڑے سہل انداز میں شائع کی ہے جس میں انہوں نے دہلی کے شاہی خاندانوں اور شہزادیوں کی حالتِ زار کا تذکرہ کیا ہے۔(9) ایک ایسے دور کی تاریخی داستان جو ایک طویل عرصے تک ہماری سیاسی جدوجہد کا محور رہی ہے، اس میں حسن نظامی کی یہ کہانیاں آج کے عہد کے بچوں کو 1857ء کی بغاوت کو انسانی نقطہء نظر سے دیکھنے میں مدد دیں گی۔ یہی کام انگریزی نقطہء نظر سے لکھی ہوئی کپلنگ کی کتاب The Under Taker کر سکتی ہے۔(10) ایسے مواد کا تعارف جدوجہدِ آزادی کے ایک باب میں زیادہ ضروری داخلی نقطہ فراہم کر سکتا ہے جس کی مابعد ہونے والے واقعات کم مشابہت ہو۔

References

1. R. C. Majumdar, *The Sepoy Mutiny and the Revolt of 1857* (Calcutta: Mukhopadhyay, 1957). For excerpts from other works on 1857 and critical commentaries, see Ainslie T. Embree (ed.), *India in 1857* (Delhi: Chanakya, 1987).
2. Jawaharlal Nehru, *The Discovery of India* (first published, 1946; Delhi: Jawaharlal Nehru Fund, 1981), p.327.
3. Tapti Roy, *The Politics of a Popular Uprising* (Delhi: OUP, 1994), p. 258.
4. K. K. Aziz, *The Murder of History* (Delhi: Renaissance, 1998), p. 126.
5. *A Short History of Hind-Pakistan* (Karachi: Pakistan History Society, 1955).

6. Percival Spear, *A History of India,* Vol. 2 (London: Penguin, 1965), p. 152.

7. For Ghalib's life and response to 1857, see Pavan K. Varma, *Ghalib* (Delhi, Penguin, 1989).

8. Narayani Gupta, *Delhi Between Two Empires* (Delhi: OUP, 1981).

9. Khwaja Husain Nizami, *The Stories of 1857* (New Delhi: National Book Trust, 1997). For an unabridged Hindi translation, see Begamat Ke Aansu, (Delhi: Swarnajayanti, 1998).

10. Rudyard Kipling, *Second Jungle Book* (1895; London: Macmillan, 1965).

سنگھ پریوار اور مطالعہ تاریخ

تانیکا سرکار/ترجمہ: ڈاکٹر اقبال کاردار

راشٹریا سیویک سَنگھ ایک ایسی تنظیم ہے جو کلیدی عملے کے بنیادی اصول پر قائم ہے، اور جس کا اہم ترین سیاسی مقصد بھارت کی دوسری ریاستوں پر سیاسی اور سماجی برتری حاصل کرنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تنظیم اپنے تمام تر سیاسی اور سماجی نظریات کے ساتھ اقتدارِ کلی کی ہوس میں مبتلا ہے۔ یہ تنظیم اپنے کلیدی عملے میں ایسے افراد کو جگہ دیتی ہے جو سیاسی طور پر تعلیم یافتہ ہوں اور تنظیم کے نصب العین کے بنیادی نظریات کو عوام تک پہنچا سکیں۔ خصوصاً منتخب انتخابی حلقوں، طلباء، عورتوں، قبیلوں، کچی آبادیوں، ٹریڈ یونین اور مذہبی تنظیموں کو اپنا ہم خیال بنائیں۔ کلیدی عملے میں شامل افراد کو مختلف محاذوں کے لئے مخصوص اور منتخب تقریریں ذہن نشین کرائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں تقریروں میں مختلف لب و لہجے اور تلفظ پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ اس کلیدی عملے کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ اپنا اثر و رسوخ عوام تک بڑھائیں اور اساتذہ سے قریبی تعلقات قائم کریں اور انہیں سَنگھ کے نصب العین سے آگاہ کریں اور انہیں اس پر عمل درآمد کی ترغیب دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کلاس رومز میں جا کر طلباء سے خود ہم کلام ہوں اور انہیں سَنگھ کے بنیادی مقاصد سے آگاہ کریں۔ عملِ تدریس سَنگھ کے نزدیک بُنیادی اور ناگزیر عمل ہے۔ اسے سَنگھ کے ایجنڈے میں اوّلیت حاصل ہے، اور حالات اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ انسانی وسائل کی وزارت سَنگھ کے نظریات کی پشت پناہی کر رہی ہے۔

کلیدی عملے میں مکمل طور پر تربیت یافتہ افراد میں اکثریت براہمنوں کی ہے۔ زیادہ تر تقریبات اور سیاسی اجتماعات میں بھی اکثریت انہی کی ہوتی ہے، یہی بات ذات پات کے روایتی

امتیاز کی آئینہ دار ہے۔کلیدی عملے میں صرف انہی تعلیم یافتہ افراد کو جگہ دی جاتی ہے جن کا تعلق درمیانی طبقے سے ہوتا ہے۔سنگھ کے اس اصول پر انتہائی سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔اس درمیانے طبقے میں براہمنوں کے ساتھ ساتھ اونچی ذات کے افراد کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔سنگھ کے مراکز اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔عوامی محاذوں میں ذات پات کی تفریق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔تعلیم و تربیت کے مراکز کچھ اس طرح قائم کئے گئے ہیں کہ ان میں ذات پات کی تفریق کو اس طرح انداز سے چھپایا گیا ہے کہ بظاہر مساوات کا گمان ہو۔لیکن بغور جائزہ لینے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ تعلیم و تربیت کے اِن مراکز میں ہندو مت کا ذات پات کا روایتی نظام ابھی تک قائم و دائم ہے اور سنگھ اس کی پردہ پوشی میں کما حقہ طور پر کامیاب نہیں ہو سکا۔ان تربیتی مراکز کا بنظرِ غائر جائزہ لینے سے یہ بھیانک حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ راشٹریا سیوگ سنگھ ان مراکز کے ذریعے پورے بھارت پر حاکمیت کی راہ ہموار کر رہا ہے۔قیادت کے پرانے انداز کو سنگھ کے کلیدی عملے کے پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ افراد نئے ڈھانچے میں ڈھال رہے ہیں، اور حصولِ اقتدار کے لئے وہ اپنی نسبی حیثیت کی بجائے مقتدر سربراہوں کی آشیرباد کو ترجیح دے رہے ہیں۔

اگر تدریسی عمل واقعی ناگزیر اور بیحد اہم ہے تو اس میں مطالعہء تاریخ (تاریخ کی تعلیم) کو سب مضامین سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔سنگھ کے قریب قریب سبھی سیاست دان اپنی تقاریر، خطابات اور مجالسِ عامہ میں ماضی کے تاریخی واقعات و حالات کو دہراتے ہیں، جس سے اُن کا مقصد اپنے نظریات کی صداقت اور استدناد ہوتا ہے۔علاوہ ازیں ان تاریخی واقعات کا اعادہ اس لئے بھی کرتے ہیں کہ سننے والوں کے دلوں میں متوقع ردِ عمل کے جذبے کو برانگیختہ کر سکیں۔وہ چاہتے ہیں کہ ماضی کے حالات و واقعات کو نہ صرف منظر عام پر لایا جا سکے، بلکہ ان سے متوقع مقاصد حاصل کئے جا سکیں۔ماضی میں جو کچھ ہوتا رہا ہے اُس میں سے اپنے مطلب کے نقوش کو نئے رنگ میں اُجاگر کریں، اور ماضی میں اُن پر کئے گئے مظالم کا مسلسل انتقام لیا جا سکے۔ان نظریات کو سامنے رکھیں تو صرف ایک ہی مقصد دکھائی دیتا ہے اور وہ مقصد ہے ماضی کے ساتھ ایک اٹوٹ اور متحرک رشتہ۔

ماضی سے اس رشتے کا استحکام اور انعقاد صرف اور صرف اس مقصد کی ترجمانی کرتا ہے کہ

ماضی کے واقعات کو حال کے اوراق پر حسبِ منشاء رقم کیا جا سکے، اور بھارت میں ایک نئی بادشاہت قائم کی جا سکے، جس کے مقاصد میں غربت، ظلم وستم، ناانصافی اور ملک کے ان گنت مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ انتقام کا لامتناہی سلسلہ قائم کیا جا سکے۔

احیائے ماضی کے کیا مقاصد ہیں؟ ان مقاصد کو سنگھ کے موجودہ نظریات کی روشنی میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ حال کو روشن اور قابلِ رشک بنانے کے لئے ماضی کو زندہ کرنا ضروری ہے۔ ماضی جو آج بے مصرف اور مردہ دکھائی دیتا ہے اُسے زندہ وتابندہ ماحول کی شکل میں لایا جا سکے۔ ماضی جسے سنگھ کے سیاسی قائدین اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرسکیں۔ ماضی جسے جدید تحقیقات، علمی نظریات اور نظم وضبط کے ساتھ حال کے پیکر میں لایا جا سکے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ تعلیم وتحقیق کے تمام ادارے اور ان میں پڑھائے جانے والا نصابی مواد سنگھ کے مخصوص اساتذہ، محققین اور مؤرخین کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے مخصوص پرچارک (مبلغین) بھی اس تعلیمی نظام کی تشہیر میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

مندرجہ بالا صورتِ حال کے پیشِ نظر یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ مطالعہء تاریخ (تدریسِ تاریخ) ایک اکھاڑے کی شکل اختیار کر چکا ہے اور ہمارے لئے یہ ایک لمحہء فکر ہی نہیں لمحہء اضطراب بھی ہے۔ میرے اضطراب کی وجہء دلیل محض یہ نہیں کہ ہندو راشٹر کے علمی ماہرین نے ماضی کے علوم کو دورِ حاضر کے سیاسی نظریات یا سیاسی علوم سے ہم آہنگ نہیں کیا، بلکہ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے نامور سیاسی اور مذہبی ادارے ماضی اور حال کے ملاپ کی راہ میں رکاوٹ بنے رہے۔ سنگھ کے لئے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اُس کے نام نہاد مؤرخین، دورِ جدید کے مختلف سیاسی نظریات واختلافات اور حاکمیت کے مختلف قوانین، خواہ ان کا تعلق مارکسزم سے ہو یا مابعد کے ساختیاتی نظریات سے، رجعت پسند مؤرخین سے ہو یا جدید مؤرخین سے،۔۔۔ وہ ان سے کیوں کر استفادہ کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ سنگھ کے نام نہاد مؤرخین اس وقت طبقات، ذات پات، قبیلہ پسندی یا قبائلی فخر وغرور، نوآبادیات، نوآبادیاتی جبر وتشدد اور غیر معقول تہذیبی عمل کا بستہ گول کرنے میں مصروف ہیں۔

سنگھ نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ اس سے قطعی غیر مطمئن اور مضطرب ہے۔ اُس کے پاس اب تک ایک ہی کارروائی ہے جسے وہ اپنی شناخت سمجھتا ہے، اور وہ کارروائی یہ ہے کہ بھارت کے

غیر ہندو طبقے کو کھلے جھوٹ کے ساتھ ہندوؤں پر مسلط طبقے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔اس کی غیر منطقی، غیر حقیقی اور غیر معقول کارروائی پوری دنیا کی نظروں میں سنگھ کی نیک نامی کی بجائے اس کی بدنامی کی وجہ بنی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ سنگھ کی اس کارروائی سے خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔اس کے برعکس غیر ہندو طبقے مثلاً مسلمان اور عیسائی جو اقلیت میں ہیں، وہ اپنے آپ کو سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے قطعی کمزور اور غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔دور اندیشانہ نظر سے دیکھا جائے تو سنگھ کا یہ غیر منطقی اور غیر حقیقی اقدام بھارت کے حال اور مستقبل کے لئے ایک بڑا انتشار، بلکہ خانہ جنگی کا سبب بن سکتی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سنگھ کو مطالعہء تاریخ سے دلچسپی اور وہ اس سے اپنا یہ رشتہ استوار رکھنا چاہتا ہے وہ ماضی کو واپس لانے کا آرزومند ہے لیکن ان مقاصد کے حصول کے لئے اُس نے جو طریقہ اپنایا ہے وہ انتہائی پرتشدّد، نفرت انگیز اور لعنت آفریں ہے۔

ہندو راشٹرا نے محض تعصب کے زیرِ اثر اپنے ذہنوں میں اس قسم کی خیالی داستانیں محفوظ کر لی تھیں کہ مسلم حکمرانوں نے ہندو پر جا پر بے تحاشا ظلم ڈھائے، لاکھوں ہندوؤں کا خون بہایا اور انہیں نیست و نابود کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔تنگ نظر اور متعصب مؤرخین نے ہندو قوم کے ذہنوں میں بے بنیاد واقعات کا زہر بھر دیا تھا۔مثلاً ہندو عورتوں کی بڑے پیمانے پر آبروریزی، مندروں کی مسماری، لوٹ کھسوٹ اور گاؤ کشی ایسے الزامات نے ہندو قوم کے اندر نفرت و انتقام کی آگ کو بھڑکایا۔۔۔لیکن اگر ہم تعصب کا چشمہ اتار کر اور غیر جانبداری سے تاریخ کا مطالعہ کریں تو مذکورہ بالا تمام الزامات غیر مدلّل، غیر منطقی، غیر یقینی اور بے بنیاد ہیں۔غیر جانب دار اور ذمہ دار مؤرخین نے اس قسم کی باتوں کو محض بہتان تراشی پر محمول کیا ہے۔ان واقعات میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں۔اس کے برعکس راشٹریا سیوک سنگھ کا اقلیتوں پر ظلم و ستم، اطالوی فاشزم اور نازیوں کے ہاتھوں ہونے والی خوں ریزی کی تقلید، ایسے کارنامے ہیں جن سے اسے بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔نازی پارٹی کی خوں ریز پالیسی کی ''گولوالکر'' نے دل کھول کر تعریف کی تھی۔حالاں کہ پیشہ ور مبصرین اور ماہرین نے نازی پارٹی کی خوں ریز کارروائی کو محض افسانہ قرار دیا ہے۔لیکن کیا کیا جائے کہ اس قسم کے من گھڑت قصے آنے والی نسلوں کے لئے ایک ورثے کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

گجرات (احمد آباد اور دیگر شہروں) میں جو حالیہ فسادات ہوئے اور مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا گیا، اُن کے گھر بار جلائے گئے، وہ سنگھ کی اُس حکمتِ عملی کے آئینہ دار ہیں جس کے ذریعے وہ ماضی کو بطورِ قانون نافذ کرنے کے خواہش مند ہیں۔ نریندرا مودی کے عمل اور ردِ عمل کے سیاسی فلسفے کی روشنی میں مسلمانوں کے کشت وخون کو قانوناً جائز قرار دیا گیا۔ اس کشت وخون کی وجہ یہ بتائی گئی کہ گودھرا میں ہونے والے فسادات میں پاکستان سے بلوائے گئے مسلمان دہشت گردوں کا ہاتھ تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس فساد میں جن مسلمانوں کا خون بہایا گیا وہ کون تھے؟ کیا وہ پاکستانی تھے؟ ۔۔۔ نہیں! سبھی جانتے ہیں کہ وہ سبھی ہندوستانی مسلمان تھے۔ جو مسلمان گودھرا سے ہجرت کر گئے تھے اُن کا فسادات سے کوئی تعلق نہ تھا، اور جو تھوڑے بہت گودھرا ہی میں رہ گئے، وہ بھی بے گناہ تھے۔ قتل کئے گئے اور زندہ جلائے گئے مسلمانوں میں زیادہ تعداد بچوں اور ننھے بچوں کی تھی۔ بلکہ ان معصوم جانوں میں وہ جنین بھی شامل تھے جو ہنوز رحمِ مادر میں تھے! کیا آپ اس سے بڑی وحشت و بربریت کا تصور کر سکتے ہیں! کیا ان جنین کا تعلق پاکستان سے تھا۔ کیا یہ بھی دہشت گردوں میں شامل تھے؟ ماضی کے مسلمان شعراء اور موسیقاروں کے مزاروں کی نہ صرف بے حرمتی کی گئی بلکہ انہیں منہدم کر دیا گیا۔ کیا ان کا تعلق بھی پاکستانی دہشت گردوں سے تھا۔۔۔؟ کیا گودھرا میں ہونے والے فسادات میں یہ مرحوم روحیں بھی ملوث تھیں؟

ماضی، حال اور مستقبل کے مسلمان ایک دوسرے کے فعل کے ذمہ دار اور قابلِ سزا سمجھے جاتے ہیں۔ کوئی مسلمان خواہ کسی بھی شہر یا جگہ کا ہو، اگر اُس سے کوئی معمولی سا جرم بھی سرزد ہو جائے تو اس کا انتقام کسی بھی دوسرے شہر یا گاؤں کے مسلمان سے لیا جاتا ہے۔ کسی بھی راہ چلتے بے گناہ مسلمان کو جب بھی اور جہاں بھی چاہیں، دبوچ لیا جاتا ہے اور انتقام کی پیاس بجھائی جاتی ہے مسلمان اور اس سے انتقام لینا ایک چلتی پھرتی (موبائل) اصطلاح بن چکی ہے۔

اگر ماضی، حال اور مستقبل اپنے مقامات کو آسانی سے بدل سکتے ہیں تو ماضی کو بھی اپنے تمام تر معنوی اشارات کے ساتھ اپنی شکل بدل سکتا ہے۔ سنگھ نہ صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ مطالعہ تاریخ میں اپنے تجربات اور ذاتی نظریات کو بھی شامل کر دے بلکہ اُس کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ اپنے خود ساختہ معنی کو جامعات کی سطح تک پڑھائی جانے والے تاریخی نصاب میں شامل کر سکے۔ سنگھ اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ پیشہ ور نقاد اور مبصرین اُس کی سیاسی اور سماجی برتری کی

حکمتِ عملی کے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کریں۔ وہ اس موضوع پر گفتگو سے ہمیشہ گریز کرتا ہے۔ لیکن سنگھ شاید اس بات سے واقف نہیں کہ نمی کو مسام دار دیواروں میں سرایت کرنے سے نہیں روکا جا سکتا۔ سنگھ اس غلط فہمی یا خوش فہمی میں مبتلا ہے کہ عوام اُس کی بھارت گیر حاکمیت کے مقصد سے بے خبر ہیں۔ سنگھ کی حکمتِ عملی اب کوئی سربستہ راز نہیں رہی۔ یہ راز دراصل اُس وقت آشکار ہوا جب سکول لیول کے طلباء ماضی کی فرضی داستانوں کو اس طرح دہرانے لگے کہ جن سے تعصب اور ظالمانہ حاکمیت کے مقاصد سامنے آنے لگے۔ پرائمری اور سکول لیول کے ناپختہ ذہنوں نے سنگھ کے سیاسی مقاصد کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

علاوہ بریں سنگھ کے اندر ایک ناگزیر اور نظریاتی اتحاد بھی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ سنگھ نے اپنے مقاصد کی تشہیر کے لئے ''تدریسی عمل'' کو اپنا ہتھیار بنایا ہے۔ وہ تدریس کو ایک ایسا مئوثر اور کثیر الاثر ہتھیار سمجھتا ہے جسے ہر محاذ پر کامیابی کے ساتھ آزمایا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر مذہبی تنظیموں، منتخب سیاسی پارٹیوں اور کم پڑھے لکھے عوام کو بہت جلد زیرِ دام لایا جا سکتا ہے۔ سنگھ نے بی جی پی، وی ایچ پی اور بجرنگ دل کے تمام لیڈروں کو اپنا ہم خیال بنالیا، اور یہ مقصد بھی اس نے تدریسی عمل کے ذریعے حاصل کیا۔ اس کے وہ مراکز جہاں روزانہ تعلیم دی جاتی ہے وہاں طالب علموں کو فنونِ حرب اور نظریاتی اسباق پڑھائے جاتے ہیں۔ وہ اسباق جو کلیدی عملے اور دیگر محاذ کے ممبران کو پڑھائے جاتے ہیں اُن میں صرف ماضی کے ہندو سورماؤں کے کارناموں اور مسلم فاتحین کے نفرت انگیز اور ظالمانہ برتاؤ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

ایک اور اہم بات جسے سنگھ پردۂ راز میں رکھتا ہے وہ ہندو طبقے کی سیاسی بتری ہے۔ یعنی وہ ہندو طبقے کو بھارت کی مثالی طاقت بنانا چاہتا ہے۔ ایسی مثالی طاقت جو اس کے نصب العین کی حامی ہو، جو ماضی کو اس طرح زندہ کردے جیسے اُس نے گجرات میں خوں ریز فسادات کے ذریعے زندہ کردیا تھا۔ لیکن مشکل بات یہ ہے کہ جامعات میں پڑھایا جانے والا موجودہ نصاب سنگھ کے مجوزہ نصاب سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔ اگر کوشش کے باوجود کامیابی نہ ہوئی تو سنگھ کو جبراً تمام تاریخی نصاب تبدیل کرنا پڑے گا اور ہر قسم کے تاریخی مواد کو سنسر کیا جائے گا اور پھر ایک نئی تاریخ لکھی جائے گی۔ جن ریاستوں پر سنگھ کی حکمرانی ہے یا جو اس کے زیرِ اثر ہیں وہاں تاریخی نصاب کو سنگھ کی پالیسی کے مطابق یکسر تبدیل کردیا گیا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سنگھ، مستند تاریخی مواد کو یکسر ختم اور اپنے مجوزہ تاریخی نظریات کو ایک ہی وقت میں کیوں کر عملی جامہ پہنا سکے گا۔۔۔؟ اس مشکل کو سمجھنے کے باوجود سنگھ نے اپنے تعلیمی ادارے قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیوں کہ اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔ سب سے پہلا نظریاتی سکول تقسیم ہند کے دوران ہونے والے فسادات کے دوران شمالی بھارت میں قائم کیا گیا۔ لیکن تقسیمِ ہند کے بعد گاندھی جی کے قتل کی واردات نے سنگھ کو متزلزل کر دیا اور کچھ عرصے تک اس کی ترقی کی رفتار خاصی دھیمی پڑ گئی۔ علاوہ ازیں تقسیم کے بعد انڈین سرکار نے بین الاقوامی ووٹنگ سسٹم میں حصہ لینا شروع کر دیا جس کے باعث سنگھ کی مایوسی اور بھی بڑھ گئی۔

گول والکر نے جمہوریت کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔ اُس کا کہنا تھا کہ یہ مزدوروں اور نچلے طبقے کو ناجائز مراعات فراہم کرتی ہے۔ والکر کی تھیوری نے سنگھ کو وقتی طور پر خاموش کر دیا اور اُس نے الیکشن کے ہتھیار کو آزمانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ 1952ء کے انتخابات میں مزدور طبقے کی نمائندہ جماعت اُبھر کر سامنے آئی۔ یہ کانگریس کی مرکزی سرکار کی پہلی اختلافی جماعت (حزبِ اختلاف) تھی۔ اس الیکشن میں سنگھ کو بڑی معمولی نمائندگی ملی۔

اس عارضی تعطّل کو سنگھ نے ایک پرائمری سکول کے قیام سے دور کیا۔ یہ سکول 1952ء میں گورکھپور (اتر پردیش) میں قائم کیا گیا۔ اس سکول کے تھوڑے ہی عرصے بعد سنگھ نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے دہلی، بہار، مدھیا پردیش اور آندھرا پردیش میں پرائمری اور ہائی اسکولز کا جال پھیلا دیا۔

1977ء میں وِدیا بھارتی نے بڑے پیمانے پر اپنے نظریاتی سکول قائم کئے۔ 1990ء کے اعداد و شمار کے مطابق یہ نظریاتی سکولز کا دوسرا بڑا سلسلہ تھا۔ اس سکولز کی تعداد 4000، کالجز 40، اور اساتذہ کی تعداد 36000 سے زیادہ تھی۔ اور طلباء کی تعداد دس لاکھ کے قریب تھی۔ اس نے ہاف لونگ کے اس پراجیکٹ کو مزید وسعت دی، جسے عیسائی تنظیموں نے محدود کر دیا تھا۔ سنگھ کے ساتھ الحاق نے سنگھ کے تدریسی حکمت عملی اور نظریات کو مزید تقویت ملی۔

دوسرا پروجیکٹ ''سنسکار کیندرز'' کا ہے جو جغرافیائی اعتبار سے مرکز سے بہت دور علاقوں میں قائم کئے گئے۔ ان اداروں میں ہفتے میں ایک بار تعلیم دی جاتی ہے جس میں حب الوطنی، مذہب اور ہندوستانی کلچر کے موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ باقاعدہ سکولوں میں جدید نصاب کے

ساتھ ساتھ سنگھ کا مخصوص نظریاتی نصاب بھی پڑھایا جاتا ہے۔ تعلیم کو عام کرنے کے باوجود غریب عوام کو اعلیٰ تعلیم سے دور رکھا جاتا ہے۔

جہاں تک اساتذہ کے انتخاب یا اُن کے تقرریکا تعلق ہے تو اس سلسلے میں راشٹریا سیوک سنگھ خاندان کے اساتذہ کو ترجیح دی جاتی ہے اور ان کے لئے ملازمت کے مواقع تلاش کئے جاتے ہیں۔ سکولوں، کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں اور سنگھ مراکز کے علاوہ مندروں وغیرہ میں بھی سنگھ کے نظریاتی مقاصد کو نصاب کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔

اتحادو اتفاق کی حکمتِ عملی سنگھ کے لئے کامیابی کی دلیل ہے۔ اس نے ہر علاقے میں تعلیمی اداروں کا جال پھیلا کر اپنے طور پر بہت کچھ پالیا ہے۔ اساتذہ کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ طلباء کے والدین کے گھروں میں جا کر انہیں سنگھ کے بنیادی نظریات سے آگاہ کریں اور انہیں اپنا ہم خیال بنائیں۔ طلباء کے ساتھ دوستوں کی طرح پیش آئیں۔ سختی نہ برتیں۔ اس طرح طلباء اور اساتذہ اور اساتذہ اور ان کے درمیان کوئی دیوار باقی نہیں رہی۔ سنگھ کا تدریسی دائرہ روز بروز پھیلتا جارہا ہے۔

بہر کیف، سنگھ کے تعلیمی ادارے اپنی خصوصی یا امتیازی حیثیت کھو چکے ہیں، اور اس کی سب سے بڑی وجہ اُن کی مکّارانہ حکمتِ عملی ہے۔ انہوں نے تعلیمی اداروں کی دیواروں پر ایسے نقشے آویزاں کئے جن میں تقسیم سے پہلے کے پورے بھارت کو جگہ دی گئی ہے اور پاکستان اور بنگلہ دیش کو دشمن ممالک کا نام دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں دیواروں پر جو نقشے کندہ کئے گئے ہیں اُن میں پاکستان اور بنگلہ دیش کو بھی بھارت کا حصہ دکھایا گیا ہے، اور طلباء کو یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ بھارت کی تقسیم تاریخی حقیقت نہیں ہے۔ یہ تقسیم سازش کے طور پر عمل میں لائی گئی ہے۔ بھارت کے نقشے میں حسبِ منشاء تغیر و تبدّل طلباء کے ذہن میں متعدد سوالات کو جنم دیتا ہے۔ سب سے پہلا سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کیوں کر بنا؟ بھارت کیوں تقسیم ہوا؟ اور ان سوالات کے جواب میں طلباء کو مطمئن کرنے کے لئے یہ دلیل دی جاتی ہے کہ پاکستان کا قیام مسلم لیگ نامی ایک سیاسی جماعت کی ضِدّ کا نتیجہ ہے۔ ان کے مزید اطمینان کے لئے انہیں مسلم حکمرانوں کے ظالمانہ کارناموں کی من گھڑت کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ مسلم فاتحین ہندو رعایا کے افراد کو زندہ جلادیا کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ پاؤں قطع کر دیا کرتے تھے۔۔۔ اور یہ جھوٹی

کہانیاں اس لئے سنائی جاتی ہیں کہ طلباء کے اندر انتقام کا جذبہ پختہ سے پختہ تر ہوتا جائے اور پھر ایک دن یہ انتقامی جذبہ آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے اور بھارت میں بسنے والے مسلمانوں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی اس بات کی نشان دہی کر چکی ہوں کہ سنگھ کے تعلیمی اداروں کی دیواروں پر کس طرح کے نقشے اور تصویریں آویزاں کی گئی ہیں، اس بات کو میں تھوڑے سے اضافے کے ساتھ دہرانے کی اجازت چاہتی ہوں۔ تعلیمی اداروں پر جن ہندو سورماؤں کی تصویریں آویزاں کی گئی ہیں ان میں شیواجی مراٹھا اور رانا پرتاپ سنگھ کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ علاوہ بابری مسجد کو مسمار کرنے کے بعد اُسے رام مندر کی صورت میں آویزاں کیا گیا ہے۔ ہندو سورماؤں کو بڑے جاہ وجلال کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے جب کہ مسلم حکمرانوں کو نہایت سفاک اور نفرت انگیز اشکال کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ اسی طرح ہندو راجوں اور راجکماروں کو مسلمان فاتحین کا مقابلہ کرتے دکھایا گیا ہے۔ ان نقشوں اور تصویروں کو دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سنگھ کے مدبران اور مشیران کس قسم کی ذہنیت کے حامل ہیں۔ شعوری یا لاشعوری طور پر وہ تصویروں میں حقیقت کا رنگ نہیں بھر سکے۔ راجوں اور مہاراجوں کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ صرف اپنے تخت وتاج کی حفاظت کے لئے نبرد آزما ہیں نا کہ عوام کی حفاظت کے لئے۔

بابری مسجد کے انہدام میں حصہ لینے والوں میں ایک پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر جی بھی شامل تھے۔ انہوں نے بڑے فخر وانبساط سے مجھے بتایا کہ ''ہم نے پرائمری سکول کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی انتقام کے جذبے میں سرشار کر دیا ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ پہلی جماعت کے پانچ پانچ سالہ بچے بھی مُٹھیاں بھینچ بھینچ کر انتقامی نعرے لگا رہے تھے۔۔۔!'' اُن کی یہ بات سن کر مجھے اپنے آپ سے کہنا پڑا کہ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر قومیں داخلی انتشار اور خانہ جنگی کے آتش فشاں میں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ سنگھ نے ماضی کو زندہ کرنے کا جو طریقہ اپنایا ہے وہ ماضی کو تو زندہ نہیں کر سکے گا، البتہ حال کو ماضی میں دفن کر دے گا اور مستقبل کو راکھ کا ڈھیر!

سنگھ کے علاوہ بی جے پی کے زیر اثر تعلیمی اداروں میں جو نصابی کتابیں پڑھائی جا رہی ہیں وہ بھی ہندو دھرم کی سربلندی اور اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں سے نفرت پر ابھارتی ہیں۔ ان میں بھی مسلمانوں اور عیسائیوں کو غاصب، ظالم اور وحشی دکھایا گیا ہے۔ ان کتابوں میں بھارت کے

پہاڑوں، دریاؤں، کوہساروں، ندیوں، گھاس کے میدانوں، پھلوں سے لدے باغوں اور برف پوش چوٹیوں کا کوئی ذکر نہیں۔ صرف مندروں اور جنگی مناظر اور نفرت انگیز مضامین کی بھرمار ہے۔ ان کتب میں لکھا گیا ہے کہ بابر نے رام کو قتل کیا تھا، ہم اُس کا بدلہ ہندوستانی مسلمانوں سے لیں گے۔

ضرورت اب اس بات کی ہے کہ سنگھ کی تدریسی حکمت عملی اور سیاسی مقاصد کی راہ میں سچائی، بقائے باہمی، اور غیر جانبدارانہ نصابِ تعلیم کی ایسی دیواریں کھڑی کی جائیں کہ وہ انہیں پھلانگ نہ سکے اور ایسا ملک گیر مگر منطقی پرچار کیا جائے جسے دیکھ کر سنگھ کر غبارے سے ہوا نکل جائے اور اُس کا پورے بھارت پر حکومت کرنے کا خواب چکنا چُور ہو جائے، اقلیتوں کو ختم کرنے یا انہیں ظلم کا متواتر نشانہ بنانے کا شیطانی منصوبہ خاک میں مل جائے۔

ہمارا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم نے تاریخ کو ایک سیاسی ہتھیار بنا لیا ہے اور طالع آزما قوتیں اسے اپنے ظالمانہ اور حریصانہ مقاصد کے لئے توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ ہمیں مطالعہء تاریخ کو از سرِ نو زندہ کرنا پڑے گا۔ وہ تاریخ جسے غیر جانب دار، مخلص، شناسانِ ماضی و حال اور انسان دوست مؤرخین نے مرتب کیا ہو۔ جو اس سچائی کی طرف دار ہو کہ بھارت میں رہنے والے تمام لوگ، خواہ وہ ہندو ہوں، خواہ مسلمان اور عیسائی۔۔۔ وہ سب اس کی پوِتر مٹی سے پیدا ہوئے ہیں اور اسی کے بیٹے ہیں۔ ان میں کوئی بھی سوتیلا نہیں، بلکہ سب کے سب سگے ہیں۔

جو کچھ گجرات میں ہُوا وہ ایک ناقابلِ تردید صداقت ہے۔ کھلے آسمان تلے روتی، چلّاتی اور آگ میں جل کر بھسم ہوتی ہوئی صداقت۔۔۔ صداقت جو زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس صداقت نے جس ماضی کی تصویر دکھائی، وہ صرف سنگھ کا ماضی ہے۔ ہمارا ماضی اس سے قطعی مختلف ہے۔۔۔!

❁❁❁❁❁

سماجی اور مذہبی ہم آہنگی کی تاریخی بنیادیں

احمد سلیم

یہ عمومی تبصرہ اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے کہ 11 ستمبر 2001ء کے بعد دنیا پہلے جیسی نہیں رہی۔ یہ واقعہ اپنے اندر گہری تبدیلیوں کا حامل ثابت ہوا خصوصاً اپنے ملک کی صورتِ حال کے حوالے سے اسے قابلِ توجہ سمجھا جانا چاہیے۔

سیاسی سطح پر اس نے ہماری خارجہ، خصوصاً افغان پالیسی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ افغانستان میں حکومتوں کے جوڑ توڑ میں بعض مخصوص گروپوں خصوصاً طالبان کی غیر معمولی حمایت کی پالیسی نے ہمیں 11 ستمبر کے واقعات کے بعد اس کے بالکل الٹ پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ پالیسی میں یہ تبدیلی اختیاری نہیں بلکہ جبری تھی اور بین الاقوامی سطح پر طالبان کو دہشت قرار دینے سے یہ بات صاف ہو گئی کہ ہماری طالبان نواز پالیسی کسی بھی طرح قومی مفاد میں نہیں تھی۔ اس نے بین الاقوامی طور پر ہمیں پوری دنیا میں تنہا کر دیا۔ 1996 میں طالبان حکومت کو سب سے پہلے پاکستان نے تسلیم کیا تھا۔ ستمبر کے المیہ کے بعد بھی پاکستان کے علاوہ صرف سعودی عرب نے قرونِ وسطیٰ کی طرز کی اس حکومت کو تسلیم کر رکھا تھا۔

لیکن مسئلہ صرف بین الاقوامی سطح پر تنہا ہونے کا نہیں تھا۔ اس پالیسی نے ہمیں داخلی طور پر بھی نقصان پہنچایا۔ پاکستان میں امن وامان کے مسائل کا تعلق بنیاد پرستی کی اس بڑی لہر سے تھا جو 1979-80 میں افغان جہاد کے بعد شروع ہوئی اور ضیاالحق کے اقتدار کو گیارہ سال کی مصنوعی عمر دے گئی۔ ضیا کا دور بے نظیر اور نواز شریف کے ادوار میں بھی چلتا اور پاکستان کو لہولہان کرتا رہا۔ اس بنیاد پرستی نے فرقہ وارانہ تشدد کی آگ بھڑکائی اور بیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے،

پاکستان عملاً ایک ایسے دینی مدرسے میں تبدیل ہو کر رہ گیا، جہاں علم سے سیراب ہونے کی بجائے ہم تلوار کے زخم چاٹتے ہوئے نکلے۔

یہ پالیسی اچانک افغان جہاد سے شروع نہیں ہوئی تھی اور نہ جہاد افغان کے خاتمے پر ختم ہو سکی۔ اس کی جڑیں بہت دور ماضی میں جاتی ہیں جب قیام پاکستان کے آغاز میں ہی قائداعظم محمد علی جناح کے نصب العین کے برعکس پاکستان کو ایک جدید جمہوری مملکت بنانے کی بجائے ایک مذہبی ریاست کی شکل دینے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ پاکستان کی مذہبی اقلیتیں، جنہوں نے رضا کارانہ[1] طور پر پاکستان کو اپنا وطن قرار دیا تھا اور جو جداگانہ طرزِ سیاست کی بجائے ایک مشترکہ قومی دھارے کا حصہ بن کر اس ملک کی خدمت کرنا چاہتی تھیں، انہیں ذمی اور دوسرے درجے کا شہری بنائے جانے کی باتیں ہونے لگیں۔

پاکستان کے غیر مسلم شہریوں کی کہانی طویل بھی ہے اور صبر آزما بھی۔ قیام پاکستان کے ایک سال کے اندر اندر 21 مئی 1948ء کو ایک مسیحی منادسادھو نظام الدین کو، جو اپنے بشارتی دورے پر تھے، شہید کر دیا گیا۔[2] یہ اس صورت میں ہوا جب بقول آئی، یو، ظہری، ''پاکستان میں مسیحیوں اور مسلمانوں میں کسی قسم کی مخاصمت یا منافرت نہیں پائی جاتی تھی .... مسیحی اقلیت نے مسلم اکثریت کے ساتھ آباد رہنا پسند اور قبول کر لیا تھا۔ مسیحی سیاسی لیڈروں نے پنجاب کی تقسیم کے سوال پر پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا اور ساری مسیحی قوم مسلم اکثریت کے ساتھ تھی''۔[3]

اس کے چند ہی ماہ بعد پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے مارچ 1949ء میں قرارداد مقاصد منظور کی جو آگے چل کر پیش آنے والے متعدد قومی المیوں کی بنیاد بن گئی۔ مذہبی اقلیتوں کو خاص طور پر اس کا نشانہ بننا پڑا۔ مشرقی پاکستان اور سندھ میں ہندوؤں اور پنجاب میں مسیحیوں پر عرصۂ حیات تنگ کیا جانے لگا۔ 1952ء میں متہ گاؤں میں مسیحیوں کو زندہ جلانے کا سانحہ پیش آیا۔ 1956 کے آئین نے قائداعظم کے پاکستان کو اسلامی جمہوریہ ہونے کا تحفہ پیش کیا۔ 1960 کے عشرے میں لوتھرن چرچ کے مشنریوں کی شہادت اور مارٹن پور کے سانحے کے علاوہ ستمبر 1965ء کی جنگ کے دوران متعدد غیر مسلموں کو ہندوستانی ایجنٹ ہونے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔

1970ء کے عشرے کا آغاز مرے کالج سیالکوٹ میں بائبل مقدس جلائے جانے کے سانحہ سے ہوا۔ 1971ء میں مشرقی پاکستان میں ہزاروں ہندو عورتوں اور مردوں کو ''وطن دشمنی'' کی آڑ

میں ہلاک کیا گیا۔ 1972ء میں تعلیمی اداروں کو قومیانے کے نام پر مسیحیوں سمیت مذہبی اقلیتوں کے اکثر تعلیمی ادارے حکومتی قبضے میں لے لئے گئے۔ 1973 کے آئین میں اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا۔ 1977ء میں اتوار کی چھٹی کے خاتمے تک متعدد اقدامات کے ذریعے غیر مسلم پاکستانیوں کو قومی دھارے سے الگ تھلگ کرنے کی سرکاری کوششیں جاری رہیں۔

جولائی 1977ء میں تاریک سرنگ کا طویل سفر شروع ہوا۔ 1979ء میں بھٹو کی پھانسی کے خلاف احتجاج میں غیر مسلم پاکستانی بھی شامل تھے جن میں سے ایک مسیحی نے خودسوزی کر کے قومی دھارے کے ساتھ اپنی سیاسی یک جہتی کا مظاہرہ کیا۔ 1979 میں خانہ کعبہ پر شرپسندوں نے حملہ کیا۔ اس کا پاکستانی مسیحی عوام سے دور و نزدیک کوئی تعلق نہیں تھا لیکن 1965 اور 1971 کی جنگوں کی طرح مسیحی ایک بار پھر مذہبی انتہا پسندوں کے تشدد کا نشانہ بنے۔ خانہ کعبہ پر حملے کے ردِعمل میں پاکستانی کلیساؤں پر حملہ اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ پاکستان کو مسلم اور غیر مسلم آبادی میں تقسیم کرنے کا عمل اپنے منطقی عروج کو پہنچ رہا ہے۔

1980ء کی دہائی میں ضیاء نے اس عمل کو مزید آگے بڑھایا۔ آٹھویں ترمیم کے ذریعے قرار دادِ مقاصد کی اقلیتوں کے حوالے سے ایک شق میں سے لفظ ''آزادانہ'' اڑا دیا گیا۔ گویا اب وہ آئینی طور پر اپنے مذاہب کی نشر و اشاعت آزادانہ طور پر نہیں کر سکتے تھے۔ 1986 میں رحیم یار خان میں ایک گرجا گھر جلائے جانے کا سانحہ پیش آیا۔ مذہبی اقلیتوں کے لئے نئی عبادت گاہوں کی منظوری کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے کا کام بھی اسی دور میں ہوا۔

1990 کی دہائی کا ریکارڈ انتہائی شرمناک ہے۔ ضیاء الحق کے متعدد تعزیری قوانین میں مزید اضافہ ہوا۔ نواز شریف نے ضیاؔ کے سیاسی ورثے کو آگے بڑھاتے ہوئے 1991 میں شریعت بل کی منظوری دی۔ 1992 میں بابری مسجد کے انہدام سے بھی پاکستان کی مذہبی اقلیتوں کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن پاکستان میں مندروں کے ساتھ ساتھ کلیساؤں کو بھی تباہ کیا گیا۔ اسی سال توہین رسالت ایکٹ میں پھانسی کی پہلی سزا کا اعلان ہوا۔ پھر تو واقعات کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ قلعہ دیدار سنگھ کے گرجا کا سانحہ، بشپ الیگزینڈر کا اغواء، سلامت مسیح کیس، ادیب اور شاعر نعمت احمر کا قتل اور 1997 کے آتے آتے ہندو لڑکیوں کے اغواء اور آبروریزی کے واقعات،

شانتی نگر کا سانحہ، پندرھویں ترمیم 1998، بشپ جان جوزف کی شہادت، سانحہ بہاولپور، سانگلہ ہل اور پھر سانحوں کا ایک طویل سلسلہ۔

یہ مختصر سا تاریخی جائزہ کسی وضاحت یا تشریح کا محتاج نہیں۔ حالات کی تصویر انتہائی بھیانک ہے اور دور تک اندھا گھنا اندھیرا۔ لیکن روشنی کی کرن اسی اندھے گھنے اندھیرے سے پھوٹتی ہے۔ اور روشنی کی وہ کرن ہے سماجی ہم آہنگی کا پروگرام۔

یہ پروگرام گزشتہ چند برسوں سے اپنی خاموش لیکن پر استقامت جدوجہد کے ذریعے سماجی اور مذہبی ہم آہنگی کے عملی مظاہر سامنے لا رہا ہے۔ اس کا براہِ راست مشاہدہ مجھے ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ہوا جہاں فادر بونی مینڈس جیسے اہل نظر مشترکہ مسلم مسیحی بستیاں آباد کر رہے ہیں۔ ایسی ہی ایک بستی میں مسیحی اور مسلمان خواتین کے درمیان بیٹھ کر اور ان سے باتیں کر کے اس امید کا ٹھوس جواز پیدا ہو گیا کہ نفرت کی جڑیں کہیں اور ہیں۔ لوگ تو صرف پیار کرتے ہیں۔ کرسچین سٹڈی سنٹر راولپنڈی میں، حال ہی میں ان لوگوں کو بھی دیکھنے اور انہیں سننے کا اتفاق ہوا جنہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگی کا اظہار کرنے کے لئے اپنی اپنی مقدس کتابوں میں ہی سب کچھ مل جاتا ہے۔ اور پھر اقلیت اور اکثریت میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہاں پر رک کر، اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اقلیت اور اکثریت کا مسئلہ کب اور کیسے پیدا ہوا اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ بھی دیکھنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اقلیتیں محض کم تعداد میں ہونے کی وجہ سے پسماندہ، تباہ حال اور پچھڑی ہوئی کیوں ہیں؟ اس تاریخی تضاد کی نشاندہی کرتے ہوئے یہاں ہم تاریخ اور عوام کے تعلق کے حوالے سے بحث کریں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ جب ذرائع پیداوار پر ایک چھوٹے سے گروہ کا قبضہ ہو گیا تو اقلیتی گروہ کی قائم کردہ یہ ریاست کس طرح جبر کی ریاست بن گئی۔

ریاستی جبر کی نمائندہ اقلیتوں کی تاریخ عام لوگوں کی تاریخ، سے مختلف بلکہ کئی بار اس سے متضاد ہوتی ہے۔ ریاست کی بقا لوگوں کو مذہبوں، نسلوں، فرقوں اور لسانی گروہوں میں تقسیم کرنے پر منحصر ہوتی ہے۔ اس صورت حال کو سمجھنے کے لئے موجودہ پاکستانی ریاست پر ایک سرسری نظر ڈالنا کافی ہو گی۔ آج کا پاکستان، مذہبی، لسانی، نسلی، فرقہ وارانہ اور کئی طرح کے دیگر ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے۔ یہ تقسیم اسے ایک مستقل انتشار میں مبتلا کئے ہوئے ہے اور اس انتشار کا فائدہ اس چھوٹی سی

اقلیت کو ہو رہا ہے جس کی جڑیں ماضی کے تاریک غاروں تک چلی گئی ہیں لیکن اگر ہم ماضی میں بہت دور تک نہ بھی جائیں تو بھی برطانوی راج سے اس کی جڑوں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ برطانوی راج کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس نے مملکت روما کا ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کا قدیم اصول اپنایا۔ مارکس نے اس نکتے کو یوں واضح کیا کہ ''جن مختلف نسلوں، قبیلوں، ذاتوں اور ریاستوں کا مجموعہ ہندوستان کے جغرافیائی اتحاد کی تشکیل کرتا ہے، ان کے درمیان مخاصمت ہمیشہ برطانوی تسلط کا اہم اصول رہی ہے۔''[5]

قدیم ہندوستانی ریاست تفرقے اور پھوٹ کی سیاست کے باوجود صدیوں کے میل جول کے عمل کے ذریعے مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا گہوارہ بن چکی تھی۔ یہ کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت کے تصور کی بنیاد پر پروان چڑھی تھی۔ برطانوی راج نے تقسیم کا بیج بویا اور وحدت اور کثرت کے تصور کو اکثریت اور اقلیتوں کے تصور میں بدل کر ایک نئے طرز حکمرانی کو جنم دیا۔ برطانوی راج خود ایک چھوٹی سی اقلیت پر مشتمل تھا۔ مارکس کے الفاظ میں ''بیس کروڑ دیسی باشندوں کو دو لاکھ دیسی لوگوں کی فوج فرمانبردار بنائے ہوئے تھی جس کے افسر انگریز تھے اور اس دیسی فوج کو اپنی باری میں صرف چالیس ہزار انگریزی فوج نے لگام دے رکھی تھی۔ پہلی ہی نظر میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی عوام کی فرمانبرداری کا انحصار دیسی فوج کی وفاداری پر منحصر ہے۔'' اس کے ساتھ ساتھ برطانوی راج ایک طرف اکثریت اور اقلیتوں کو آپس میں لڑا کر اپنی حاکمیت کا سکہ جما رہا تھا، دوسری طرف اس نے اکثریت کو اقلیتوں پر جبر کے ہتھیار آزمانے کی ترغیب بھی دی۔ اس کے ردعمل میں دو قومی نظریہ پیدا ہوا۔ اس نظریے کی بنیاد مذہب پر تھی چنانچہ بہت سی دوسری مذہبی اقلیتوں کو ناانصافی اور ظلم کا نشانہ بننا پڑا۔ باہمی پھوٹ نے ایک دوسرے کو شک و شبے کی نظر سے دیکھنے کے عمل کا آغاز کر دیا۔ شک و شبہ، نفرت اور عداوت میں تبدیل ہونے لگا۔ جب انیسویں صدی میں یہاں انگریزی قدم پڑے تو فرقہ وارانہ جذبات میں اچانک جیسے ابال سا آ گیا۔[6]

بنگال پر انگریز ایک صدی پہلے قبضہ کر چکے تھے۔ 1843ء میں انہوں نے سندھ اور 1849ء میں پنجاب اور اس کے شمال مغرب میں پشتون علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے بنگال اور سندھ مسلمان حکمرانوں سے چھینا تھا لیکن پنجاب اور پشتون علاقے انہوں نے سکھوں سے

ہتھیائے۔ مذہبی اعتبار سے اس دلچسپ صورت حال سے راج نے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی ٹھانی۔ سندھ اور بنگال میں اس نے مسلمان وفاداروں کو تلاش کیا اور پنجاب میں ہندو اور سکھ وفاداروں کو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نئے جاگیردارانہ رشتوں کی بنیاد رکھی جو زمین کی نجی اور موروثی ملکیت سے عبارت تھی اور جس نے موجودہ حکمران طبقے کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں۔ اب وہ کم از کم نصف صدی تک آزادی کی تحریکوں کو روکنے یا انہیں ناکام بنانے پر قادر تھا۔ اب مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ یک جہتی پر کاری ضرب لگانے میں کوئی رکاوٹ مانع نہیں تھی۔ وہ رواداری اور یک جہتی، جو صدیوں کے عمل میں پروان چڑھی تھی اور جس نے بعد میں 1947ء کے خونی فسادات کے بعد بھی اپنا کردار اور جوہر نہ کھویا، اب اس کے براہ راست نشانے پر تھی۔[7]

سماجی اور مذہبی ہم آہنگی کا پروگرام دراصل پھر سے اس جوہر کو کھوجنے اور قومی زندگی میں روبہ عمل لانے کا پروگرام ہے جو صدیوں پرانے تہذیبی اور سماجی رشتوں کو آج کی زندگی میں ایک زندہ اور فعال حقیقت بنانے کے عمل سے عبارت ہے۔ یہ وہی جوہر تھا جس نے 1947ء میں پاک و ہند میں اور 1971ء میں بنگلہ دیش میں، خوفناک نسل کشی کے دوران ہزاروں انسانوں کی انسانیت کو زندہ رکھا۔ جب مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کی جانیں بچانے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دی اور اسی طرح ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو حفاظت سے پاکستانی سرحدوں تک بحفاظت پہنچانے کی جدوجہد میں اپنی جانوں کی قربانی تک دی۔ 1971ء میں لاکھوں بنگالیوں کو قتل عام کے دوران کئی ہمدرد پاکستانی فوجیوں اور عام مغربی پاکستانیوں نے بنگالیوں کی جانیں بچائیں اور دسمبر 1971ء میں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ہزاروں بنگالی ان بہاریوں کو پناہ دیتے اور ان کی حفاظت کرتے نظر آئے۔ پاکستان میں مذہبی عدم ہم آہنگی کے بحرانوں کے دوران بھی لوگوں نے پاگل پن کے برعکس انسان دوستی کے رویوں کا اظہار کیا۔ انہی جذبات کا اظہار ہندوستان میں بھی دیکھنے میں آیا۔ اس حوالے سے میں 1969ء میں احمد آباد کے ہندو مسلم فسادات کے ایک واقعہ کا تفصیلی ذکر کرنا چاہوں گا۔

1969ء میں جب احمد آباد (گجرات) میں ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑکی تو خدائی خدمت گار تحریک کے رہنما عبدالغفار خان ہندوستان میں تھے۔ انہوں نے اپنے کئی بیانات میں مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان نے گاندھی جی کے عدم تشدد کی روایات ملیامیٹ کر

دی ہیں۔عبدالغفار خان کو زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ یہ فسادات خود گاندھی جی کے صوبے میں اس وقت ہوئے جب پورے ملک میں ان کی پیدائش کا صد سالہ جشن منایا جا رہا تھا۔

فرقہ وارانہ فسادات میں گھروں کو آگ لگائی گئی، دکانوں کو لوٹا گیا، معصوم انسانوں کا بے دریغ قتل کیا گیا۔ یوں لگتا تھا کہ احمد آباد کے شہر سے انسانیت رخصت ہو چکی ہے۔ ظلم کا شکار ہونے والی اکثریت کا تعلق مسلمان آبادی سے تھا۔ چھ ہزار گھر جلا دیئے گئے تھے۔ مقامی حکومت کے اعداد و شمار کے مطابق ساڑھے تین سو، جبکہ حقیقت میں کم از کم دو ہزار لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ لیکن حیوانیت کے اس دور میں بھی ایک ایسا واقعہ سامنے آیا جس نے ثابت کر دیا کہ حکومتیں عوام کے اندر جتنی بھی پھوٹ ڈال لیں، رواداری کی صدیوں پرانی روایات کو نہیں کچلا جا سکتا۔

واقعات کے مطابق احمد آباد میں میمو بائی کے علاقے میں ہندو بلوائیوں نے تقریباً سارے گھروں کو آگ لگا دی تھی۔ علاقے میں پینتیس مکان مسلمانوں کے اور ایک سو بیس مکان ہندوؤں کے تھے۔ ایک غیر مسلم کلیان سنگھ سے پوچھا گیا:

''ایسا لگتا ہے کہ ایک بار مسلمانوں کا مجمع آیا جس نے ہندو گھروں کو آگ لگا دی اور دوسری بار ہندوؤں کا ریلا آیا جس نے مسلمانوں کے گھر جلا دیئے''۔

''جی نہیں'' کلیان سنگھ نے بتایا ''ہجوم صرف ہندوؤں کا تھا۔''

''کیا خود ہندوؤں نے ہندوؤں کے مکانات جلا دیئے؟''

''جی'' کلیان سنگھ نے جواب دیا۔

''آپ کا گھر کون سا ہے؟''

''وہ، جس سے اب بھی دھواں نکل رہا ہے۔ اس میں میری رہائش بھی تھی اور دکان بھی۔ دکان موٹروں اور سائیکلوں کے ٹائروں کی تھی۔ اسی لئے ابھی تک دھواں نکل رہا ہے۔''

''کلیان سنگھ جی! مکان کی کتنی مالیت رہی ہوگی؟''

''مکان کی مالیت قریب ایک لاکھ ہوگی اور دکان کی بھی کم و بیش اتنی ہی''

''ہندوؤں نے خود ہندوؤں کے مکان کیوں جلائے؟''

''ہجوم نے آکر ہم سے پوچھا کہ ہم مسلمانوں کے گھروں کی نشاندہی کر دیں تا کہ وہ

ہندوؤں کے مکانوں کو آگ نہ لگائے۔ وہ صرف مسلمانوں کے گھر جلانا چاہتا تھا۔ ہم نے نشاندہی کرنے سے انکار کردیا۔ بلوائیوں نے دھمکی دی کہ اگر ہم نے مسلمان گھروں کی نشاندہی نہ کی تو وہ تمام گھروں کو آگ لگادیں گے۔ ہم نے کہا، جو جی میں آئے کرو۔ ہم نہیں بتائیں گے۔ ہجوم نے پٹرول چھڑک کر پوری بستی کو آگ لگادی۔ جب شعلے پوری طرح بھڑک اٹھے، تب وہ ہجوم یہاں سے رخصت ہوا۔

''کلیان سنگھ! تم نے اپنی دو لاکھ کی جائیداد راکھ بننے دی...... کیوں؟''

کلیان سنگھ نے پاس کھڑے مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا:

''ہم اور یہ دونوں راجستھان میں سکر کے ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ پہلے ہم ہندو یہاں آکر بسے۔ اپنا کاروبار جمایا۔ اس کے برسوں بعد ہمارے مسلمان پڑوسیوں نے ہم سے کہا کہ کیا وہ بھی یہاں آباد ہو سکتے ہیں۔ ہم نے حامی بھرلی۔ وہ ہمارے بھروسے اور اعتماد پر یہاں آگئے۔ یہ سب اچھے کاریگر اور ہنرمند تھے اس لئے جلد ہی انہوں نے اپنا کاروبار کھڑا کرلیا۔ اپنے گھر بھی بنالئے......تو جن لوگوں سے ہمارے صدیوں پرانے تعلقات ہیں، جو ہمارے بھروسے پر آئے ہیں، ہمارے اپنے لوگ ہیں، جنہیں ہم چچا، تاؤ اور ماموں کہہ کر پکارتے ہیں، اگر ہم اپنے گھر بچا کر ان کے گھروں کو آگ لگنے دیتے تو اوپر والے کو کیا منہ دکھاتے......''

احمد آباد کے فسادات پر چھپنے والی حکومتی اور سرکاری تاریخ کی کتابوں میں یہی لکھا ہے کہ کتنے ہندوؤں نے کتنے مسلمان شہید کردیئے۔ کتنی املاک جلادیں لیکن عام لوگوں کی تاریخ میں، اوپر کا واقعہ نمایاں طور پر جگہ پائے گا۔ اسی طرح حکومتی اور فرقہ وارانہ تاریخوں میں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی ہلاکتوں کی تفصیلات عام مل جاتی ہیں۔ لیکن 1947ء کے جنونی دور میں پاکستانی علاقوں میں کہاں کہاں اور کن کن ہندوؤں / سکھوں کی جانیں بچائی گئیں اور ہندوستان میں مسلمانوں کی کیسے کیسے حفاظت ہوئی، یہ عوامی تاریخ کا ایک باب ہے جسے اب تک تاریخ کی کسی کتاب میں جگہ نہیں مل سکی۔ کیرالا یا شانتی نگر (خانیوال) اور اب سانگلہ ہل میں مسیحی اقلیت پر جو گزری اس کے واقعات کم یا زیادہ تفصیلات کے ساتھ درج ہو چکے ہیں لیکن اگر ان علاقوں میں کوئی ایک بھی کلیان سنگھ تھا تو اس کا واقعہ ضرور درج ہونا چاہیئے۔ یہی تاریخ کے سرکاری اور عوامی تصور کا فرق ہے۔[8]

حوالہ جات:

1- احمد سلیم، پاکستان اور اقلیتیں، مکتبۂ دانیال کراچی، 2000ء صفحہ 201

2- آئی۔ یو۔ ظہری، شہید المسیح سادھو نظام الدین، منٹگمری والہ چک نمبر 424 ج ب ضلع لائلپور، ت۔ن، صفحہ 69

3- ایضاً، صفحہ 67

4- احمد سلیم، پاکستان اور اقلیتیں، صفحہ 15

5- کارل مارکس، حوالہ ایضاً، صفحہ 16

6- احمد سلیم، پاکستان اور اقلیتیں، صفحہ 17

7- ایضاً

8- ایضاً، صفحات 18-20

❁❁❁❁❁

کلاسک

ایک مغل شہزادہ کی تعلیم

ظفر قریشی دہلوی

سترہویں صدی میں ایک مغل شاہزادہ کی تعلیم و تربیت اور آدابِ شاہانہ کی تعلیم کس نہج پر ہوتی تھی اس کی ایک دلچسپ تفصیل مشہور فارسی نوشتے آدابِ عالمگیری میں ملتی ہے۔ ذکر ہے کہ جب اورنگ زیب دکن میں بادشاہ کی جگہ حکومت کر رہے تھے اس زمانہ میں (اکتوبر 1654ء) ان کا صاحبزادہ محمد سلطان جو ابھی اپنی عمر کے پندرہویں ہی سال میں تھا اجمیر سے آگرہ کی جانب شاہجہان کے حضور میں پہنچنے کے لئے سفر کر رہا تھا۔ قدرتی طور پر اورنگ زیب کو فکر تھی کہ دربار شاہی میں ان کا لڑکا کسی قسم کی بدتہذیبی یا خلاف آداب حرکت نہ کرے کہ اس کی سُبکی ہو۔ اس وجہ سے شہزادہ کو بہت دقیق تفاصیل روزانہ بھیجی جاتی تھیں۔ ہر ہر کام کا وقت مقرر کر دیا گیا تھا۔ زندگی کا کوئی کام نہ تھا جو مقررہ ضابطہ کے ماتحت عمل میں نہ آتا ہو۔ شہزادہ پر سخت تنبیہ رکھی جاتی تھی کہ وہ مقررہ اصول و آداب سے سرِمو تفاوت نہ کرے۔

مثلاً ایک جگہ یہ تفصیل درج ہے:

''خواہ سفر میں ہو یا حضر میں طلوع آفتاب سے 72 منٹ قبل اُٹھو 48 منٹ میں حوائج ضروری اور غسل سے فارغ ہو کر محل سے نکل کر صبح کی نماز کے لئے تیار ہو جاؤ۔ نماز پڑھ کر کچھ وظیفہ پڑھو اور قرآنِ حکیم کی چند سورتیں تلاوت کرو پھر ناشتہ اندرونِ محل کرو۔ اگر سفر میں ہو تو آفتاب کو نکلے ہوئے جب 48 منٹ ہو جائیں تو کچھ دیر گھوڑے کی سواری کرو۔''

''اگر شکار کو دل چاہے تو کوشش کرو کہ فارغ ہو کر اپنی مقررہ جائے قیام پر فوراً واپس آ جاؤ۔

شکار سے واپس آ کر اگر وقت ہو اور تمہیں اچھا معلوم ہو تو کچھ عربی کتابیں زیر مطالعہ رکھو۔ ورنہ آرام کرو۔ ظہر کے وقت باہر آؤ اور نماز با جماعت ادا کرو۔ کھانے کے بعد اگر قیلولہ کی ضرورت محسوس کرو تو سو جاؤ اور پھر عصر کی نماز پڑھو۔ اگر قیلولہ کی ضرورت محسوس نہ کرو تو یہ وقت اپنی املا اور خط درست کرنے میں گذار دو یا خطوط نویسی، فارسی غزل خوانی اور کتب بینی کرو۔ عصر اور مغرب کے درمیان پھر کسی عربی کتاب کو دیکھو۔ مغرب کی نماز پڑھ کر ایک گھڑی تک ''خاص دربار'' منعقد کرو پھر عشاء پڑھ کر قرآن کی ایک آیت پڑھو اور محل میں اندر جا کر نو بجے خواب گاہ میں آرام کرو۔''

''اگر سفر میں ہو تو مندرجہ بالا امور کا خیال رکھنے کے علاوہ سواری کے بجائے تیر اندازی، ورزش اور نشانہ بازی کی مشق کرو۔ پھر ایک گھڑی تک دربار منعقد کرو اگر کوئی ضروری کام ہو تو اس وقت میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی خاص امر زیر بحث ہو تو اپنے افسروں اور اکابر سے مشورہ کی ضرورت ہو تو ایک گھنٹہ تک ان سے تخلیہ میں گفتگو کرو ورنہ یہ وقت عربی کتب کے مطالعہ میں گذارو۔''

''اگر سفر جاری ہو تو قرآن کی دو سورتیں اور اگر قیام کر رہے ہو تو تین سورتیں تلاوت کرو۔ اگر منزل مقصود پر جلد پہنچنا ہو اور وہ قریب ہو تو نماز کے بعد فوراً گھوڑا کس کر روانہ ہو جاؤ اور منزل پر پہنچ کر ہی ناشتہ کرو بیچ میں مت ٹھہرو۔ صبح صادق کو اور رات کے نو بجے کے بعد کبھی سفر مت کرو۔ اگر سفر میں شکار کرو تو فوج کو جائے قیام پر چھوڑ کر سہل ترین راستہ سے جنگل میں جاؤ اور اپنے ساتھ چند معتمد سوار لے لو۔''

چونکہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت ایک فوجی تسلط سے زیادہ نہ تھی اس لئے اس کے قیام و بقا کا دارو مدار افواج کی خوبی اور شہزادوں کی قوت عسکری اور رموز مملکت کی وسعتِ معلومات پر تھا۔ چنانچہ اورنگ زیب اس ہی وجہ سے اپنے فرزند کو یوں مخاطب کرتا ہے:

''بتدریج اسلحہ سے ملبوس ہونے کی عادت ڈالو۔ پسینہ خشک ہونے سے پہلے جامہ مت

اُتارو مبادا کہ بیمار پڑ جاؤ۔''

فوجوں میں نظم ونسق اور ضابطہ کی پابندی از حد ضروری امور تھے۔ اس لئے اورنگ زیب اپنے شہزادہ کو مندرجہ ذیل ہدایات لکھ کر بھیجتا ہے۔

''سوائے محمد طاہر کو (جو شاہزادہ کا اتالیق تھا) جو دو ہزار سواروں کا افسر ہے کسی کو اپنی فوج کے آگے مت جانے دو تم ہمیشہ جلوس کے سامنے رہو۔'' بعض افسر دائیں طرف اور بعض بائیں طرف مقرر کئے جاتے تھے۔ شاہزادہ ہمیشہ بیچ میں رہتا تھا لیکن ان کے متعلق یہ ہدایت تھی کہ دو خدام سے زیادہ اپنے جلو میں نہ رکھیں کیونکہ ''اس طرح آگے عوام کا بہت ہجوم ہو جائے گا اور فوج کے نظم قائم نہیں رہ سکے گا۔''

فوج کے کماندار کو کبھی ضرورت سے زیادہ سخت گیر مت ہونے دو ورنہ نفرت کے جذبات پھیلیں گے۔ خود بھی زیادہ خلاملامت پیدا کرو'' خواہ سفر میں ہو یا دربار کر رہے ہو بہت کم بولو اور اگر بولو تو جس قدر کم الفاظ بول سکو اتنا ہی بہتر ہے۔ جن لوگوں کو تم مخاطب نہیں کر سکتے اور وقار کے منافی سمجھتے ہو ان سے بہت خوش اخلاقی سے پیچھا چھڑاؤ تا کہ انہیں ناگوار معلوم نہ ہو اس طرح ان کے دلوں میں تمہارا وقار، تعظیم اور خوف قائم رہے گا۔ اس خط کے ہمراہ ایک خاکہ بھیج رہا ہوں جس سے تمہیں معلوم ہوگا کہ دربار اور سفر کی حالتوں میں تمہیں اپنے افسروں اور اکابر کو کس صورت میں کھڑا کرنا چاہئے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاہزادہ مطالعہ سے گھبراتا اور سیر وشکار کا زیادہ شوقین تھا۔ چنانچہ باپ شکایتاً لکھتا ہے:

''مجھے یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ تم پڑھنے لکھنے اور آداب ولیاقت حاصل کرنے میں گریز کرتے ہو یہ میرا قصور ہے کہ تمہیں بہت چھوٹی عمر میں اپنے ساتھ سیر وشکار میں لے جا لے جا کر عادت بگاڑ دی۔''

ترکی زبان ہر مغل شاہزادہ کے لئے سیکھنی لازم تھی کیونکہ افواج اور افسران و اکابر کی اکثریت ترکی بولتی تھی اور اس کا سیکھنا ان کے لئے از حد ضروری تھا۔ مگر محمد سلطان ترکی سے بیزار

معلوم ہوتا ہے۔ جب شہزادہ شمالی ہندوستان کے سفر پر عازم ہوا تو اپنے ترکی اُستاد کو موقوف کر دیا۔ اس پر باز پُرس ہوئی۔ جس کے جواب میں لڑکے نے باپ کو لکھا کہ چونکہ اُستاد موصوف بہت بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے اور سفر کی صعوبتیں نہیں سہہ سکتے تھے اس لئے ان کی خدمات سے انہیں سبکدوش کر دیا گیا! لیکن باپ نے لکھا کہ نہیں تم نے اورنگ آباد ہی میں انہیں چھڑا دیا تھا۔ ''تمہیں معلوم نہیں کہ وہ ایک سال سے ملازم ہے اور معقول تنخواہ لے رہا ہے۔ تم پر اتنا روپیہ خرچ ہو رہا ہے لیکن تم تحصیل زبان کی طرف مطلق توجہ نہیں کرتے!'' چنانچہ شہزادہ کو ہدایت کی گئی کہ استاد کو پھر بُلوائے اور زبان سیکھنے کے لئے اس سے ترکی میں بولا کرے۔ ''تم شرفا اور بادشاہوں کے آداب سیکھنے سے گریز کرتے ہو اس کا مجھ پر کیا اثر پڑے گا۔۔۔ تم اب جوان ہو گئے ہو اچھے بُرے کی تمیز کر سکتے ہو۔''

ایک شریف مسلمان خاندان کے متعلق جیسی توقع ہو سکتی تھی زیادہ زور آداب و تہذیب پر دیا جاتا تھا۔ شہزادہ کو ہدایتیں دی گئی تھیں کہ خواص کا انتخاب کیونکر کیا جائے۔ کن لوگوں کو اس سے باہر رکھا جائے۔ دربار میں منصب داروں کی کیونکر قطار بندی کی جائے۔ کن لوگوں کو مخاطب کیا جائے اور کن کو نہیں وغیرہ وغیرہ۔

لباس کے متعلق خاص ہدایات تھیں۔ ''تمہارا باپ یہ سُن کر حیران رہ گیا کہ نماز کے لئے صرف ایک نیم آستین اور پاجامے میں چلے جاتے ہو! یہ بہت تعجب کی بات ہے۔ حالانکہ تم اس کے ساتھ عرصہ تک رہے ہو۔ پوشش کے آداب اور پادشاہی امور و عادات کو کافی دیکھ چکے ہو۔''

طرزِ تحریر کے سنوارنے کا خاص خیال تھا۔ اس لئے لڑکے کو ہدایت بھیجی گئی۔ ''ہمیشہ اکبر نامہ زیر نظر رکھو تاکہ تمہاری تحریر اور گفتگو کا طرز سدھرے۔ جب تک تم الفاظ کے معانی و مطالب اور محل استعمال سے بالکل واقف نہ ہو جاؤ ہرگز انہیں اپنی گفتگو اور خطوط میں استعمال نہ کرو۔ لکھنے یا بولنے سے قبل خوب غور کر لو۔''

اس نصیحت کا ایک بہت ہی دلچسپ نتیجہ برآمد ہوا جو خاصہ لطیفہ ہے۔ اکبر نامہ کی غیر ضروری ادق اور پُر پیچ عبارت آرائی نکتہ چینوں کی برافروختگی اور قارئین کی بدمزگی کا باعث بنتا

رہا ہے۔ ایک کم فہم پندرہ سالہ لڑکے کے اس کی طرز نگارش کی نقل کیسی مضر ثابت ہوسکتی ہے اس کی مثال محمد سلطان کا ایک خط ہے جو اس نے اپنے باپ کو لکھا تھا اور جس نے بعد میں اس کی آنکھیں کھول دیں۔

لڑکے نے اپنے باپ کو ایک اس خط کی ہو بہو نقل بھیج دی تھی جو ابوالفضل کے مسودہ کے مطابق اکبر نے اپنی رعایا کو مخاطب کر کے لکھا تھا۔

محمد سلطان نے عام اسلامی رواج کے برخلاف ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کی جگہ اکبر کا مقبول ترین طرز ''اللہ اکبر!'' اور ''جل جلالہٗ'' اختیار کر کے اپنے خط میں لکھ دیا! پھر اس پر ستم یہ کیا اکبر نے جو شاہی اسالیب بیان اور طرز خطاب اپنے حکموں میں اختیار کئے تھے بجنسہ وہی جُملے اپنے باپ کو لکھ دیئے!

اورنگ زیب یہ خطوط پڑھ کر بہت برافروختہ ہوا اور لڑکے کی کم لیاقتی پر از حد متاسّف۔

چنانچہ جواب میں لکھا:

''میں نے تمہیں ابوالفضل کے ''اکبر نامہ'' کو پڑھنے کی اس لئے نصیحت کی تھی کہ تم طرز انشا اور الفاظ کے استعمال و محل سے واقف ہو جاؤ نہ کہ اس کا چربہ اُتارلو جس نے مذہب حنفیہ کو مسخ کر کے اپنی بدعتیں پھیلانی شروع کر دی تھیں اور ملحدانہ خیالات کی نشر و اشاعت کر رہا تھا! تم اپنے لکھے ہوئے مکتوب کو ''نشان والا'' اور اپنی مُہر کو ''مُہر خاص'' لکھو گے تو پھر شہنشاہ والا تبار کے مکتوب اور مہر کو کس نام سے یاد کرو گے؟ بتاؤ!''

باوجودیکہ لڑکا علمی و ادبی پہلوؤں سے بالکل قرطاس سادہ رہا مگر پھر بھی جب وہ اگلے دسمبر میں اپنے دادا کے پاس ہندن پہنچا تو بہت پُر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ انعام و اکرام کی بارش کی گئی اور خلعت و خطابات سے غریب لڑکے کو پاٹ دیا گیا۔

غالباً قاری کو اس غیر امید افزا طالب علم کی آئندہ سرگرمیوں کی روئیداد سننے کا شوق ہوگا۔ اس لئے یہاں مجملاً ذکر کیا جاتا ہے:

تین برس بعد جب دہلی کے تخت کے لئے جنگ چھڑی تو یہ نوعمر شہزادہ اپنے باپ (اورنگ زیب) کی فوج کے ساتھ تھا۔ اور جیسا کہ فرزند اکبر سے توقع کی جا سکتی تھی وہ افواج کا لیفٹیننٹ تھا۔

دھرمت۔ ساموگڑھ اور خاجوہ کی لڑائیوں میں محمد سلطان اورنگ زیب کے شاہی دستہ کی کمان کرتا رہا۔ کہا جاتا ہے کہ خاجوہ پر محمد سلطان کے مردانہ وار مقابلہ نے شکست کو فتح سے بدل دیا ورنہ میدان ہاتھ سے جاتا ہی رہا تھا۔

جب بالآخر شاہجہان کو سوائے زیر ہونے کے اور کوئی چارہ نہ رہا تو محمد سلطان ہی کو قلعہ آگرہ میں بھیجا گیا تا کہ اپنے دادا کی نظر بندی کے انتظامات مکمل کر سکے۔

اس مرحلہ کے بعد شجاع کے تعاقب کے لئے اسے میر جُملہ کی نگرانی میں بنگال کی طرف روانہ کیا گیا۔ باپ اور نگران خاص کی ناراضگی اور برافروختگی کا مطلق خیال نہ کرتے ہوئے اس نے شجاع کے ایلچیوں سے مصالحانہ گفتگو شروع کی اور ''راج محل'' کی یورش کو اس دوران میں بند کر دیا۔ شجاع نے اپنی لڑکی ''گلرخ بانو بیگم'' کی شادی اس سے کرنے کا وعدہ کیا (کہا جاتا ہے کہ اس لڑکی سے اس کی بچپن میں منگنی بھی ہو گئی تھی)۔

نوجوان شہزادہ اپنی فوجوں کو تنہا چھوڑ کر ایک بھیانک رات (8- جون 1659ء) کو چچا کے کیمپ جا پہنچا اور کچھ عرصہ بعد اپنی محبوبہ سے شادی کر لی۔

آٹھ ماہ بعد شجاع کو شکست فاش ہوئی اور محمد سلطان اسے بیکس چھوڑ کر میر جملہ سے جاملا۔ اور جیسی کہ توقع کی جا سکتی ہے اورنگ زیب نے اس مفرور، بزدل شہزادے کو خوب سزا دی گئی۔

پہلے دہلی لے جایا گیا۔ ایک مضبوط فوجی دستہ نگرانی میں ہر وقت تیار رہتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اسے گوالیار کے شاہی زندان میں محبوس کر دیا گیا۔ یہاں سے اس کی تصویر کھینچ کر اکثر بادشاہ کے پاس بھیجی جاتی تھی اور وہ معائنہ کر کے اپنے بے راہ رو لڑکے کی صحت وغیرہ کا حال معلوم کر لیا کرتا تھا۔

ابھی اس نے اپنی عمر کے 37 برس ہی پورے کئے تھے کہ 3- دسمبر 1676ء کو انتقال کر کے جُملہ تکالیف سے نجات حاصل کر لی۔

وفات سے چار سال قبل بادشاہ نے اس شاہی قیدی پر یہ مہر خسروانہ کیا تھا کہ گوالیار سے اسے دہلی کے قلعہ سلیم گڑھ میں منتقل کر دیا تھا۔۔۔۔۔اور وہ باپ سے قریب تر ہو گیا تھا۔
اس قلیل عرصہ میں سلطان نے تین شادیاں کیں!۔

❁❁❁❁❁

سترہویں صدی میں ہندوستان کی پارچہ بافی

مولانا شان الٰہی زبیری

سترہویں صدی کے شروع ہی میں برطانیہ کے تجارتی تعلقات ہندوستان کے ساتھ قائم ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان کو ساری دنیا میں سوتی پارچہ بافی کا واحد مرکز ہونے کا شرف حاصل تھا۔ جس کا کوئی رقیب اور شریک وسہیم نہیں تھا۔ اُس وقت جو مرتبہ ملک چین کو ریشم سازی میں مصر کو ٹسر سازی اور انگلستان کو اون سازی میں حاصل تھا وہی درجہ ہندوستان کو سوتی پارچہ بافی میں حاصل ہو گیا تھا اور یہ کہنا واقعات پر مبنی ہے کہ زمانہ قدیم سے لے کر اُنیسویں صدی کے اوائل تک سوتی پارچہ بافی کا اجارہ ہندوستان ہی کے قبضہ میں رہا۔ لیکن انگلستان صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد جب وہاں سوتی پارچہ تیار کرنے میں سہولتیں پیدا کر دی گئیں اُس وقت سے ہندوستان کا وہ رتبہ جاتا رہا جو اسے مدّت دراز تک ساری دنیا کے دساوروں میں حاصل رہا تھا۔ لیکن باوجود سخت مقابلہ ہونے کے ہندوستان کے دستکاروں نے عرصہء دراز تک اپنے وجود کو برقرار رکھا۔ ہندوستانی ململ کی انگلستان میں بہت مانگ تھی اور وہ بہت اچھے داموں میں فروخت ہوتی تھی۔ اب ہندوستان میں بھی پارچہ بافی کے مِل قائم ہو گئے ہیں جو خم ٹھونک کر ولایتی کپڑے سے مقابلہ کر رہے ہیں اور ولایتی کپڑے کے بائیکاٹ اور دیسی کپڑے کے استعمال یعنی سودیشی تحریک نے ایسا موقع پیدا کر دیا ہے کہ یہاں کا سوتی کپڑا ولایتی کپڑے سے مقابلہ کر کے اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر لے گا۔

ہندوستان ہزار ہا سال تک سوتی پارچہ بافی کا مرکز رہا ہے اور اس نے نہ صرف اپنے یہاں کے کروڑوں باشندوں کی ستر پوشی کی ہے۔ بلکہ کثیر مقدار میں اپنا سوتی کپڑا غیر ممالک کو دیا ہے۔

مسٹر بین نے اپنی کتاب تاریخ سوتی پارچہ بافی مطبوعہ 1845ء کے صفحہ 56 پر تحریر کیا ہے کہ ''جدید فیکٹریوں کی پیچیدہ مشینوں کے مقابلہ میں جولاہوں کے آلات پارچہ بافی نہایت سادہ اور بھونڈے ہوتے ہیں۔ لیکن جو کپڑا وہ تیار کرتے ہیں وہ انسانی دستکاری نہیں معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ ایسا خیال ہوتا ہے کہ یہ کپڑا پریوں یا کیڑوں مکوڑوں نے تیار کیا ہے۔ اور اب بھی منچسٹر کی اعلیٰ کی فیکٹریوں کے تیار کئے ہوئے کپڑے سے ہندوستانی جولاہے کا بنایا ہوا کپڑا کہیں زیادہ قابلِ قدر سمجھا جاتا ہے۔ اسی کتاب میں مسٹر بین دوسرے مقام پر یوں رقم طراز ہوتے ہیں کہ ''یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ صنعت وحرفت کے اس شعبہ یعنی پارچہ بافی میں ایک ایسے ملک میں جہاں پر تمام پیداوار کی طرف سے لاپروائی ہے۔ پارچہ بافی کے آلات نہایت سادہ اور بھونڈے ہوتے ہیں۔ تقسیم عمل کا مطلق رواج نہیں لیکن کپڑا اس قدر خوشنما اور نفیس تیار ہوتا ہے جس کا مقابلہ دنیا کا کوئی ملک نہیں کرسکتا ہے۔ باوجودیکہ ان کے یہاں انواع واقسام کی مشینری موجود ہے۔ میں نے اس کتاب کی تدوین کے وقت بہت کچھ تحقیق اور تفتیش کی۔ لیکن مجھ کو معلوم ہوا کہ اس سے قبل کسی شخص نے بھی ہندوستان کی پارچہ بافی کی تاریخ لکھنے کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔''

مسٹر بین کے یہ الفاظ پڑھ کر ہر ایک محبّ وطن اور غیرت مند ہندوستانی کو سخت ندامت محسوس ہوگی۔

ہم صاف طور پر عرض کئے دیتے ہیں کہ اس مضمون کی تیاری میں ہم کو زیادہ تر یورپین سیّاحوں کے سفرناموں یا بعض علمی کتابوں سے معلومات بہم پہنچی ہیں۔

ہم سردست اس مضمون کے تاریخی اور تنقیدی پہلو سے چشم پوشی کر کے صرف اس قدر بتانا چاہتے ہیں کہ سترہویں صدی میں جب برطانیہ کے تجارتی تعلقات ہندوستان کے ساتھ قائم ہو گئے اُس وقت ہمارے ملک کی پارچہ بافی کی اقتصادی حالت کیسی تھی۔

پارچہ بافی کی قدامت اور اُس کی اقتصادی خوبیاں

ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی کی قدامت کا زمانہ معلوم کرنا یا معین کرنا ناممکنات سے ہے۔ پروفیسر ولسن نے ترجمہ رگوید کے صفحہ 41 پر تحریر کیا ہے کہ ''یہ کہنا بالکل درست ہے کہ تین ہزار سال پیشتر اہلِ ہند دستکار لوگ تھے۔ وہ خود اپنے واسطے کپڑا تیار کرلیتے تھے۔ لیکن ہندوستانیوں کا یہ

دعویٰ ہے کہ ہمارے یہاں کا کپڑا بہت سے مہذب ممالک میں استعمال کیا جاتا تھا۔"

مصر اور شیلڈیا کی قدیم سلطنتوں میں ہندوستانی کپڑا زیادہ رائج تھا۔ توریت اور زبور میں بھی کپڑے کا سنسکرت نام کرپ موجود ہے۔ سکندر اعظم کے سپہ سالار نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ "ہندوستانی کپڑے ایسی اون سے بنتے ہیں۔ جو درختوں پر پیدا ہوتی ہے۔"

یونانی اور رومی لٹریچر میں ہندوستانی ململ کا نہایت عمدہ اور شاندار الفاظ میں تعریف کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔

سنہ عیسوی کے شروع ہونے پر ہندوستان کے کپڑے کی مانگ ساری دنیا میں اس قدر بڑھ گئی تھی کہ اس نے ہندوستان کی تجارت کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ چنانچہ اُس زمانہ کے مشہور اہل قلم پینی۔ ٹولمی۔ اسٹر یبو وغیرہ کی تصانیف میں اس کا تذکرہ خاص طور پر کیا گیا ہے۔ اور جنوبی ہند میں اُس زمانہ کے جو رومی سکے دستیاب ہوئے ہیں اُن پر بھی ہندوستان کی تجارتی ترقی کے حالات کندہ ہیں۔ اور اُس وقت سے لے کر دنیا کی ہر ایک مہذّب اور شایستہ قوم کو ہندوستانی کپڑے کے استعمال کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔

زمانہ قدیم اور زمانہ حال کے یورپی اور ایشیائی مصنفین جب ہندوستانی کپڑے کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کی نفاست اور خوشنمائی بیان کرنے میں اپنے قلم کا پورا زور دکھا دیتے ہیں۔ یہاں کے کپڑے کی نفاست۔ خوشنمائی اور ملاحت ہی نے ہر ایک ملک کے فیشن ایبل حضرات کو اس کا دلدادہ اور گرویدہ بنا لیا تھا۔ اور ہر ایک زمانہ میں یہاں کی چھینٹوں کی خوشنما گل کاری نے مذاق سلیم رکھنے والے حضرات کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔

چنانچہ مسٹر ٹرنیر جو خود کپڑے کا تاجر اور زبردست مبصر تھا۔ اپنے سفرنامہ کی جلد اوّل کے صفحہ 511 پر لکھتا ہے۔ "کالی کٹ کے بعض کپڑے اس قدر نفیس اور سبک ہوتے ہیں کہ آپ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کے سوت کو نہیں دیکھ سکتے۔ آپ کو ہرگز معلوم نہ ہو سکے گا کہ یہ کپڑا کس قدر باریک تار سے بنایا گیا ہے۔"

یہی سیّاح دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ "یہ کپڑے اس قدر باریک ہوتے ہیں کہ آپ اگر اُنہیں زیب تن کر لیں تو آپ کا سارا جسم صاف نظر آئے گا۔ گویا آپ برہنہ ہیں۔"

روایت ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب ایک روز اپنی صاحبزادی پر خفا ہوا کیونکہ جو کپڑے وہ

پہنے ہوئے تھی۔ اُن میں سے اس کا جسم صاف نظر آتا تھا۔ صاحبزادی نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ ''ابا جان! میں تو سات کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔''

مسٹر وارڈ فرماتے ہیں کہ ''ہندوستان کی ململ اس قدر باریک ہوتی ہے کہ اگر ململ کا تھان گھاس پر پھیلا دیا جائے اور اُس پر شبنم پڑ جائے تو ململ بالکل نظر نہ آئے گی۔ اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض جانوروں نے گھاس کے ساتھ ململ کو بھی کھا لیا۔ چونکہ اُنہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ گھاس پر ململ بچھی ہوئی ہے۔''

ململ کی نفاست کا اندازہ کرنے کے بہت سے طریقے تھے چنانچہ نویں صدی عیسوی میں اس کی جانچ کا یہ طریقہ رائج تھا کہ ململ کا بیس گز کا تھان عروسی انگوٹھی میں سے نکال لیا جاتا تھا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ تھان کی لمبائی اور اُس کے وزن سے اُس کی نفاست معلوم کر لی جاتی تھی۔ عمدہ ململ کا پندرہ گز لمبا تھان جس کا عرض ایک گز کا ہو اُس کا وزن صرف تین تولہ نو ماشہ ہوتا تھا۔ روایت ہے کہ ایک ایرانی قاصد جب ہندوستان سے واپس گیا تو اُس نے تیس گز ململ کا ایک گولہ جو چھوٹے ناریل کی برابر تھا بطور تحفہ اپنے آقا کی خدمت میں پیش کیا۔ اس گولے پر ہیرے جڑے ہوئے تھے۔

نفیس ململ کے بہت سے نام رکھ دیئے گئے ہیں مثلاً شبنم آبِ رواں۔ البیلی۔ تن زیب اور یہ شاعرانہ نام ململ کے اوصاف کے باعث تراشے گئے ہیں۔

مسٹر بیکر اپنی کتاب Calico Printing in India کے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں کہ ''اگرچہ ہم نے پارچہ بافی میں بہت کچھ ترقی کر لی ہے۔ لیکن حق بات تو یہ ہے کہ اب بھی ہندوستان کی ململ اور چھینٹ اس قدر نفیس ہوتی ہے کہ ہماری فیکٹریاں ان کی نقل اُتارنے کی لاکھ کوشش کرنے پر بھی ہرگز ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہیں۔''

یورپ کے کاریگر اب تک یہی سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کی ململ اور چھینٹ تیار کرنے میں کچھ ایسے راز پوشیدہ ہیں جن کا انکشاف نہ کسی یورپین سے ہُوا اور نہ ہو سکتا ہے۔ صدہا سال سے فن پارچہ بافی آبائی پیشہ ہونے کے باعث تکمیل کے ایسے بلند درجہ پر پہنچ گیا ہے جہاں کسی اور کی رسائی ممکن نہیں۔

چنانچہ انگلستان اور فرانس میں جب چھینٹ تیار کرنے کا کام شروع ہوا تو وہاں کے

کاریگروں نے ہندوستان کی چھینٹ کی گلکاری کی آنکھیں بند کر کے نقالی شروع کر دی۔

ہندوستان میں اگرچہ ہزاروں قسم کے کپڑے تیار ہوتے ہیں لیکن ان میں سے عام مقبولیت غیر ممالک میں یہاں کی چھینٹ ململ اور چکن کو حاصل ہوئی ہے۔

اس سوال نے یورپ میں بہت دلچسپی پیدا کر دی تھی کہ ہندوستان میں پارچہ بافی کے مرکز کون کون سے ہیں۔ اور بعض یورپین سیاحوں مثلاً ٹربورنیر وغیرہ کے بیان نہایت گمراہ کن ثابت ہوئے ہیں۔ مثلاً چھینٹ یا چھپے ہوئے کپڑے کا نام اُس نے Calico رکھا جس سے اکثر حضرات کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ کپڑا کالی کٹ سے موسوم ہے حالانکہ کالی کَٹ تو کیا ملابار کا کوئی علاقہ بھی کسی زمانہ میں پارچہ بافی کا مرکز نہیں رہا ہے۔ یا ململ کا نام Muslim رکھا گیا ہے جس کی بابت یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ موصل میں بنتی ہے۔ حالانکہ موصل عراق عرب کے ایک شہر کا نام ہے جو اُس مقام پر آباد ہے جہاں کسی زمانہ میں نینوا آباد تھا۔ قرین قیاس تو یہ تھا کہ لفظ Muslim کو موسلی پٹم سے موسوم کیا جاتا۔ جو دو ہزار سال تک ململ سازی کا مرکز رہا ہے۔ لیکن چونکہ یورپین سیاحوں کی زبان سے اہلِ یورپ نے یہی نام سنے۔ اس لئے یورپین تاجروں میں یہی نام رائج ہو گئے اور تجارت میں وہ یہاں کی ململ اور چھینٹ کو Muslim اور Calco کے نام سے موسوم کرنے لگے جواب تک رائج ہیں۔

ہندوستان کے تقریباً ہر ایک گاؤں میں کپڑا تیار ہوتا تھا اور کوئی ایسا قریہ نہیں تھا۔ جس میں سوت کاتنے والے اور کپڑا بُننے والے موجود نہ ہوں۔ چنانچہ مسٹر اورمی اپنی کتاب ''اوراق تاریخ'' کے صفحہ 413 پر تحریر کرتے ہیں کہ ''ہندوستان میں کوئی گاؤں ایسا نہیں ہے جس میں ہر ایک مرد۔ عورت اور لڑکا پارچہ بافی کے کام میں مصروف و مشغول نہ پایا جائے۔'' البتہ مسٹر موصوف کا یہ بیان مبالغہ پر مبنی ہے کہ ''ہندوستان کے نصف باشندے سے پارچہ بافی کے کام پر لگے ہوئے ہیں۔'' لیکن جب ہم اس حقیقت پر غور کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں دنیا میں جس قدر سوتی کپڑے کا صرف تھا وہ ہندوستان ہی میں تیار ہوتا تھا۔ علاوہ بریں ہندوستان اپنے یہاں کے ذکور واناث کی بھی ستر پوشی کرتا تھا۔ تو مسٹر مور لینڈ کی یہ رائے بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ ''1600ء میں صنعتی دنیا میں ہندوستان نے یہ اعلیٰ مرتبہ حاصل کر لیا تھا کہ وہ ساری دنیا کے استعمال کے واسطے سوتی کپڑا تیار کر دیتا تھا۔''

اگرچہ پارچہ بافی سارے ہندوستان میں ہوتی تھی۔ لیکن اس کی تیاری کے چند خاص خاص مرکز تیار ہو گئے تھے۔ جو غیر ممالک کو ہندوستان کا کپڑا روانہ کرتے تھے۔ مثلاً بنگال ڈھاکہ معہ متعلقہ اضلاع کے۔ ساحل کارومنڈل مع موسلی پٹم۔ کھمبات جہاں پر سورت۔ پٹن۔ بروچ وغیرہ کا کپڑا آتا تھا۔ علاقہ انڈس جہاں لاہور۔ ملتان اور دیگر دساوروں سے کپڑا آتا تھا۔ اور یہ علاقے خاص خاص قسم کے کپڑے کے دساور تھے چنانچہ بنگال نفیس اور باریک کپڑے یعنی ململ کا دساور تھا۔ کارومنڈل چھینٹ کا مرکز تھا۔ جس کی ایران اور یورپ میں بہت قدر ہوتی تھی۔ کھمبات ارزاں اور موٹے کپڑے کا دساور تھا جو افریقہ اور عرب میں استعمال ہوتا تھا۔

ہر ایک علاقہ کی پارچہ بافی کے تفصیلی حالات بیان کرنا طوالت کا موجب ہوگا۔ اس لئے سردست صرف دو علاقوں کی کیفیت عرض کی جاتی ہے۔

بنگال زمانہ قدیم سے نفیس کپڑا تیار کرنے کا مرکز ہے۔ چنانچہ ڈھاکہ کی ململ اس وقت اپنی نفاست کے واسطے شہرۂ آفاق ہے۔ یہ ململ نہ صرف ڈھاکہ میں تیار ہوتی ہے۔ بلکہ سُنار گنج ڈیسی۔ تبت باڑی۔ جنگل باڑی۔ بازید پور اور اُن کے قریبی علاقوں میں تیار کی جاتی ہے۔ اس ململ کی نفاست کا خاص سبب تو وہاں کے جولاہوں کی آبائی کاریگری اور صناعی ہے۔ علاوہ بریں یہ علاقہ سرد ہے اور بارش بھی کافی ہوتی ہے بہت سے یورپین سیاحوں کا یہ مقولہ ہے کہ اس علاقہ کے باشندے دبلے پتلے اور نازک اندام ہوتے ہیں وہ اپنی نازک بزم اور پتلی انگلیوں سے سوت کی باریکی اور اُس کے وزن کا اندازہ بآسانی کر لیتے ہیں۔''

مشہور مورّخ مسٹر جیمس مل تاریخ برطانی ہند کی جلد دوم کے صفحہ 8 پر بنگالی جولاہے کے متعلق اپنی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ ''پارچہ بافی پتہ مار کر دیر تک بیٹھے رہنے کا پیشہ ہے۔ اس کام کے لئے بہت زیادہ استقلال کی ضرورت ہے جو بنگالی جولاہے میں بمقدار کثیر موجود ہوتا ہے اس کام کے لئے جسمانی ریاضت ومشقت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے جولاہے کو جس قدر نفیس اور باریک کپڑا تیار کرنا ہوتا ہے۔ اُسی قدر آہستگی کے ساتھ اُسے اپنی انگلیوں کو جنبش دینی پڑتی ہے۔''

جولاہے کے ان اوصاف کے لئے یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ہندوستان میں پیشہ موروثی ہوتا ہے۔ اور اس کی پابندی ذات پات کے قوانین سے بھی زیادہ سخت ہے۔ ان سب باتوں کے

یکجا جمع ہونے سے ہندوستانی جولاہے میں پارچہ بافی کے ایسے اوصاف پیدا ہو گئے ہیں۔ جو دنیا میں عدیم المثال ہیں اور اسی وجہ سے ہندوستان کے بیش قیمت سوتی کپڑے کو تمام دنیا کا اجارہ خود بخود حاصل ہو گیا تھا۔

اس زمانہ میں شاہان وقت بھی جولاہوں کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اولاً ہندو راجگان نے اور پھر شاہانِ مغلیہ نے جولاہوں کی اس قدر توقیر اور دستگیری کی کہ اس دستکاری کی بدولت سارا ملک بیحد مرفہ الحال ہو گیا۔ چنانچہ شہنشاہ اکبر اعظم اور ملکہ نور جہاں نے ڈھاکہ کے جولاہوں پر جو نوازشات اور کرم گستریاں کی ہیں۔ وہ جولاہوں کو اس وقت تک روایتاً یاد ہیں۔ ہر سال جو بہترین پارچے تیار ہوتے تھے وہ شاہی دربار میں پہنچا دیئے جاتے تھے۔ ابتدا میں یہ کپڑے بطور تحفہ یا ہدیہ کے پیش ہوتے تھے۔ لیکن مابعد زمانہ صوبہ داروں نے نذرانہ کے طور پر بیش قیمت تھان لینے شروع کر دیئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی بھی شاہانِ مغلیہ کی تقلید میں ڈھاکہ کے جولاہوں کی ہر طرح حوصلہ افزائی کرتی رہی۔ لیکن اس کمپنی کے شکست ہو جانے کا نہایت مہلک اور مضرت ناک اثر ہندوستان کی پارچہ بافی کو پہنچا ہے۔

ڈھاکہ کے بعد ساحل کارومنڈل پارچہ بافی کا دوسرا مرکز تھا۔ مارکو پولو اپنے سفرنامہ کی جلد سوم کے باب 31 میں لکھتا ہے کہ ''آجکل (یعنی سترہویں صدی میں) موسلی پٹم میں نہایت نفیس اور خوبصورت سوتی کپڑا تیار ہوتا ہے جو ساری دنیا میں عدیم النظیر ہے۔'' مارکو پولو یہ تعریف موسلی پٹم کی چھینٹ کی کرتا ہے جو سلطنت روما کے عروج کے ابتدائی زمانہ سے دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ ہم اُس قدیم زمانہ میں تعین نہیں کر سکتے جب سے کہ ہندوستانی کپڑے کی مانگ ایران میں ہے۔ اور کپڑے کی تجارت کا یہ سلسلہ ایران کے ساتھ اس وقت تک بدستور قائم ہے۔

موسلی پٹم کی چھینٹوں کی وضع اور دلکش گلکاری نے خریداروں کو اپنا گرویدہ اور شیفتہ بنالیا تھا۔ ان چھینٹوں کے بعض نمونے اب بھی وکٹوریہ اور البرٹ میوزیم میں موجود ہیں۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہ چھینٹیں ڈچ اور ایرانی خریداروں کے واسطے تیار کی گئی تھیں۔ اور سر جارج برڈ ووڈ کی یہ رائے بیشک درست ہے کہ ''ہندوستانی چھینٹ کی گُلکاریوں کو دیکھ کر اور اُن کی تقلید اور نقالی کر کے انگریزوں نے سترہویں اور اٹھارہویں صدی میں چکن سازی سیکھی ہے۔ ساحل کارومنڈل کے

علاقہ میں موسلی پٹم کے علاوہ اور بھی مقامات تھے۔ جہاں چھینٹ کے علاوہ اور قسم کے کپڑے بھی تیار ہوتے تھے۔ اور اس علاقہ میں پارچہ بافی کے خاص مرکز مدورا۔ توتی کورن اور ٹراونکو مانے جاتے تھے۔ جو موٹا اور باریک الغرض ہر قسم کا کپڑا کثیر مقدار میں تیار کرتے تھے۔ ان کے علاوہ وزیگا پٹم پولی کٹ۔ ارکاٹ۔ مدراس۔ ساور ابھی پارچہ بافی کے مرکز تھے لیکن ان مقامات پر لنگیاں، نقاب اور رومال تیار ہوتے تھے۔ مدراس کے رومال انگلستان میں نہایت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ چنانچہ انگریزی کی اکثر قصہ کہانی کی کتابوں میں مدراسی رومال کی تعریف نہایت لچھے دار الفاظ میں کی گئی ہے۔

مدراس اور بنگال کے کپڑے کی تعریف تو پرانی روایتیں ہیں۔ لیکن کھمبات کا علاقہ اب بھی پارچہ بافی کا زبردست مرکز مانا جاتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں جالندھر کے دوآبہ میں ململ کی پگڑیاں اور کھدر تیار ہوتا ہے۔ اور سندھ کا صوبہ بھی موٹے کپڑے کا دساور تھا۔

الغرض سترہویں صدی میں ہندوستان کے لاکھوں باشندے پارچہ بافی کے کام میں مصروف تھے۔ دنیا کے ہر حصہ میں یہاں کے کپڑے کی مانگ تھی۔ اور کثیر مقدار میں کپڑا تیار ہوتا تھا۔ ان جملہ امور سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں ہندوستان کی پارچہ بافی عروج پر تھی۔

پارچہ بافی کی تنظیم

پارچہ بافی کی صنعت جب سترہویں صدی میں عروج پر تھی اُس وقت اس کی تنظیم کس طور پر کی گئی تھی۔ غالباً اس کی مفصل کیفیت بیان کرنا دلچسپی کا موجب ہوگا۔ اگرچہ ہندوستان میں ذات پات کی تقسیم کو آبائی پیشہ وری اور تمدن میں بہت کچھ دخل حاصل ہے اور یہاں کی مختلف اقوام اپنے اپنے آبائی پیشہ میں مشغول و مصروف رہی ہیں۔

قدیم زمانہ میں جب لوگوں کی ضروریات نہایت محدود اور سیدھی سادی تھیں، اُس وقت ہر یک گاؤں میں وہاں کے باشندوں کی ضروریات کی چیزیں تیار ہو جاتی تھیں۔ اور اُس وقت پارچہ بافی ہی ایک خاص قوم کا مخصوص پیشہ تھا۔ لیکن جب غیر ممالک میں ہندوستان کے کپڑے کی قدر ہونے لگی اور باہر سے فرمائشات آنے لگیں تو پارچہ بافی صرف جولاہوں تک محدود نہیں رہی

بلکہ دوسری قوموں نے بھی سوت کاتنے اور کپڑا بُننے کا پیشہ اختیار کرلیا۔ اور بالخصوص جب ایران، عرب افریقہ اور یورپ میں ہندوستانی کپڑے کا استعمال ہونے لگا تو علاوہ جولاہوں کے کایستھ۔ کوبی اور دیگر شودر اقوام اور بعض مسلمانوں نے پارچہ بافی کو اپنا پیشہ بنالیا اور کپڑے کی تجارت کے فروغ سے پارچہ بافی کی پنچایتیں قائم ہوگئیں۔ اور ان کو جب عروج حاصل ہوگیا تو ان ہی پنچایتوں کی بدولت احمد آباد، سورت، مرشد آباد، ڈھاکہ، تنجور اور ملتان کپڑے کے زبردست دساور بن گئے۔ اگرچہ ان پنچایتوں میں بہت سے لوگ شریک تھے۔ لیکن مال کی خرید فروخت سیٹھ اور گماشتے کرتے تھے۔

کپڑے کے بڑے بڑے دساور میں ایک ناگر سیٹھ (امیر البلد) ہوتا تھا جو پارچہ بافی کے اندرونی معاملات میں کچھ دخل نہیں دیتا تھا۔ لیکن اس شہر کے تیار کیے ہوئے کپڑے کی تجارت کا سارا انتظام اُسی کے سپرد تھا۔ اس پنچایت کے عہدیدار موروثی ہوتے تھے۔ لیکن معمولی فیس ادا کرنے پر نئے ممبران شامل کر لئے جاتے تھے۔ لیکن اس پنچایت کے قوانین کی رو سے کوئی ایسا شخص ممبر ہونے کا مستحق نہیں تھا جو فن پارچہ بافی کا ماہر اور اس کا ممبر نہ ہو اور جملہ ممبران ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھتے تھے کہ ہمارے فن کا معیار گرنے نہ پائے۔ ہر ایک لڑکے کو اُس کا باپ اپنے فن کی مکمل تعلیم دیتا تھا۔ اور جب وہ لڑکا اعلیٰ درجہ کا ماہر ہوجاتا تھا اُس وقت وہ پنچایت کا ممبر بنالیا جاتا تھا۔ اور اس رسم کے ادا ہوتے وقت جملہ ممبران پنچایت کی دعوت کی جاتی تھی۔ اور حتی المقدور اس ضیافت میں لطیف اور خوش ذائقہ کھانے کھلائے جاتے تھے۔

پنچایت کام کرنے کے اوقات کا تعین کرتی تھی۔ ایام تعطیل مقرر کرتی تھی اور پارچہ بافی کے کام کی تفصیلات کی بابت قاعدے و قانون تیار کرتی تھی۔ مثلاً ڈھاکہ میں کام کرنے کا وقت 6 یا 7 بجے صبح سے 12 بجے تک اور پھر 2 یا 3 بجے سے 6 یا 7 بجے شام تک تھا۔ سال میں 40 دن کی تعطیل ہوتی تھی۔ اور تعطیل کے دنوں میں کام بالکل بند کردیا جاتا تھا۔

ہندوستانی پنچایت کے ممبران آپس میں چندہ کرکے دعوتیں کرتے تھے۔ اور مختلف طریقوں سے حاجتمند ممبران کو مالی امداد دیتے تھے۔ چندہ کے مشترکہ سرمایہ سے نہ صرف ممبران کی مالی مشکلات رفع کی جاتی تھیں۔ بلکہ عبادت گاہیں اور مدرسے قائم کیے جاتے اور اُن کے کل مصارف ادا کیے جاتے تھے یہ روپیہ دعوتوں اور تفریحی مشاغل میں بھی صرف کیا جاتا تھا۔ سرمایہ فراہم کرنے

کا ایک نہایت آسان طریقہ یہ تھا کہ ایک مقررہ دن میں شہر کے کل کپڑے کی فروخت کا ٹھیکہ کسی
یک دوکان کو دیدیا جاتا تھا اور اس دوکان کے مالک سے ایک خاص رقم وصول کر لی جاتی تھی جو
ہمی گفتگو یا نیلام کے ذریعہ سے مقرر کی جاتی تھی۔ جب پنچایت کی جانب سے کوئی تہوار منایا
جاتا۔ تو اس میں جلوس نکالے جاتے اور مختلف اقسام کے باجے بجائے جاتے اور رنگ رلیاں منائی
تی تھیں۔ ڈھاکہ میں سب سے بڑا تیوہار جنم اشٹمی تھا جو کرشن جی کی پیدائش کے روز بڑی دھوم
عام اور تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ جنم اشٹمی کے روز سارے شہر میں خوشی منائی جاتی
ر پنچایت کے ممبران کرشن جی مہاراج کی زندگی کے مختلف پہلو کا ڈراما کرتے اور بڑے ذوق
شوق اور دلی جوش کے ساتھ گاتے بجاتے تھے۔ 1845ء میں جب ڈھاکہ میں پارچہ بافی کے
عروج کے زمانہ میں کس قدر روپیہ خرچ کیا جاتا ہوگا۔

یہ بات بھی قابل تذکرہ ہے کہ فرانس اور ہالینڈ کی طرح ہندوستان میں مذہبی اصلاح کو سب
سے اوّل جولاہوں نے قبول کیا۔ چنانچہ مسلمانوں کی فتوحات کے بعد جب رامانج اور رامانند نے
جو گشتی واعظ تھے۔ ہندو مذہب میں چند اصلاحات کے وعظ کہنے شروع کئے۔ تو سب سے اوّل
ڈھاکہ کے ہندو جولاہوں نے اُن کی تعلیم کو قبول کیا۔ اور صرف خود ہی معتقد نہیں بن گئے۔ بلکہ ان
مذہبی اصلاحات کی نشر و اشاعت میں اپنی امکانی قوّت اور وسائل صرف کر ڈالے۔ اگرچہ ابھی تک وہ
وشنوی مت کو مانتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ ذات پات کی قیود سے آزاد ہیں اور جدید
اصلاحات پر بڑے ذوق و شوق سے عمل کرتے ہیں۔

مسٹر بین اپنی کتاب کے صفحہ 74 پر تحریر کرتے ہیں کہ:

''پارچہ بافی کی اندرونی حالت خصوصیت کے ساتھ بیان کرنے کے لائق ہے۔ اکثر
حضرات کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں تقسیم عمل کا اصول رائج نہ تھا۔ ہندوستان میں پارچہ بافی کی
جو پنچایتیں یا انجمنیں قائم ہوئی تھیں اُن کے ابتدائی زمانہ میں نہ صرف ہندوستان بلکہ روئے زمین
کے کسی گوشہ میں بھی اشتراک عمل کا اصول رائج نہیں تھا۔ لیکن جب اس صنعت کو فروغ ہونے لگا،
کپڑے کی تیاری اُس کی مانگ اور تجارت میں بیشی ہونے لگی۔ اُس وقت سے پارچہ بافی کے
مختلف طریقے مختلف ماہرین فن کے سپرد کر دیئے گئے۔ اور اس کی وجہ سے کپڑے کے بڑے
بڑے دساوروں میں تقسیم عمل کا اصول رائج ہو گیا۔''

ڈھاکہ میں نفاست پر زیادہ توجہ کرنے سے پارچہ بافی کا کام نہایت پیچیدہ اور دشوار ہو گیا۔ اور عام قابلیت کے علاوہ خاص خاص قسم کی ہنرمندی اور قابلیت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اور مختلف قسم کے پارچہ کی تیاری کے واسطے جداگانہ قابلیت کے اعتبار سے جولاہوں کی کئی ذاتیں قائم ہو گئیں۔ اس لئے تقسیم عمل کے رواج سے اس کی خصوصیت صرف پارچہ بافی یا کسی دیگر صنعت اور کسی خاص مقام تک محدود نہیں رہی۔ اور ہم اس سے قبل عرض کر چکے ہیں کہ ہندوستان میں مختلف قسم کے پارچہ کی تیاری کے واسطے جداگانہ مرکز قائم ہو گئے تھے۔ ازاں جملہ بنگال، کھمبات، ساحل کارومنڈل کی پارچہ بافی کی حالت بیان کر دی گئی ہے۔ اور پارچہ بافی کے مرکزی علاقہ کے اندر بھی مختلف کاموں کے علیحدہ علیحدہ مقامات تھے۔ مثلاً سُنار گنج چکن سازی کے لئے۔ ڈمروئی نہایت باریک تار کے لئے۔ اور ٹیٹ باڑی۔ جنگل باڑی اور بازید پور نفیس ململ سازی کے مرکز تھے۔ اسی طرح بکرم پور میں سوت اور ریشم دونوں کا کپڑا۔ کلوکوپا اور جلالپور وغیرہ میں موٹا کپڑا تیار ہوتا تھا۔

پارچہ بافی کی اندرونی کیفیت بیان کرنے سے سب سے اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں سرمایہ اور مزدوری کے تعلقات کیا اور کیسے تھے۔ دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی نہ صرف پارچہ بافی بلکہ ہر ایک دستکاری کی یہ حالت تھی کہ کاریگر اپنے ذاتی سرمایہ اور اپنی ذاتی محنت سے مال تیار کرتا اور اپنے ہی گاؤں یا قصبہ میں کسی گاہک کے ہاتھ خود فروخت کرتا تھا۔ کاریگر اپنے فن کا اُستاد ہوتا اور اُس کے پاس دو تین اُمیدوار کام سیکھتے تھے۔ ان اُمیدواروں کو اُستاد کاریگر نہایت قلیل وظیفہ بھی دیا کرتا تھا۔ لیکن یہ حالت زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہی۔ کیونکہ جب غیر ملکوں سے ہندوستانی کپڑے کی مانگ بڑھنے لگی اور باہر کی فرمائشات کی تعمیل کے لئے کثیر مقدار میں کپڑا تیار کرنے کی ضرورت لاحق ہو گئی۔ اُس وقت کپڑے کی تیاری کا کل انتظام کرنا کاریگروں کی بساط سے باہر ہو گیا۔ اور اُن کی آزادی سلب ہو گئی۔ کیونکہ اب اس کام کے لئے معقول سرمایہ لگانے اور بہت سے دستکاروں سے کام لینے کی ضرورت اور پیش ہوئی۔ اس لئے ساہوکار یا مہاجن آ موجود ہوئے۔ اُنہوں نے اپنا سرمایہ اس کام میں لگایا اور تیار ہونے پر مال فروخت کرنا شروع کر دیا۔ کاریگر اپنے گھروں میں کپڑا بُنتے تھے۔ اور تیار ہو جانے پر مہاجن کو دیدیتے۔ کاریگروں کو مہاجن زر پیشگی دیتا اور سوت وغیرہ بھی اپنی دوکان سے دیدیتا تھا۔ اور پھر

مال اُن سے قلیل نفع پر خرید کو خود فروخت کرتا تھا۔ مہاجن کے یہاں کئی ملازم ہوتے تھے۔ جو جولاہوں کے مکان پر جا کر اُنہیں روپیہ تقسیم کرتے تھے۔ اور بعض ملازمان گشت کر کے اس کا اندازہ کرتے تھے کہ جن کاریگروں کو پیشگی روپیہ دیا گیا ہے۔ وہ اپنے وعدہ کے بموجب کپڑا تیار کر رہے ہیں یا نہیں۔

سولھویں اور سترھویں صدی میں جب ہندوستانی کپڑے کی تجارت فروغ پر تھی۔ اُس وقت کپڑے کی تجارت کرنے والے بعض بڑے بڑے مہاجن تھے جو تیار شدہ مال اپنے گودام میں جمع کر لیتے تھے۔ اور پھر باہر کی فرمائشات کے بموجب اس مال کو جہازوں میں لدوا کر روانہ کر دیتے تھے۔

یہ مہاجن زیادہ تر سودخور بنئے ہوتے تھے۔ اور ہندوستان میں یہ قوم اپنی سنگدلی اور حرص و لالچ کے لئے کافی شہرت رکھتی ہے۔ کپڑے کی تجارت میں یہ مہاجن کمیشن ایجنٹ کے طور پر کام کرتے تھے۔ اصل تاجر یورپین یا مسلمان یا ایشیائی عیسائی تھے۔ جو ان مہاجنوں سے کپڑا خرید کر اپنے اپنے ملک کو روانہ کر دیتے تھے۔

اگرچہ سرمایہ لگانے سے مہاجنوں کو جولاہوں پر بہت کچھ قابو حاصل ہو گیا۔ اور بعض مقامات پر تو اُن کی حالت ملازمان سے بھی بدتر تھی۔ لیکن ان مہاجنوں نے کاریگر نوکر رکھ کر خود اپنے کارخانے قائم کرنے کا کبھی خیال نہیں کیا۔

لیکن ہندوستان میں شاہانِ مغلیہ نے کارخانے قائم کر دیئے تھے۔ اور اس قسم کے صنعتی کارخانوں کا تذکرہ ابوالفضل نے آئین اکبری میں کئی جگہ کیا ہے۔ برنیر نے 1666ء میں جب ہندوستان کی سیاحت کی تو اُس نے اکثر مقامات پر بڑے بڑے کارخانے دیکھے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ''ایک ہال یعنی کارخانہ میں زردوز تھے۔ دوسرے ہال میں سُنارا اور سادہ کار اور تیسرے میں نقاش اور مصوّر اور متعدد ہالوں میں ریشمی چکن بنانے والے اور نفیس تن زیب تیار کرنے والے تھے۔ اور ان سب دستکاروں کی نگرانی کے لئے ایک افسر مامور تھا۔ جو ہر ایک صنعت کا مبصّر اور ماہر تھا۔''

1800ء میں یہ شاہی کارخانے ڈھاکے میں موجود تھے۔ ان کو ملبوس خانہ کہتے تھے۔ کیونکہ ان کارخانوں میں ملبوس خاص یعنی شاہی لباس کے واسطے اعلیٰ درجہ کا کپڑا تیار ہوتا تھا۔

ان کارخانوں کی نگرانی اور انتظام کے لئے داروغہ مامور تھے۔ جو دہلی سے بھیجے جاتے تھے۔ اور ان میں سے بعض ملازمان کے متعلق یہ شکایت بھی سُنی گئی ہے کہ وہ نارواسختی کرتے تھے۔ اور کاریگروں کو اُن کے کام کی نوعیت اور اُن کی محنت کے لحاظ سے معاوضہ کم دیتے تھے۔ جولاہے خواہ اپنے سرمایہ سے کپڑا تیار کرتے یا مہاجن کے روپیہ سے دونوں صورتوں میں اُن کی قدیم روش قائم رہی۔ جولاہے کا سارا گھر اسی کام میں لگا رہتا تھا۔ اُس کی بیوی سوت کاتتی تھی۔ لڑکے جب کام سیکھ کر ہوشیار ہو جاتے تو وہ اپنے باپ کے ساتھ کام کرتے۔ اور اگر کام زیادہ ہوتا تھا تو دو تین اُمیدوار رکھ لئے جاتے۔ ان میں سے تانا تننے والے کو ڈیڑھ دو آنے اور کپڑا بننے والے کو تین یا چار آنہ یومیہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ اُمیدواروں کو دوپہر کا کھانا جولاہا کھلاتا تھا۔ اور اُن کے ساتھ اپنے لڑکوں جیسا سلوک کرتا تھا۔ وہ ہرگز آجکل کی فیکٹری کے ملازمان جیسا برتاؤ نہیں کرتا تھا۔

جولاہے کے پاس عموماً دس گیارہ سال کی عمر کے لڑکے کام سیکھتے تھے۔ ان شاگردوں کو کم از کم پانچ سال تک اپنے اُستاد کے پاس رہنا ہوتا تھا اور وہ ان کو اپنی اولاد سمجھتے اور اپنے لڑکوں جیسا برتاؤ کرتے تھے۔ علاوہ روزانہ کی اُجرت کے ان شاگردوں کو دو آنہ سے لے کر ساٹھ آنہ ماہوار تک جیب خرچ اور دیا جاتا تھا۔

ہندوستان کے سوتی کپڑے کے خلاف جب انگلستان میں شورش برپا ہوئی۔ اُس وقت اکثر اہلِ قلم نے اس شورش کی یہ وجہ بیان کی کہ ہندوستان کے کاریگر بڑے جفاکش ہیں اور وہ تھوڑی سی خوراک پر زندگی بسر کر لیتے ہیں۔ ایسے کاریگروں سے انگلستان ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کا یہ جواب دیا کہ ہندوستان میں زیادہ تر سوتی کپڑا تیار ہوتا ہے اور اُس کا مقابلہ اونی کپڑے سے ہرگز نہ ہوگا۔ اس لئے ہندوستان کے کپڑے کے خلاف شورش کسی طرح زیبا نہیں ہے۔

انگریزی تجارت کے انتظامات

اپنے مضمون کے اس آخری حصہ میں ہم مفصل طور پر بیان کریں گے کہ ہندوستانی کپڑے کی تجارت سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے کس طرح نفع اُٹھایا۔ اس کمپنی نے کپڑے کی

تیاری کے دساوروں میں اپنی فیکٹریاں قائم کیں۔ جن کو تجارتی گودام کہنا زیادہ موزوں ہے۔ لیکن ان گوداموں کے قائم کرنے کے وقت ابتدا میں زیادہ تر سیاہ مرچ شورہ قلمی اور تیل کی تجارت ہوتی تھی اور اس کی خاص وجہ یہ ہوئی کہ ستر ہویں صدی کے شروع میں ململ اور چھینٹ نے انگلستان میں رواج اور مقبولیت عامہ حاصل نہیں کی تھی۔ البتہ اس زمانہ میں بھی بعض انگریزی سیّاح و تاجر ہندوستان کے نفیس کپڑے لے جاتے تھے۔ اور انگلستان میں وہ بہت بھاری قیمت پر فروخت ہو جاتے تھے۔

لیکن 1680ء سے انگلستان میں ہندوستان کے سوتی اور ریشمی کپڑے کی مانگ بہت زیادہ بڑھ گئی۔ اس لئے اب کمپنی نے اس کو نفع بخش تجارت تصور کر کے ململ اور چھینٹ کی تیاری اور خرید میں خوب جی کھول کر اپنا روپیہ لگانا شروع کر دیا۔

جس زمانہ کا ہم تذکرہ کر رہے ہیں اُس وقت یعنی 1680ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تین فیکٹریاں یا تجارتی گودام سورت مدراس اور ہُگلی میں قائم ہوئے تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک فیکٹری کا سارا انتظام ایک کونسل اور ایک پریسیڈنٹ کے متعلق تھا۔ اور کمپنی کی ضرورت و ہدایت کے بموجب یہ فیکٹریاں ہندوستانی سامان خریدتی تھیں۔ اور ان فیکٹریوں یا گوداموں کے ماتحت چھوٹی فیکٹریاں یا گودام تھے۔ جو کاریگروں سے براہ راست مال خریدتے تھے۔ اس طرح کمپنی نے سارے ہندوستان میں اپنے گوداموں کا جال بچھا دیا تھا۔ بالخصوص یہ گودام بنگال اور ساحل کارومنڈل پر بہت زیادہ تھے۔ تقریباً ہر ایک گاؤں میں جہاں کپڑا تیار ہوتا تھا۔ کمپنی کا ایک گودام قائم تھا۔ جس پر ایک کلرک مامور کر دیا گیا تھا۔ یہ کلرک کمپنی کی طرف سے یا تو براہ راست جولاہوں سے یا کسی دلال کی معرفت کپڑا خریدتا تھا۔ کاریگر نمونہ کے مطابق چھوٹے گودام میں کپڑے کے تھان لاتے تھے اور پھر کمپنی کا کلرک۔ جانچدار (مبصّر) کی مدد سے اس کے دام لگاتا تھا۔ اور جب زیادہ مقدار میں مال جمع ہو جاتا تھا تو وہ بڑے یا مرکزی گودام میں بھیج دیا جاتا تھا جہاں سے وہ انگلستان* روانہ کر دیا جاتا تھا۔

چونکہ کمپنی کے ملازمان کے لئے کاریگروں سے براہ راست لین دین کرنا نہایت دشوار کام تھا۔ اس لئے کسی دلال کی معرفت خرید ہوتی تھی۔ اور یہ دلال کمپنی سے یا تو زیادہ رقم وصول کر لیتا یا کاریگروں کو کم قیمت دیتا تھا۔ چونکہ ہندوستان کے جولاہے بہت غریب تھے۔ اس لئے

وہ اپنے ذاتی سرمایہ سے کسی کے لئے کپڑا تیار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے کمپنی گماشتوں کی معرفت جولاہوں کو زر پیشگی دیتی تھی۔ یہ گماشتے کمپنی کے ملازم تھے۔ اور کمپنی اپنا ہی روپیہ بطور زر پیشگی تقسیم کرتی تھی۔ ان گماشتوں سے نقد ضمانت لی جاتی تھی۔ چونکہ وہ روپے کا لین دین کرتے تھے۔ لیکن کمپنی کو بعض اوقات مالی نقصانات برداشت کرنا پڑتے تھے۔ چونکہ یہ گماشتے کمپنی کو دھوکا دیتے اور تیار شدہ مال کاریگروں سے وصول کر کے دوسرے تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیتے۔ اور اپنے اور اپنے افسران کو یہ رپورٹ کر دیتے کہ مال نمونے کے مطابق نہ تھا۔ خراب تھا۔ اس لئے واپس کر دیا گیا۔ بعض اوقات گماشتے یہ چالاکی اور بے ایمانی کرتے کہ وہ جانچدار (مبصّر) سے مل جاتے اور اُس کو تھوڑا سا لالچ دے کر مال کے دام 30-40 فیصدی کم لگاتے تھے اور اگر جولاہے اس قدر کم قیمت لینے سے انکار کرتے یا اس میں کچھ عذر اور حجت کرتے تو گماشتے اُنہیں یہ دھمکی دیتے کہ یہ کمپنی کا معاملہ ہے اور وہ تمہاری بُری طرح خبر لے گی۔ تم مصیبت میں پھنس جاؤ گے۔ اب جولاہے بے بس ہو جاتے اور اُسی قیمت پر صبر کر لیتے تھے۔ جولاہے غریب اور حاجتمند ہونے کی وجہ سے زر پیشگی اپنے صرفہ میں لے آتے۔ اس لئے جب مزید رقم کی ضرورت ہوتی تو گماشتے تو اپنی من مانی نہایت سخت شرائط جولاہوں سے طے کر کے اُنہیں مزید رقم دیتے تھے۔

اس لئے کمپنی نے اپنا یہ طریقہ تبدیل کر دیا۔ اور اب اُس نے دادنی تاجروں سے معاملہ کر لیا جو مقررہ اوقات پر مال فراہم کرنے کے ذمہ دار قرار دیئے گئے۔ لیکن اس طریقہ میں بہت سی خرابیاں محسوس ہوئیں۔ اور کمپنی کو اپنی اس تجویز میں بھی بہت کچھ ناکامی اور مایوسی ہوئی۔

اس کے بعد کمپنی نے اور بہت سے طریقے خریداری کے تجویز کئے لیکن ہر ایک میں درمیانی شخص کی ٹانگ اڑی رہی بالآخر کمپنی نے بہت سے کاریگر طلب کر کے اپنے مرکزی گوداموں کے نواح میں آباد کئے تاکہ وہ کاریگروں سے براہ راست معاملہ کر سکے ان کو مذہبی آزادی پورے طور پر عطا کی گئی۔ اور سامان خورد نوش و کپڑے کی تیاری کے واسطے ہر قسم کا سامان حاصل کرنے کے لئے اُن کو ہر قسم کی سہولتیں اور آسانیاں بہم پہنچائی گئیں۔

گورنر طامس پٹ نے یہ طرز عمل اختیار کیا کہ اُس نے ہر قسم کا سوت مختلف مقامات سے خرید کر جمع کر لیا اور قلعہ فورٹ سینٹ جارج کے نواح میں جو کاریگر آباد تھے۔ اُن میں یہ سوت

نہایت نرم شرائط پر تقسیم کر دیا۔ اس خبر کی شہرت ہونے پر دور دور سے جولاہے آ کر وہاں آباد ہو گئے اور بہت جلد مدراس پارچہ بافی کا مرکز بن گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے منتظمین نے طامس پٹ کی اس کارروائی کی اس درجہ قدر دانی کی کہ اُنہوں نے دیگر پریسیڈنسیوں کے حکام کو ہدایت کی کہ ’’آپ صاحبان طامس پٹ کی پالیسی پر عمل کریں اور دستکاروں کی اچھی طرح حوصلہ افزائی کی جائے اور اُنہیں مقررہ اُجرت سے زیادہ معاوضہ دیا جائے۔‘‘

اس جدید پالیسی کے نہایت عمدہ نتیجے برآمد ہوئے۔ اور مدراس، بمبئی و کلکتہ میں جو گمنام دیہات تھے۔ اس پالیسی پر عمل ہونے سے ترقی کر کے ہندوستان کے بڑے شہر بن گئے۔ اور اگر اس پالیسی پر عملدرآمد نہ ہوتا تو مدراس بمبئی اور کلکتہ کی ایسی حالت نہ ہوتی جیسی کہ اس وقت موجود ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے کپڑے کی نکاسی کے واسطے نہ صرف زبردست منڈیاں معلوم کر کے اس صنعت کو حتی الامکان بہت کچھ فروغ دیا۔ بلکہ جو کاریگر اُس کے علاقہ میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ان کی ہر طرح خبر گیری اور حفاظت کی۔ جو اس پُر آشوب زمانہ میں بڑی نعمت تھی۔ چنانچہ اس کے متعلق کمپنی کے نظماء کے سرکاری مراسلوں میں بہت سی ہدایات درج ہیں۔ اور اس زمانہ کے ان سرکاری کاغذات سے بمبئی کی تدریجی ترقی کا حال بالتفصیل معلوم ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نظماء کے مراسلہ مورخہ 7- اپریل 1684ء میں درج ہے کہ ’’حکام سورت کو چاہئے کہ وہ بمبئی میں چھینٹ تیار ہونے کی ترغیب دیں۔ اگرچہ وہ شروع میں بھدی ہوگی۔ لیکن بہت جلد نفیس قسم کی چھینٹ بمبئی میں تیار ہونے لگے گی۔ بروج سے سستی روئی خرید کر غریب جولاہوں میں تقسیم کر دی جائے اور وہاں چاول کے ذخائر جمع کر کے جولاہوں کو بمبئی میں آباد ہونے کی ترغیب دی جائے۔‘‘ 1668ء میں جب چارلس دوم نے بمبئی ایسٹ انڈیا کمپنی دیا تھا۔ اُس وقت یہ مقام صرف مچھلی کے شکار کا ایک موضع تھا۔ لیکن اب وہ ایک زبردست تجارتی شہر بن گیا۔

سرکاری مراسلات جلد ہفتم کے صفحہ 208 پر درج ہے کہ کمپنی کے نظماء نے پردہ سازی کی دستکاری جاری کرنے پر بہت زور دیا۔ کیونکہ ان کی رائے میں اس دستکاری سے نہ صرف کمپنی نفع اُٹھائے گی بلکہ اس سے مدراس کے باشندوں کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ اسی طرح بمبئی کے حکام نے

موزہ سازی کی حوصلہ افزائی کی جو اُس وقت زیادہ تر گوا میں ہوتی تھی۔ اس کے بعد کمپنی نے اپنی نوآبادیوں میں ٹسر سازی جاری کرنے کے لئے بیحد کوشش کی۔ کمپنی کے نظماء کے پیشِ نظر تو قومی فائدہ تھا۔ اُنہوں نے اپنے ملازمان کو تحریر کیا کہ ٹسر سازی سے ہماری بحری تجارت اور جہاز رانی کو بہت کچھ نفع پہنچے گا۔ کیونکہ اس وقت ٹسر کا سارا مال ہالینڈ، فرانس، جرمنی اور فلینڈرز سے انگلستان میں آتا ہے جس سے ہمارے ملک کی دولت کو نقصان پہنچتا ہے۔ اور ان ممالک کی دولت مندی میں اضافہ ہوتا ہے۔ نظماء کے مدنظر ہر وقت اپنی قوم اور ملک کا مالی نفع تھا۔ چنانچہ ایک مراسلہ میں اُنہوں نے اپنے ملازمان کو یہ نصیحت کی تھی کہ ''چونکہ آپ حضرات ہماری کمپنی کے ملازم ہیں اس لئے آپ کو صرف کمپنی کے مالی فائدہ کا خیال نہ کرنا چاہئے۔ بلکہ آپ کو یہ امر بھی ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ آپ انگریز اور محب وطن بھی ہیں۔''

اس ہدایت کا حسب دلخواہ نتیجہ برآمد ہوا اور چند ماہ کے بعد ہی کمپنی کے ملازمان نے ٹسری کپڑا اتیار کر کے روانہ کر دیا۔ جس کی بہت کچھ تعریف ہوئی۔

اگرچہ کمپنی نے ہندوستان کی صنعت پارچہ بافی کو فروغ دینے کے لئے بہت کچھ کوشش کی۔ لیکن اس کے واسطے جو طریقہ اختیار کیا گیا تھا اُس کو موجودہ اصطلاح میں ہمدردی کے نام سے موسوم نہیں کر سکتے۔

کمپنی کے ملازمان انگلستان سے کپڑے کے نمونے منگواتے تھے۔ اور ہندوستانی جولاہوں اور چھیپیوں کو ہدایت کرتے تھے کہ وہ ان نمونوں کے مطابق کپڑا اتیار کر دیں۔ علاوہ بریں اُنہوں نے انگلستان سے چند کاریگر طلب کر لئے تھے۔ جو ہندوستانی کاریگروں کو کپڑا بُننے اور رنگنے کا طریقہ سکھاتے تھے۔ اور اس کے تذکرے سے سرکاری مراسلات کی جلدیں بھری پڑی ہیں۔ ہندوستانی جولاہوں کی رہنمائی کے واسطے وہ ہر سال کپڑے کے نئے نمونے انگلستان سے منگواتے تھے۔

لیکن اس کارروائی سے ہندوستان کے جولاہوں کو کچھ زیادہ نفع نہیں پہنچا۔ چونکہ جو نمونے انگلستان سے آتے تھے وہ ہندوستان کے کپڑوں کی نقل ہوتے تھے۔ اور ہندوستانی جولاہے اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ انگریز کس قسم کے بیل بوٹے پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ 1683ء میں کمپنی کے نظماء نے گورنر بمبئی کو ہدایت کی کہ ''اپنے یہاں کے جولاہوں کو آپ وہ

بیل بوٹے بنانے دیجئے جن کو وہ خود خوشنما اور موزوں تصور کرتے ہیں۔ کیوں کہ انگلستان کے کپڑے کی نقل کے مقابلہ میں خود ہندوستان کے جولاہوں کے بنائے ہوئے بیل بوٹے یہاں پر زیادہ پسندیدہ نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور ان ہی کی زیادہ قدر ہوتی ہے۔ الغرض اسی قسم کی ہدایتیں انگلستان سے برابر موصول ہوتی رہیں اور 1731ء میں کمپنی کے نظماء نے گورنر بمبئی کو صاف الفاظ میں لکھ دیا کہ ''ہندوستانی جولاہوں کو اپنی مرضی کے مطابق کپڑا تیار کرنے دو۔ کیونکہ اُن کے تیار کیئے ہوئے کپڑے اُن نمونوں سے ہزار درجہ بہتر اور خوشنما ہوتے ہیں جو ہم یہاں سے روانہ کر سکتے ہیں۔''

انگلستان سے وقتاً فوقتاً کپڑا بُننے والے۔ رنگساز اور ریشم ساز ہندوستان بھیجے گئے۔ تاکہ وہ ہندوستانی کاریگروں کو اپنے یہاں کا طریقہ سکھائیں۔ لیکن اس تجربہ میں قطعی ناکامی ہوئی۔ اور یہ کاریگر بہت جلد انگلستان کو واپس بلوا لیئے گئے بالآخر 1687ء میں نظماء کمپنی نے گورنر بنگال کو تحریر کیا کہ ''مدت دراز تک تجربہ کرنے کے بعد کمپنی کو معلوم ہوا ہے کہ ریشم ساز اور رنگ ساز کے مصارف کا بار کمپنی پر بہت زیادہ پڑ گیا اور وہ ہندوستان میں بالکل بے مصرف ثابت ہوئے۔ اس لیئے آپ کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ہمارے بھیجے ہوئے کاریگروں کو فورٹ ولیم میں طلب فرما کر بہت جلد یہاں واپس بھیج دیجئے۔''

یہ بیان کرنا بھی دلچسپی کا موجب ہوگا کہ جو کاریگر انگلستان سے آئے تھے وہ صرف ٹسر سازی جانتے تھے۔ لیکن ہندوستان کے جولاہوں کے مقابلہ میں وہ سوتی پارچہ بافی کے کام میں طفل مکتب ثابت ہوئے۔ کیونکہ اُس وقت سوتی پارچہ بافی میں ہندوستانی جولاہوں نے اس قدر کمال حاصل کر لیا تھا کہ دنیا بھر میں اُن کی دستکاری کی مثال ملنا قطعی ناممکن تھا۔

لیکن اس واقعہ نے کمپنی کے مخالفین کے ہاتھ میں ایک اور ہتھیار دیدیا۔ اور بہت سے حضرات نے اپنی قوم اور ملک کی خیر خواہی اور ہمدردی کا ثبوت دینے کے واسطے کمپنی پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ ملک کی صنعت کی مخالف ہے اور ہمارے یہاں کے کاریگروں کی کچھ قدر نہیں کرتی۔ اور اس کے برعکس وہ ہندوستانی کاریگروں کی بیحد قدر و منزلت کرتی ہے۔ اور ہر طرح اُن کی دستگیری اور حوصلہ افزائی کرتی ہے۔'' لیکن کمپنی کے مخالفین کے اس قسم کے خیالات اس غلط فہمی پر مبنی تھے۔ چونکہ وہ ہندوستانی کاریگروں کی صناعی سے واقف ہی نہ تھے۔ علاوہ بریں ان

حضرات کے خیالات زیادہ تر سُنی سُنائی روایتوں پر مبنی تھے۔ جن کی کچھ اصلیت نہیں تھی۔ اس لئے اس مخالفت سے کمپنی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا اور وہ بدستور ہندوستانی کاریگروں کی صناعی سے مالی فائدہ اُٹھاتی رہی اور ہندوستانی کاریگروں کی قدر و منزلت اور اُن کی ہر طرح پر اعانت و دستگیری کرتی رہی۔

❁❁❁❁❁

تحقیق کے نئے زاویئے

مغل حرم

ڈاکٹر مبارک علی

حرم کا تصور مشرق اور مغرب میں جدا جدا ہے۔ مسلم دنیا میں جب اس اصطلاح کو استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد تقدس، پاکیزگی اور عزت سے تعلق ہوتا ہے۔ امراء، اور بادشاہوں کے خاندان کے لئے اس کو استعمال کیا جاتا تھا، اور اس کو احترام سے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر حرم کی یہی اصطلاح اہل یورپ میں بالکل متضاد معنوں میں استعمال ہونے لگی۔ ایک ایسی جگہ جہاں خوبصورت عورتیں ہوں، اور جہاں محض نفسانی و جنسی لذت کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ اس تصور کو ابھارنے اور مقبول بنانے میں یورپی سیاحوں، مورخوں اور ادیبوں نے حصہ لیا، کیونکہ اس کے ذریعہ وہ اپنی تحریروں کو یورپی قارئین میں مقبول بنانا چاہتے تھے۔

اس تصور کو مقبول بنانے میں عیسائی مشنریوں کا بھی ہاتھ ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ وہ یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ اہل مشرق عموماً اور مسلمان خصوصاً اخلاقی طور پر گرے ہوئے ہیں اور حرم ان کی جنسی خواہشات پورا کرنے کا مرکز ہے۔ اگرچہ اب سنجیدہ مورخوں نے اس موضوع پر تحقیقی کام کیا ہے، اور تاریخی طور پر اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، مگر حرم کا جو تصور اہل یورپ میں قائم ہو چکا ہے، وہ ابھی تک اسی طرح سے موجود ہے۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اب بعض ہندوستانی مورخ بھی مغل حرم کے بارے میں بازار کی افواہوں، گپ شپ، اور غیر تاریخی مواد پر کتابیں لکھ رہے ہیں، کیونکہ سنسنی خیز مواد کی بنا پر شہرت حاصل کی جائے۔ اس قسم کی ایک کتاب آر۔ ناتھ کی ''پرائیویٹ لائف آف دی مغلز 1526-1803'' ہے۔ جس نے بغیر تحقیق کے بے سروپا باتیں لکھ کر تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے۔

لہٰذا خوشی کی بات ہے کہ اس موضوع پر سنجیدگی سے تحقیق کے بعد روبی لال نے Domesticity and Power in The Early Mughal World (Cambridge 2005) لکھی ہے۔ اس میں صرف حرم کی زندگی یا عورتوں کی سماجی و ثقافتی و سیاسی سرگرمیوں کے بارے میں ہی ذکر نہیں ہے، بلکہ حرم کے حالات کو مغل ریاست کے تناظر میں بیان کر کے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مغل حرم کی تاریخ لکھنا انتہائی مشکل ہے کیونکہ معاصر تاریخوں میں اس بارے میں بہت کم مواد ہے۔ اس لئے شاہی خواتین کی نجی زندگی اور ان کا ریاست کے معاملات میں دخل، اس مواد کو اکٹھا کر کے پھر اس کا تجزیہ کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ اگرچہ مغلوں کی ابتدائی تاریخ میں ان کے خاندان اور خاندانی سرگرمیوں کے بارے میں بہت کچھ معلومات مل جاتی ہیں، خصوصیت سے گلبدن بیگم کی ''ہمایوں نامہ'' انتہائی خوبصورت تحریر ہے۔ جس سے مغل حرم کی اندرونی سرگرمیوں کی جھلکیاں ملتی ہیں، اگرچہ بعد میں، اکبر کے آتے آتے مغل حرم اونچی دیواروں اور پہرے داروں کے پیچھے گم ہو جاتا ہے۔

بابر اور ہمایوں کے حرم کے بارے میں معلومات کی بنیاد بابر نامہ، اور گلبدن کی کتاب ''ہمایوں نامہ'' میں ہے، ان معلومات کی بنیاد پر جو حرم کی تشکیل ہوتی ہے، اس میں ایک بات جو نمایاں ہے وہ یہ کہ خاندان میں عورتوں میں درجہ بندی تھی، اس درجہ بندی میں جن عورتوں کا تعلق بادشاہ کی ذات سے ہوتا تھا، وہ زیادہ مراعات یافتہ ہوتی تھیں۔ خاص طور سے بزرگ خواتین کی عزت کی جاتی تھی۔ بابر اور ہمایوں جب بھی وقت ملتا تھا خاندان کی ان خواتین سے ملاقات کرتے تھے اور ان کے آرام کا خیال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب ہمایوں نے ان خواتین سے ملنے میں دیر لگائی تو انہوں نے اس کی شکایت کی، جس پر ہمایوں نے معذرت کی۔

چونکہ ابتدائی دور میں بابر اور ہمایوں دونوں ہی کو پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، اور انہیں بہت کم وقت ملا کہ جب وہ سکون سے ایک جگہ رہ سکیں، اس لئے چاہے سفر ہو، یا میدان جنگ، ان دونوں صورتوں میں حرم کی خواتین ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ اس لئے ایسے مواقع بھی آئے کہ جب یہ خواتین دشمنوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئیں۔ مثلاً اکبر کی بہن خانزادہ بیگم سمرقند کے محاصرے کے وقت شیبانی خاں کے قبضہ میں آئی، اور اس نے شادی کر لی۔ دوسرے واقعہ میں چوسہ کی جنگ

میں بیگا بیگم شہر شاہ کے قبضہ میں آئی، جس نے بعد میں عزت واحترام سے اسے واپس ہمایوں کے پاس بھیج دیا۔ خانزادہ بیگم، شیبانی کی وفات کے بعد، دس سال گذارنے کے بعد واپس آئی، تو بابر نے اس کا بڑی خوشدلی اور عزت سے استقبال کیا۔ اس قسم کی مغل تاریخ میں اور مثالیں بھی ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب یہ عورتیں واپس آتی تھیں تو ان پر بدنامی کا کوئی داغ نہیں لگتا تھا۔ مغل خاندان میں انہیں اسی عزت کے ساتھ واپس لے لیا جاتا تھا۔

جیسا کہ ہربنس مکھیا نے اپنی کتاب ''مغلز آف انڈیا (2005)'' میں لکھا ہے کہ مغلوں کے ابتدائی دور میں عورتیں کافی حد تک آزاد تھیں۔ وہ مردوں کے شانہ بہ شانہ سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں۔ اپنی رائے کا اظہار پوری طرح سے کرتی تھیں، جس کی مثال حمیدہ بانو ہے، کہ جس نے ابتداء میں ہمایوں سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

لیکن اکبر کے آتے آتے مغل حرم کا نقشہ بدل گیا، اس کی ایک وجہ تو اکبر کا ہندوستانی رسم ورواج کو اختیار کرنا اور دوسری وجہ ریاست کے دوسرے اداروں کی طرح حرم کے ادارے کی بھی تشکیل تھی کہ جس میں سخت قسم کے اصولوں وقوانین اور ضوابط ترتیب دیئے گئے تھے۔ ابوالفضل حرم کو ''شبستان اقبال'' کے نام سے موسوم کرتا ہے، اور اس بارے میں آئین نمبر 15 میں لکھتا ہے کہ:

> جہاں پناہ نے ایک بہت بڑا حصار تعمیر فرمایا ہے اور اس احاطے کے اندر آرام دہ اور دلچسپ مکانات بنوائے ہیں۔ اگرچہ پانچ ہزار عورتیں ان مکانوں میں رہتی ہیں لیکن قبلہ عالم نے ہر عورت کو جداگانہ کمرہ اور مکان عنایت کیا ہے۔ جہاں پناہ نے حرم سرا کی عورتوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر کے ہر فرد کو عمدہ خدمت پر مامور کیا ہے اور برابر ان کی نگہداشت فرماتے رہتے ہیں۔ بیشمار پارسا عورتیں ان کی نگہبانی کے لئے بطور داروغہ مقرر ہیں...... مختصر یہ کہ شاہی دفتروں اور سلطنت کے محکموں کی طرح حرم سرا میں بھی انتظام وباقاعدگی پائی جاتی ہے......
>
> حرم سرا کے باہر خواجہ سراؤں کا پہرہ ہے اور ان سے مناسب فاصلہ پر باوقار اور قابل اعتماد راجپوتوں کا ایک گروہ پاسبانی کا کام انجام دیتا ہے۔

> راجپوتوں کے بعد حصار کے دروازوں پر بھی جفاکش و راستباز پاسبان پہرے کے لئے مقرر ہیں۔ ان نگہبانوں کے علاوہ حصار کے پہروں کے چاروں طرف احدی و دیگر اہل فوج مرتبہ بمرتبہ نگہبانی کرتے ہیں۔

ابوالفضل کی اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر کے آتے آتے مغل حرم اونچی فصیلوں اور پہروں میں گھر گیا تھا، اب عورتوں کی آزادی ختم ہوگئی تھی۔ اب معاصر مورخ بھی شاہی حرم کی عورتوں کے نام نہیں لیتے ہیں، اور جیسا کہ روبی لال نے لکھا ہے کہ بچے کی پیدائش اور اس موقع پر ہونے والی تقریبات کا تو ذکر ہوتا ہے، مگر یہ ذکر نہیں ہوتا کہ اس کی ماں کون ہے؟ اگر لڑکا پیدا ہوتا تھا تو اس کی پیدائش پر زیادہ خوشیاں منائی جاتی تھیں، مگر لڑکی کی پیدائش کا محض تذکرۃً ذکر ہوتا تھا۔ اب عورتیں بادشاہ کی ''عزت و حرمت'' کی علامت بن گئیں تھیں۔ اس لئے ان کے لئے باعصمت، عفت اور پاکیزہ ہونا لازمی تھا۔ بابر اور ہمایوں کے زمانے میں ان کی جو آزادی تھی، اب اس پر قدغنیں لگ گئیں تھیں۔

اکبر کی شادیوں کے سلسلہ میں روبی لال نے لکھا ہے کہ اول تو اس نے وسط ایشیا سے آنے والے خاندانوں میں شادی کی، جس کا مقصد تھا کہ اپنی خاندانی روایات کو مضبوط رکھا جائے۔ دوسرے اس نے راجپوت خاندانوں میں شادیاں کر کے اپنی سیاسی حیثیت کو مستحکم کیا۔ ان دونوں صورتوں میں عورتیں بادشاہ اور سلطنت کے مفادات میں استعمال ہوئیں۔

اکبر نے اپنے خاندان کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ''کوکا'' خاندان کے افراد کو بھی شامل کر لیا تھا۔ ان کی شمولیت کی وجہ سے مغل سلطنت کو کوکا یا اتگہ خاندان سے انتہائی وفادار اور قابل اعتماد افراد ہے کہ جنہوں نے مغل سلطنت کے استحکام میں حصہ لیا۔ اکبر اپنے رضاعی رشتہ داروں کی ناز و نخرے بھی برداشت کرتا تھا، عزیز خاں کوکہ جو کہ اکثر اپنی حرکتوں سے اکبر کو ناراض کرتا تھا، مگر اکبر ہر بار یہی کہا کرتا تھا کہ ''میرے اور اس کے درمیان دودھ کی نہر بہہ رہی ہے۔''

اکبر کے زمانہ میں دو خواتین نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک اس کی ماں حمیدہ بانو بیگم تھی اور دوسری اس کی پھوپھی گلبدن بیگم، حمیدہ بانو بیگم، اکبر کو نصیحت بھی کرتی تھی، سمجھاتی بھی تھی، اور وقت ضرورت اہم معاملات میں صلاح و مشورے بھی دیا کرتی تھی۔ مثلاً اکبر کے ابتدائی

عہد میں جب زعفرانی لباس پہننے پر اسے صدر الصدور عبدالنبی نے اپنے عصا کے ذریعہ اس کے لباس کو چھیڑا اور اسے خلاف شریعت کہا تو اکبر ناراض ہوا اور اس کی شکایت اپنی ماں سے کی۔ اس پر حمیدہ بانو نے یہ کہہ کر اس کی تسلی کی کہ دنیا تمہاری ہی عزت کرے گی کہ بادشاہ ہوتے ہوئے تم نے ایک ملاّ کی جھڑکی سنی۔ شہزادہ سلیم کی بغاوت کے وقت، اکبر کے غصہ کو ٹھنڈا کر کے اور صلح و صفائی کروانے میں بھی حمیدہ بانو، گلبدن بیگم، اور سلیمہ سلطان بیگم کا ہاتھ تھا۔ اکبر اپنی ماں کی بہت عزت کرتا تھا، اور کم ہی ایسا ہوتا تھا وہ اس کی بات کو ٹالتا ہو۔

اکبر کے عہد میں پہلی مرتبہ حرم کی بزرگ خواتین جن میں گلبدن بیگم شامل تھیں، حج پر گئیں۔ اکبر نے ان خواتین کو تمام سہولتیں فراہم کیں۔ ان کے حج کے بارے میں اور وہاں کے قیام کے بارے میں دلچسپ تفصیلات نعیم الرحمان فاروقی نے اپنی کتاب میں لکھی ہیں جو کہ مغل اور عثمانی سلطنت کے درمیانی سیاسی روابط پر ہے۔

روبی لال کی اس کتاب سے مغل عہد کے ابتدائی دور میں خواتین کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ اور یہ بات واضح ہو کر آتی ہے کہ جب تک مغل سلطنت مستحکم نہیں ہوتی تھی۔ بابر اور ہمایوں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے یا کیموں میں اپنا وقت گذار رہے تھے، اس وقت شاہی خاندان کی عورتیں ان کی تمام سرگرمیوں میں ان کے ساتھ تھیں۔ مگر اکبر کے عہد میں جیسے ہی مغل سلطنت مستحکم ہوتی ہے، سلطنت کے ادارے تشکیل پاتے ہیں، اسی کے ساتھ حرم بھی ایک ادارہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ بچوں کی پیدائش، شادہ بیاہ، تہوار، اور رسومات ان سب کے لئے قاعدے قوانین بنا دیئے جاتے ہیں۔ عورتوں کی آزادی پر بھی پابندیاں لگا دی جاتی ہیں۔ باہر کی عورتوں سے تعلقات پر بھی پابندی ہوتی ہے۔ بقول ابوالفضل کہ:

> اگر امراء کی بیگمات یا دیگر باعصمت عورت حرم شاہی میں حاضر ہو کر سعادت باریابی حاصل کرنے کی خواہشمند ہوتی ہیں۔ تو یہ عورتیں پہلے بیرون حرم کے عہدے داروں کے پاس درخواست پیش کرتی ہیں۔ وہاں سے جواب یا صواب حاصل کرنے کے بعد حکام محلات کی خدمت میں معروضہ کرتی ہیں۔ اس کارروائی کے بعد قابل اعتماد اور باعصمت عورت کو حرم میں داخل ہونے کی اجازت دی جاتی ہے۔

حرم کی اس تشکیل میں، جو ڈسپلن قائم کیا گیا تھا، اس میں عورتیں مکمل طور پر اسیر ہو کر رہ گئیں تھیں۔ ابوالفضل بار بار عورتوں کے لئے ''باعصمت'' ''باعفت'' اور قابل اعتماد ہونے پر زور دیتا ہے، خانہ بدوش سے مستقل رہائش کے اس سفر میں شاہی خاندان کی عورت نے اپنی آزادی کھودی۔

❁❁❁❁❁

تقسیم کے بعد کا سندھ

ڈاکٹر مبارک علی

1947 میں تقسیم کے نتیجہ میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والا صوبہ سندھ ہے، جو سیاسی، سماجی اور معاشی طور پر مسائل کا شکار ہوا، ان مسائل کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سندھ کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے، کیونکہ ان مسائل کا تعلق تسلسل کے عوامل میں بھی ہے۔ سارا انصاری، جو اس سے پہلے "سندھی پیر اور برطانوی راج" کتاب لکھ چکی ہیں، اب انہوں نے *Life after Partition : Migration, Community and Strife in Sindh 1947-1962 (2005)* لکھی ہے۔ اس کتاب میں اول وہ سندھ کی ابتدائی تاریخ کا جائزہ لیتی ہیں، اور پھر اسی تسلسل کو قائم رکھتی ہیں تقسیم ہند کے نتیجہ میں جو صورت حال پیش آئی اس کا تجزیہ کرتی ہیں۔

سندھ ابتداء ہی سے مختلف قبیلوں کا ہجرت کر کے آنا اور یہاں آ کر آباد ہونا، تاریخ کا حصہ رہا ہے ان قبائل نے سندھ میں اپنی حکومتیں بھی قائم کیں، جن میں سومرو، سمہ، کلہوڑہ، اور ٹالپر قابل ذکر ہیں۔ یہ قبائل دریائے سندھ کے ساحل پر آباد ہوتے تھے اور کاشتکاری کے ذریعہ اپنی روزی کا بندوبست کرتے تھے۔ لہٰذا سندھ کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں میں اپنی قبائلی شناخت بہت گہری ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قبیلہ کی بنیاد پر اس کی ذات کی حفاظت تھی، اس کے بعد دوسری شناختیں آتی تھیں۔ ان قبائل میں بالائی سندھ میں سرائیکی بولنے والے موجود تھے، جب کہ زیریں سندھ میں سندھی بولنے والے سماٹ، یا سندھی قبائل تھے۔

چونکہ قبائلی نظام میں وڈیرے یا سردار کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے، اس لئے قبیلہ کا ہرفرد اپنے سردار یا وڈیرے کا وفادار تھا۔ اس کے بعد اس کی سماجی زندگی قبیلہ کے رسم ورواج کی پابند تھی۔

سارا انصاری کے مطالعہ کے تحت سندھ کا گاؤں مستقل نہیں ہوتا تھا۔ یہاں گھاس پھوس کی جھونپڑیاں یا گھر ہوتے تھے، جس کی وجہ سے اس کی جگہ بدلتی رہتی تھی (شمالی ہند میں گاؤں کی حیثیت مستقل ہوا کرتی تھی) اس لئے لوگوں کا تعلق گاؤں سے نہیں ہوا کرتا تھا۔ سندھ کی آبادی کی اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی، اور یہ دیہاتوں میں رہتے تھے۔ جب کہ شہروں میں ہندوؤں کا تسلط تھا، جن میں عامل اور بنئے شامل تھے۔ ان میں سے اکثر نانک پنتھی یا غیر خالصہ سکھ تھے، جنہوں نے شیومت اور وشنومت کو اس سے ہم آہنگ کر دیا تھا۔ اس وجہ سے سندھ کے ہندو سماج میں ذات پات کی وہ سختی نہیں تھی جو کہ شمالی ہندوستان میں تھی۔

سارا انصاری، سندھ کی سیاست پر بحث کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ سندھ دہلی، کابل اور قندھار کے ماتحت رہا۔ 1843 میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا۔ مگر بحیثیت ایک خودمختار صوبے کے یہ چار سال ہی رہا کیونکہ 1847 میں اسے بمبئی کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔ کولونیل دور حکومت میں سندھ میں سیاسی طور پر تبدیلیاں ضرور ہوئیں۔ کراچی جس پر انگریزوں نے 1838 میں قبضہ کر لیا تھا۔ اب اسے ایک بندرگاہ کی حیثیت سے ترقی دی جس کی وجہ سے یہ شہر تجارت کا ایک مرکز بن گیا اور یہاں پارسی، اسماعیلی، بوہرہ اور کچھی میمن آ کر آباد ہوئے جنہوں نے کراچی شہر کو ایک خوبصورت شہر بنا دیا۔

لیکن کولونیل دور میں شہر اور دیہات کا فرق قائم رہا۔ یہ فرق اس وجہ سے اور زیادہ محسوس ہوا کیونکہ دیہات میں رہنے والے زیادہ تر مسلمان تھے جب کہ شہروں میں ہندو تھے، جو تعلیم یافتہ اور تاجر پیشہ تھے لہٰذا جب بھی مسلمان شہروں میں آتے تو وہ اس ماحول میں خود کو اجنبی پاتے تھے۔

1932 میں سکھر بیراج کی تعمیر نے سندھ پر کئی اثرات ڈالے۔ ایک تو اس بیراج کی تعمیر کی وجہ سے سندھ کی زراعتی پیداوار بڑھی۔ اس کے قریب جو شہر تھے ان کی آبادی میں اضافہ ہوا، اور چھوٹی صنعتوں کو فروغ ہوا۔ دوسرے یہ کہ اس کی وجہ سے مکینک اور مستریوں کا طبقہ وجود میں آیا۔ کپاس اور اناج کی زائد پیداوار جب صوبہ سے باہر جانے لگی تو اس سے اندرون سندھ کی زندگی پر اثر ہوا۔ چونکہ بیراج نے زراعتی زمین میں اضافہ کر دیا تھا اور آب پاشی کا نظام بہتر ہوا تھا اس لئے اندرون سندھ میں خوش حالی آئی، مگر اس کے ساتھ ہی ایک اہم تبدیلی یہ آئی کہ یہاں پر زمینوں پر حکومت کی جانب سے پنجابیوں کو آباد کیا گیا، کیونکہ اہل برطانیہ کا یہ خیال تھا سندھی وڈیرہ اور ہاری دونوں سست و کاہل ہیں، چونکہ انہوں نے بیراج کی تعمیر میں بہت پیسہ لگایا ہے اس لئے انہیں ایسے کاشتکاروں کی ضرورت ہے کہ جو محنتی ہوں تاکہ پیداوار کے ذریعہ حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ اس نے سندھ میں سندھیوں اور پنجابیوں کے درمیان فرق کو پیدا کیا۔

سندھ کی سیاست میں ایک اہم تحریک سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کی تھی۔ ابتداء میں ہندو اور مسلمان دونوں سیاسی راہنما اس کے حامی تھے، لیکن بعد میں ہندو اس سے علیحدہ ہو گئے اور یہ سندھ کے مسلمانوں کی تحریک ہو کر رہ گئی۔ 1935 کے ایکٹ میں اس علیحدگی کو تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن ہندوستان میں فرقہ واریت کی جو فضا تھی اس سے سندھ بھی متاثر ہوا۔ جب پاکستان سے الحاق پر سوال ہوا تو 26 جون 1947 کو سندھ اسمبلی نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔

تقسیم ہند کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ سندھ کے ہندوؤں نے خود کو غیر محفوظ سمجھنا شروع کر دیا، اس عدم تحفظ کے احساس نے انہیں سندھ چھوڑنے پر مجبور کیا۔ سندھ کے چھوڑنے سے نہ صرف وہ اپنا سرمایہ ساتھ لے گئے، بلکہ اس کی وجہ سے تاجر اور پروفیشنل طبقہ بھی سندھ سے چلا گیا۔

سیاسی راہنماؤں کو اس کا اندازہ نہیں تھا کہ تقسیم کے نتیجہ میں اس قدر بڑے پیمانے پر آبادی کی منتقلی ہو گی، اس لئے جب ایک جانب سے ہندو گئے اور دوسری جانب سے مہاجرین کی آمد شروع ہوئی تو اس نے سندھ کے سماج پر گہرے اثرات ڈالے۔ اس نے لوگوں کے ذہنوں

میں کئی سوالات پیدا کئے۔ کیا ہندوؤں کے جانے سے جو تعلیمی، سماجی اور معاشی خلاء پیدا ہوگا اسے آنے والے مہاجرین پُر کرسکیں گے؟ اور کیا ان کے آنے اور یہاں آباد ہونے سے سندھ کو فائدہ ہوگا؟ اس وجہ سے سندھ کے چیف منسٹر ایوب کھوڑو نے مہاجرین کی آمد پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا۔ سندھ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن نے یہ نعرہ لگایا کہ سندھ، سندھیوں کے لئے ہے۔ سندھ کی حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ ہندوؤں کے جانے سے جو آسامیاں خالی ہوئی ہیں ان پر سندھیوں کا تقرر کیا جائے۔

اگرچہ اس مرحلہ پر اس بات کی بھی کوششیں ہوئیں کہ سندھیوں اور مہاجروں میں ملاپ ہو، اور یہ آپس میں مل جل کر رہیں، مگر مقامی اور غیر مقامیوں کے درمیان اختلافات شروع ہو چکے تھے ان میں اس وقت اور اضافہ ہوا کہ جب 1948 میں پنجاب میں مہاجرین کیمپ کو خالی کرا کے، وہاں کے مہاجرین کو سندھ میں آباد کردیا گیا۔ لہٰذا وقت گزرنے کے ساتھ جو صورت حال سامنے آئی اس میں شہروں میں اردو بولنے والوں کی تعداد زیادہ ہوگئی جب کہ دیہاتوں میں سندھی اور پنجابی تھے۔

آبادی کی منتقلی کے نتیجہ میں جائیدادوں کا جھگڑا شروع ہوگیا۔ اس سلسلہ میں کلیمز میں جو جائیدادیں مہاجروں کو ملیں، اس پر کافی اعتراضات اور تنقید ہوئی۔ سندھیوں کو اس بات کا بھی خطرہ تھا کہ تعلیم یافتہ مہاجر ملازمتوں اور سیاست پر قابض ہوجائیں گے اس طرح وہ پس ماندہ ہوتے چلے جائیں گے۔ کراچی کا صوبہ سندھ سے چھن جانا اور اسے پاکستان کا کیپٹل بنانا بھی سندھ کے لوگوں کو ناگوار گذرا تھا۔ لہٰذا ان مسائل نے سندھ کو کئی گروپوں اور جماعتوں میں تقسیم کردیا۔

سارا انصاری نے سندھیوں اور آنے والے مہاجرین کے درمیان مذہبی فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سندھ کے لوگ روایتاً پیروں اور اولیاء کو ماننے والے تھے یہ درگاہوں پر حاضری دیتے تھے، مذہبی طور پر رواداری کے قائل تھے، تقسیم سے پہلے مسلمان اور ہندو دونوں ہی عرسوں

کے موقعوں پر شریک ہوتے تھے اور ایک ایسی مذہبی روایت کو مانتے تھے کہ جس میں تنگ نظری نہیں تھی۔ اس کے مقابلہ میں نئے آنے والے علماء کے زیر اثر تھے اور ان کا تعلق شمالی ہندوستان میں مذہب کی اصلاحی تحریکوں سے تھا، اس لئے ان میں سے اکثر پیروں اور قبر پرستی کے خلاف تھے۔ شہروں میں علماء کا اثر ورسوخ بڑھ گیا، ان کے مدارس اور فرقوں کی مسجدوں میں، ہر عالم اپنے فرقہ کی تعلیمات پر زور دیتا تھا۔ یہ علماء کا اثر تھا کہ 1950 کی دہائی میں سرکاری پارٹیوں میں شراب پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔

1952 میں جب سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ایڈیٹر فرید جعفری نے مولویوں اور مذہبی انتہا پسندی پر لکھا تو اس کے خلاف علماء نے زبردست احتجاج کیا، بالآخر اسے استعفیٰ دینا پڑا۔ علماء کے اثر ورسوخ کی ایک مثال کراچی میں 1952 میں احمدیوں کے خلاف ہونے والے فسادات ہیں۔ لہٰذا دیہاتوں میں سندھی پیروں کے زیر اثر تھے تو شہروں میں لوگ علماء کے تسلط میں تھے۔

سارا انصاری نے ون یونٹ کے سندھ کی سیاست پر اثرات اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بے چینی پر تبصرہ کیا ہے۔ اور اس پر بھی کہ ایوب خاں نے کیوں پاکستان کے کیپٹل کو کراچی سے اسلام آباد منتقل کردیا۔

کتاب کے آخر میں سندھی و مہاجر تضادات کا تجزیہ کرتے ہوئے، اس کا کہنا ہے کہ سندھ میں مہاجر اپنی مذہبی وسماجی روایات کے ساتھ آئے، اس لئے وہ سندھ کے سماج میں جو ان کے لئے نیا اور اجنبی تھا، اس میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ سندھیوں کو اتنی بڑی تعداد کے آنے اور آباد ہونے کے بعد اس بات کا شدید خطرہ محسوس ہوا کہ ان کی زبان اور کلچر خطرے میں پڑ گیا ہے، لہٰذا اس کے تحفظ کی ضرورت ہے۔ اس نے ان میں سندھی ثقافت کو گہرا کردیا۔ ایک خاص بات یہ بھی ہوئی کہ تقسیم سے پہلے سندھی اور بلوچی دو علیحدہ شناختیں تھیں، مگر اب مہاجرین کی آمد نے ان دونوں کو آپس میں ملا دیا اور ان کے مفادات کو ایک کردیا۔

مہاجرین نے مسلم لیگ کے پروپیگنڈے کے ذریعہ جو ذہن بنایا تھا وہ یہ تھا کہ ہندوستان کے تمام مسلمان ایک واحد کمیونٹی کی طرح ہیں، لیکن جب وہ اس ذہن کے ساتھ سندھ میں آئے

توانہوں نے دیکھا کہ ایسا نہیں ہے سندھ کے لوگ مسلمان تو ہیں مگر کلچرل میں ان سے جدا اور مختلف ہیں۔

اگر اس تاریخی پس منظر میں سندھ کے مسائل پر غور کیا جائے تو ان کی پیچیدگی کو سمجھا جا سکتا ہے، اور اگر کھلے ذہن کے ساتھ ان کا حل ڈھونڈا جائے تو شاید وہ بھی نکل سکتا ہے۔

❁❁❁❁❁

تاریخ کے بنیادی ماخذ

مآثر عالمگیری

مصنف: محمد ساقی مستعد خاں
ترجمہ: مولوی محمد فدا علی طالبؔ

خلاصہ دس سالہ واقعات

مرتب محمد کاظم صاحب مصنف عالمگیر نامہ

بعد حمد و نعت کے محمد ساقی مصنف ''مآثر عالمگیری'' عرض کرتا ہے کہ یہ سوچ کر کہ جس طرح میں نے حضرت خلد مکاں عالمگیر بادشاہ غازی کے چالیس سالہ احوال کو تاریخ کی صورت میں جمع کیا ہے، اسی طرح اگر میں دس سالہ سوانح عہدِ عالم گیری مرتبہ مرزا محمد کاظم صاحب، عالم گیر نامہ کا ایک اجمالی خلاصہ بھی کر دوں تو اس سے دو فائدے حاصل ہوں گے اوّل یہ کہ یہ خلاصہ میری تصنیف کا مقدمہ بن کر اُسے مکمل کر دے گا، دوسرے یہ کہ جو حضرات عہد معدلت مہد کے پورے پچاس سالہ واقعات سے واقفیت حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ آسانی سے اپنی مطلب براری کر سکیں گے، خدا کا شکر ہے کہ عمر نے وفا اور وقت نے میری مدد کی اور میں نے اپنی خواہش کے مطابق ضروری واقعات کا انتخاب کر کے بہترین طریقہ پر اس کام کو انجام دیا۔

قبل جلوس کے وہ واقعات جو فرمانروائی کا باعث ہوئے

چونکہ خدا کی مشیت یہی تھی کہ دنیا ایک نئے فرماں روا کے عدل وانصاف سے بہرہ ور ہو کر آبادو معمور ہو، اس لئے جو حادثہ پیش آتا تھا وہ اس حکمران کی آنے والی حکومت کا مقدمہ بن کر عہد معدلت کی نیک ساعت کو روز بروز قریب کرتا جاتا تھا، ان سوانح کا اجمالی بیان یہ ہے کہ ساتویں ذی الحجہ 1067 ہجری (1658ء) کو حضرت صاحب قران ثانی شاہ جہاں بادشاہ غازی کا جو اس کے بعد سے اعلیٰ حضرت کے نام سے یاد کئے جائیں مزاج ناساز ہوا۔

داراشکوہ کی حیلہ سازیاں

اعلیٰ حضرت پر مرض کا غلبہ ہوا اور امور سلطنت کی طرف توجہ کرنے سے مجبور ہو گئے، اعلیٰ حضرت کے فرزند اکبر داراشکوہ نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ممالک محروسہ کے تمام راستے بند کر دیئے، تاکہ ہر قسم کی خبروں کی ناکہ بندی ہو جائے۔ داراشکوہ کے اس طرز عمل سے سارے ملک میں بے چینی پیدا ہو گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اعلیٰ حضرت کے فرزند چہارم شاہزادہ مراد بخش صوبہ دار گجرات نے خود مختاری کا اعلان کیا اور حضرت کے فرزند دوم شاہ شجاع حاکم بنگالہ نے بھی مراد بخش کی تقلید کی، اور پٹنہ پر حملہ آور ہوا، داراشکوہ چونکہ حضرت جہاں پناہ سے سب سے زیادہ قریب تھا اس لئے وہ ہر ممکن طریقہ سے اعلیٰ حضرت کو جہاں پناہ کی طرف سے بدظن کرتا تھا، داراشکوہ نے طرح طرح کی حیلہ سازیوں سے اعلیٰ حضرت کو مجبور کیا اور بادشاہ نے اس لشکر کو جو عالمگیر کے ہمراہ تھا اپنے پاس طلب کر لیا، شاہزادہ داراشکوہ کی ان تمام حکمت عملیوں کا منشاء یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت کی

حیات ہی میں سب سے پہلے شجاع اور مراد کا کام تمام کرے اور اس کے بعد اطمینان کے ساتھ دکن کی مہم کو بھی سر کر کے جہاں پناہ کو بھی اپنے راستے سے ہٹا دے، داراشکوہ اپنے ارادہ کو پورا کرنے کے لئے اعلیٰ حضرت کو جب وہ شدید بیمار تھے دہلی سے آگرہ لایا اور راجہ جے سنگھ کو بادشاہی افواج اور اپنے ذاتی لشکر کے ساتھ اپنے فرزند سلیمان شکوہ کی سرداری میں شجاع کے مقابلہ میں روانہ کیا، اسی زمانہ میں داراشکوہ نے راجہ جسونت سنگھ کو جو اعلیٰ حضرت کی والدہ ماجدہ کا قریبی رشتہ دار تھا اور جو اس اعزازی قرابت کی وجہ سے بے حد معزز و صاحب اعتبار ہو کر مہاراجہ کے خطاب سے سرفراز اور راجگان ہندوستان میں سب سے بلند پایہ تھا، ایک جرار لشکر کے ہمراہ مالوہ کی طرف روانہ کیا، اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ جسونت سنگھ مالوہ میں اپنی افواج کے پرے جما کر جہاں پناہ کا سد راہ ہو، داراشکوہ نے قاسم خاں کو ایک علیحدہ فوج کے ساتھ مہاراجہ کے ساتھ اُجین روانہ ہونے کا حکم دیا اور اسے سمجھا دیا کہ اگر موقع و مصلحت دیکھے تو اُجین سے مراد بخش کی تباہی اور بربادی کا ارادہ کر کے گجرات کا رُخ کرے، داراشکوہ کی حیلہ سازیوں سے اعلیٰ حضرت کا دل جہاں پناہ کی طرف سے بدگمان ہو گیا۔ عیسیٰ بیگ وکیل سرکار کا مال و متاع بلا کسی جرم کے ضبط کیا گیا اور غریب عیسیٰ کو قید خانہ میں ڈال دیا گیا، لیکن چند روز کے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ وہ بے قصور ہے تو عیسیٰ نے زندان اسیری سے نجات پائی، داراشکوہ کے اطوار و عادات میں جو بات سب سے زیادہ جہاں پناہ کو ناپسند تھی وہ اس کی ہندو پرست طبیعت تھی، جس کی وجہ سے داراشکوہ ہندو مذہب پر مائل اور اس کے رسم و رواج کو جاری کرنے میں ہر وقت کوشاں رہتا تھا، جہاں پناہ دین و دولت کی حفاظت کو سب پر مقدم سمجھتے اور یہ ارادہ کیا کہ اعلیٰ حضرت کی ملازمت حاصل کریں، ساتھ ہی ساتھ جہاں پناہ کا یہ بھی ارادہ تھا کہ شاہزادہ مراد بخش کو جو جاہلانہ روش کا شیدائی اور اس زمانہ میں جہاں پناہ کے سایہء عاطفت میں پناہ گزیں تھا اپنے ہمراہ لیتے جائیں، بادشاہ کو اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ جسونت سنگھ اور قاسم خاں جہاں پناہ کے سدّ راہ ہو کر مقابلہ کریں گے اس لئے احتیاطاً سامانِ حرب کو ساتھ لے کر غرۂ جمادی الاوّل 1068 ہجری (1658ء) کو اورنگ آباد سے برہان پور روانہ ہوئے، اور

پچیس ماہ مذکور کو برہان پور پہنچ گئے۔ برہان پور پہنچ کر جہاں پناہ نے ایک عریضہء عیادت اعلیٰ حضرت کے حضور میں روانہ کیا، لیکن ایک مہینہ تک اس خط کا کوئی جواب نہ آیا بلکہ وحشت ناک خبریں برابر پہنچتی رہیں، داراشکوہ کی تحریک سے جسونت سنگھ برابر سرکشی کر رہا تھا جہاں پناہ نے پچیس جمادی الآخر روز شنبہ کو برہان پور سے آگرہ کی طرف کوچ کیا، اکیس رجب کو جب کہ جہاں پناہ نے دیپال پور سے کوچ فرمایا تو اثنائے سفر میں شاہزادہ مراد بخش نے جو جہاں پناہ کے دامنِ عاطفت میں پناہ لینے کے لئے بادشاہ کے پاس آ رہا تھا سعادت ملازمت حاصل کی جہاں پناہ نے موضع دھرمات پور میں (جو اجین سے سات کوس کے فاصلہ پر واقع ہے) قیام فرمایا، دھرمات پور سے ایک کوس کے فاصلہ پر جسونت سنگھ اور قاسم خاں بھی آمادۂ پیکار خیمہ زن تھے، ان نامرادوں نے اپنی بساط سے قدم آگے بڑھایا، اور جہاں پناہ سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوئے، جہاں پناہ کی رگِ حمیت کو حرکت ہوئی اور انہوں نے مبارک دن یعنی یومِ جمعہ بائیس رجب 1068 ہجری (1658ء) کو لڑائی کی صفیں درست کرنے کا حکم دے کر طبل جنگ بجوایا۔

جسونت سنگھ اور قاسم خاں کی شکست

جسونت سنگھ نے پوری جہالت سے کام لیا اور وہ بھی اپنی صفیں درست کر کے میدان جنگ کے لئے سوار ہوا، دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا اور اگرچہ ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور راجہ کے سپاہی بادل کی طرح میدان جنگ پر چھائے ہوئے تھے، لیکن شاہی فوج نے اپنی شمشیر زنی سے ہندو سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کیا، مسلمانوں کی تلوار و خنجر نے ایسا ہندوؤں کو ذبح کیا کہ جسونت سنگھ نے ناموس وعزّت کو جان پر قربان کیا اور معدودے چند سپاہیوں کے ہمراہ میدانِ جنگ سے بھاگا، اور سیدھا اپنے وطن مارواڑ پہنچ گیا، قاسم خاں کا بھی یہی حال ہوا اور سردار مع تمام سپاہیوں کے سلامتی جان پر سب کو مقدم سمجھے اور معرکہء کارزار سے فرار ہو گئے، شاہی لشکر کو فتح ہوئی، اور غنیم کا تمام مال و اسباب جہاں پناہ کے اہل لشکر کے قبضہ میں آیا، بادشاہ نے حکم دیا کہ

حریف کے مقتولوں کی عدد شماری کی جائے، شاہی حکم کی تعمیل کی گئی اور معلوم ہوا کہ حریف کے چھ ہزار سپاہی کام آئے، جہاں پناہ نے یکم رمضان المبارک کے دن دریائے چنبل کو عبور کیا اور معلوم ہوا کہ داراشکوہ دھولپور سے مقابلہ کے لئے آ رہا ہے۔

داراشکوہ کی پہلی شکست

قبلہء عالم 6- رمضان المبارک کو داراشکوہ کے لشکر کے قریب پہنچے، اور حریف سے ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر مقیم ہوئے، داراشکوہ بھی اسی دن سوار ہوا اور اپنے لشکر سے تھوڑی دور آگے بڑھ کر ایک جگہ کھڑا ہوا لیکن اقبال اور ہیبت عالم گیری نے اسے ایسا ششدر و حیران کیا کہ اپنی جگہ سے ایک قدم بھی نہ ہل سکا، داراشکوہ نے صبح سے شام تک اپنے سپاہیوں کو دھوپ میں ایسا جلایا کہ سپاہیوں کی ایک خاصی تعداد گرمی اور پیاس سے راہی عدم ہوئی، داراشکوہ شام کے قریب اپنے قیام کو واپس گیا۔ دوسرے دن جہاں پناہ نے دارالملک آگرہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا، داراشکوہ نے عین کوچ کی صبح کو یعنی ساتویں رمضان کو پھر اسی مقام پر جہاں کہ گذشتہ روز آ کر کھڑا ہوا تھا اپنی صف بندی شروع کی اور مقابلہ کی غرض سے عسکر جہاں پناہی کی طرف بڑھا طرفین سے توپ و تفنگ سر ہونے لگیں، اور لڑائی کا بازار گرم ہوا، داراشکوہ کے امراء میں رستم خاں، راؤ ستر سال اور راجہ رائے سنگھ راٹھور جیسے بڑے بڑے سرداران فوج قتل کئے گئے، اور باوجود اس کے کہ داراشکوہ کے پاس ابھی ایک گروہ امراء کا موجود تھا لیکن وہ ایسا مضطرب و پریشان ہوا کہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوا، داراشکوہ کے اس نامناسب طرز عمل نے سارے لشکر کو بے چین و مایوس کر دیا اور سپاہی میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے، اقبال شاہی نے اپنا کام کیا اور جہاں پناہ کو فتح حاصل ہوئی۔

اس معرکہ میں حریف کے سرداران لشکر وافسران فوج جس کثرت سے کام آئے اس کی نظیر دنیا کے کسی معرکہ میں نہیں ملتی، جب افسروں کا یہ حال ہوا کہ ان کے کشتے حد شمار سے باہر ہیں تو

معمولی سپاہیوں کی تعداد کا کیا ٹھکانہ، جہاں پناہ کی فوج میں افسران لشکر میں سوائے اعظم خاں المعروف بہ ملتفت خاں کے اور کوئی ضائع نہیں ہوا اور یہ امیر بھی ہوا کی حدّت اور گرمی کی شدت سے فوت ہوا، نہ کہ حریف کے شمشیر و خنجر سے، داراشکوہ نے اس شکست کے بعد اپنے فرزند اور معدودے چند ملازمین کے ہمراہ دارالحکومت میں اپنے غم خانہ میں قیام کیا اور تین گھڑی رات گزرنے کے بعد دارالملک شاہجہاں آباد کو روانہ ہو گیا۔

فتح مند بادشاہ نے خدا کی درگاہ میں سجدۂ شکر ادا کیا اور دشمنوں کے قیام گاہ میں جا کر داراشکوہ کے خیمے میں جو اسی طرح قائم تھا، جلوس فرمایا، دوسرے دن شاہی فوج سموگر روانہ ہوئی، جہاں پناہ نے اس روز ایک معذرت نامہ اعلیٰ حضرت کے حضور میں روانہ کیا اور اس خط میں معرکہء کارزار برپا ہونے پر عذر کیا رمضان کی دسویں تاریخ کو جہاں پناہ اکبرآباد کے نواح باغ نور منزل میں وارد ہوئے، اعلیٰ حضرت نے بھی معذرت نامہ کا جواب بھیجا اور دوسرے دن ایک تلوار موسوم عالم گیر روانہ فرمائی، بارگاہ شاہی کے تمام ملازمین و امراء کے گروہ کے گروہ جہاں پناہ کے حضور میں حاضر ہوئے، اور ہر شخص ان میں سے اپنی حیثیت کے مطابق مرحمت شاہانہ سے سرفراز ہوا۔ بیسویں رمضان کو جہاں پناہ شہر میں وارد ہوئے اور داراشکوہ کے مکان میں قیام فرمایا۔ 21 رمضان کو جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ داراشکوہ دسویں رمضان کو دہلی پہنچ گیا ہے، بادشاہ کا ارادہ اعلیٰ حضرت کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا تھا اور داراشکوہ نے خفیہ خطوط سے اعلیٰ حضرت کو جہاں پناہ کی طرف سے بدگمان کر دیا تھا۔ عاقبت اندیش بادشاہ نے اپنا ارادہ ترک کیا اور بائیسویں رمضان کو دارالملک روانہ ہوئے، چوبیسویں رمضان کو جہاں پناہ گھاٹ سامی پر پہنچے، اور اسی جگہ داراشکوہ کی بابت متعدد خبریں پہنچیں، بادشاہ نے بتاریخ 30۔ رمضان بہادر خاں کو داراشکوہ کے تعاقب کے لئے مقرر فرمایا۔

شاہزادہ مراد بخش بھی حد اعتدال سے تجاوز کر چکا تھا اور تمام سامان سرکشی مہیا کر کے وقت اور موقع کی تاک میں بیٹھا تھا، جہاں پناہ، مراد بخش کے فتنہ کا فرو کرنا بھی ضروری سمجھے اور متھرا کی

منزل میں 2۔ شوال کو مراد بخش کو گرفتار کر لیا گیا بادشاہ نے مراد کو شیخ منیر کے سپرد کیا اور شاہزادہ شاہجہاں آباد کے قلعہ کو روانہ کر دیا گیا، جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ داراشکوہ لاہور روانہ ہوا ہے، اس خبر کو سن کر بادشاہ نے بھی پنجاب کے سفر کا مصمم ارادہ کر لیا۔

جلوس عالمگیری کا پہلا سال

1068ھ/1658ء

چونکہ نجومیوں نے یوم جمعہ غرۂ ذی قعدہ 1068 ہجری (1658ء) مطابق 11-امرداد کو ساعتِ نیک قرار دیا تھا اور اتنا وقت نہ تھا کہ حضرت سلطان دارالملک کے قلعہ میں داخل ہو کر اس کارِ نیک کو انجام دیں، اس لئے اس مبارک کام کو پورا کرنے کے لئے جہاں پناہ نے باغ اعزاباد میں چند روز توقف فرمایا اور اس ساعت نیک میں تخت حکومت پر جلوس فرما کر شاہزادوں منصب داروں اور تمام ملازمین پر جس خاص عزت کے ساتھ نوازش فرمائی اس کا اندازہ حد حساب سے باہر ہے، فصیحا نے بے مثال تاریخیں اس جلوس کی تہنیت میں نظم کیں، ان تاریخوں میں سید عبدالرشید تتوی کی بے مثل تاریخ:۔

"اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم."

حقیقتاً ایک بے نظیر تاریخ ہے ایک دوسرے شخص نے "سرافراز سریر بادشاہی" جلوس میمنت کی تاریخ کہی، جہاں پناہ نے اس جشن کے لوازم مختصر طور پر انجام دیئے اور اکثر مراسم کو جلوس ثانی تک ملتوی رکھا، اس وقت خطبہ وسکہ میں بھی کوئی تغیر نہ فرمایا۔ اور نہ اپنے لئے کوئی خاص لقب اختیار کیا۔ بلکہ ان امور کو بھی جلوس کے قبل جہاں پناہ نے ایک فوج خلیل اللہ خاں کی ماتحتی میں نامزد کی تا کہ یہ گروہ بہادر خاں کے ساتھ مل کر دریائے ستلج کے کنارے پہنچے اور جس طرح ممکن ہو دریا کو عبور کرے۔ اسی زمانے میں معلوم ہوا کہ سلیمان شکوہ دریائے گنگا کو عبور کر کے ہردوار کی طرف روانہ ہوا ہے اور اس کا ارادہ یہ ہے کہ جلد سے جلد سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا اپنے باپ سے جا ملے۔

داراشکوہ نے ایک بار اور سرکشی کی

پندرہویں ماہ مذکور کو بہادر خان کا معروضہ جہاں پناہ کے حضور میں پہنچا۔ جس سے معلوم ہوا کہ افواج شاہی نے دریائے ستلج کو عبور کیا اور داراشکوہ کے سپاہی مقابلہ نہ کر سکے اور سامنے سے فرار ہو گئے۔ اسی دوران میں یہ بھی معلوم ہوا کہ سلیماں شکوہ کوہستان کشمیر میں آوارہ پھر رہا ہے۔ جہاں پناہ نے اس لشکر کو جو سلیماں شکوہ کی مہم پر متعین کیا گیا تھا واپسی کا حکم صادر فرمایا۔

داراشکوہ لاہور پہنچا اور اس نے بیس ہزار سوار جمع کئے اور جب یہ سنا کہ بہادر خاں اور خلیل اللہ نے دریا کو عبور کر لیا ہے تو داراشکوہ نے ایک گروہ کثیر کو داؤد خاں کی ماتحتی میں دریائے بیاس پر مقرر کیا تا کہ یہ فوج بہادر خان اور خلیل اللہ خان کو آگے قدم نہ بڑھانے دے۔ داراشکوہ نے داؤد خاں کے بعد سپہر شکوہ کو بھی روانہ کیا۔

بادشاہ نے اس خبر کو سن کر راجہ جے سنگھ وغیرہ کو اس فتح مند لشکر کا پیش رو مقرر کیا۔ داراشکوہ کو جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی اور اس نے اپنے میں مقابلہ کی طاقت نہ پائی تو لاہور سے ملتان روانہ ہو گیا۔

اس زمانہ میں مہاراجہ جسونت سنگھ وطن سے واپس آیا اور شاہی بارگاہ میں اس نے بے حد عاجزی اور ندامت ظاہر کی۔ بادشاہ ذرہ پرور نے مہاراجہ کو شاہانہ نوازشوں سے سرفراز فرمایا اور اس کے قصور معاف کئے اور اسے پائے تخت جانے کی اجازت دی۔

چوبیسویں ذی الحجہ کو ہیبت پور پتی میں خلیل اللہ خاں وغیرہ کے خطوط سے معلوم ہوا کہ داراشکوہ ساز و سامان سے آراستہ ہو کر لاہور سے نکلا ہے اور اس کا ارادہ ہے کہ شاہی فوج سے مقابلہ کرے چونکہ شاہی لشکر کے افسروں سے بھی اس کے تعاقب میں کچھ سستی واقع ہوئی تھی اس لئے بادشاہ نے اس مرتبہ شاہزادہ محمد اعظم کو زائد لشکر اور کارخانہ جات کے ساتھ لاہور کی طرف بھیجا اور خود بھی جلد سے جلد حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو گئے اسی دوران میں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ فوج کا ایک گروہ کثیر اس سے جدا ہو چکا ہے اور نیز یہ کہ داراشکوہ کی پریشانی روز بروز ترقی پذیر ہے۔ جہاں پناہ نے یلغار کا ارادہ ترک کیا اور آسانی کے ساتھ سفر کی منزلیں طے کرنے لگے۔ بادشاہ نے ملتان تک کسی جگہ قیام نہ فرمایا۔ چوتھی محرم کو صف شکن خان ملتان سے داراشکوہ کے تعاقب میں

روانہ ہو چکا تھا لیکن اس پر بھی بادشاہ نے احتیاط کو مدنظر رکھ کر شیخ میر کو بھی نو ہزار سواروں کے ساتھ اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔

شاہ شجاع کی بغاوت

دارا شکوہ کا ہنگامہ بپا ہی تھا کہ جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ شاہ شجاع جو جلوس سے قبل جہاں پناہ سے متحد و متفق تھا بنگالہ سے باہر نکل کر مقابلہ کے لئے تیار ہے۔ بادشاہ اس خبر کو سُن بارہویں محرم کو ملتان سے واپس ہوئے چوتھی ربیع الاول کو پائے تخت کے قلعہ میں پہنچ گئے۔ اس درمیان میں شاہ شجاع کے فتنہ و فساد کی خبریں پے در پے بادشاہ کو پہنچیں۔ بادشاہ کا ارادہ تو یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو بھائی کی خطاؤں سے چشم پوشی فرمائیں لیکن شجاع نے قدم جسارت اور آگے بڑھایا اور حدود بنارس تک پہنچ کر جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔ بادشاہ نے مجبوراً حکم دیا کہ شاہزادہ محمد سلطان اٹھارہویں ربیع الاول کو اکبر آباد سے روانہ ہوں۔ جہاں پناہ کو متواتر خبروں سے معلوم ہوا کہ شاہ شجاع حدود بنارس سے آگے قدم بڑھانے کا ارادہ کر رہا ہے۔ بادشاہ نے مصلحت وقت کا لحاظ فرما کر شکارگاہ سوروں کے سفر کا تہیہ کیا تا کہ وہاں پہنچ کر شاہ شجاع کی آمد کا انتظار کریں اور اگر حریف پٹنہ کو واپس ہو تو اپنے لشکر کو بھی واپسی کا حکم صادر فرمائیں ورنہ شاہ شجاع کی مہم سر کرنے کی تیاری کریں۔ سولہویں ربیع الاول کو بادشاہ پائے تخت سے سوروں روانہ ہوئے۔ بیسویں تاریخ کو معلوم ہوا کہ مقدمہ لشکر انیس تاریخ کو اٹاوہ پہنچ گیا ہے جہاں پناہ شکار کھیلتے ہوئے سفر کی منزلیں طے کرنے لگے اور تیسری ربیع الثانی کو سوروں پہنچ گئے۔ جہاں پناہ یہ چاہتے تھے کہ شاہ شجاع کی مہم صلح و آشتی کے ساتھ طے ہو جائے۔ بادشاہ نے بھائی کو ایک نصیحت آمیز خط لکھا، اس سے مقصود یہ تھا کہ شجاع کے اصل ارادہ سے آگاہی ہو جائے، لیکن نامہ و پیغام کا کچھ نتیجہ نہ نکلا اور جہاں پناہ کو یقین کامل ہو گیا کہ خاطر و مدارات سے کام نہ نکلے گا۔ جہاں پناہ شجاع کے دفعیہ کے لئے تیار ہوئے اور پانچویں ماہ مذکور کو سوروں سے روانہ ہو گئے، بادشاہ نے شاہزادہ محمد سلطان اور مقدمۂ لشکر کو حکم دیا کہ جنگ آزمائی میں عجلت سے کام نہ لیں اور شاہی افواج کی آمد کا انتظار کریں، سترہویں ماہ مذکور کو بادشاہ قصبۂ کوڑہ پہنچے، شاہزادہ محمد سلطان مع مقدمۂ لشکر کے اس جگہ مقیم تھا، اور شاہ شجاع بھی کوڑہ سے چار کوس کے فاصلہ پر آمادہ بہ پیکار خیمہ زن تھا۔ معظم خاں جو شاہی حکم کے مطابق

خاندیس سے آستانہءشاہی کو آرہا تھا، اسی تاریخ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو گیا۔

شاہ شجاع کا مقابلہ

شاہ شجاع نے جنگ آزمائی کے لئے قدم آگے بڑھایا اور توپ خانہ اپنے سامنے آراستہ کر کے لڑنے کے لئے تیار رہا۔ شاہی لشکر کے کوڑہ پہنچنے کے تیسرے دن انیسویں ربیع الاول کو یوم یک شنبہ شاہنشاہی حکم صادر ہوا کہ شاہ شجاع کی فوج کے سامنے توپ خانہ لگا کر آتش بازی کی جائے اور افواج بادشاہی دشمن کے مقابلہ میں داد جاں نثاری دے کر حریف کو تباہ و پامال کریں۔

شاہی حکم کے مطابق لشکر کے گروہ کے گروہ جمع ہونے لگے اور نوّے ہزار فوج یک جا ہو گئی، جہاں پناہ نے حکم صادر فرمایا کہ لشکر شاہی و دولت خانہءمبارک اپنی جگہ سے نہ ہٹائے جائیں، اسی روز شاہ شجاع نے بھی اپنی فوج درست کی، چار گھڑی دن گزرنے کے بعد بادشاہ عالم پناہ نے حریف کے لشکر تک قدم رنجہ فرمایا، اور تین پہر دن گزرنے کے بعد شاہ شجاع کے قیام گاہ سے نصف کوس کے فاصلہ پر صف آراء ہوئے، شاہ شجاع نے خود آگے قدم نہیں بڑھایا بلکہ توپ خانہ کے ایک حصہ کو مقابلہ کے لئے روانہ کیا، غروب آفتاب تک لڑائی کا بازار گرم رہا، رات کی سیاہی پھیلی اور شاہ شجاع نے توپ خانہ کو واپس بلا لیا، قبلہءعالم نے فوج کو احتیاط و دور اندیشی کی تاکید فرمائی اور مورچوں کو مستحکم و مضبوط کرنے کے بعد دولت خانہ مبارک کی حفاظت کے احکام نافذ فرمائے۔

ایک حادثہ

اس شب کے آخری حصہ میں ایک حادثہ پیش آیا، جس کو ظاہر میں اشخاص یہ سمجھے کہ جہاں پناہ کو نقصان عظیم پہنچا، اور فوج میں تفرقہ پیدا ہو گیا، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مہاراجہ جسونت سنگھ نے بظاہر تو قبیلہءعالم کی اطاعت قبول کر لی تھی، لیکن باطن میں نفاق پر تلا ہوا تھا اور ہر وقت فتنہ و فساد کے برپا کرنے کا منتظر تھا۔ جہاں پناہ نے اس معرکہ میں راجہ کو برانفار کا امیر مقرر فرمایا تھا، راجہ جسونت سنگھ نے فرار کا ارادہ کیا اور شاہ شجاع کو بھی اپنے ارادے سے آگاہ کیا، راجہ آخر رات اپنے سپاہیوں اور نیز دیگر راجپوت سواروں کے ساتھ فرار ہوا، جسونت سنگھ نے پیشتر تو شاہزادہ محمد

سلطان کے لشکر پر جو سرراہ مقیم تھا، چھاپہ مارا اور اس کے سواروں نے شاہزادہ کے لشکر گاہ کو تاراج کر کے بے حد نقصان پہنچایا وحشت ناک خبریں آگ کی طرح پھیل گئیں، اور فتنہ جُو بدبختوں نے کارخانہ جات شاہی پر دست درازی کی جرأت کی، اور امیروں اور سپاہیوں کے مال واسباب بھی تاراج وتباہ ہونے لگے۔

شاہ شجاع کی شکست

قبلہء عالم نے یہ خبریں سُنیں لیکن اپنے مقام سے جنبش تک نہ کی، اگرچہ تقریباً نصف شاہی لشکر پراگندہ ہو چکا تھا لیکن تائید یافتہ بادشاہ نے کمی لشکر کے اندیشہ کو نظر انداز کر کے میدان کارزار کی راہ لی، شاہ شجاع نے اس مرتبہ خلاف سابق کے صف آرائی کی۔ طرفین سے بان وتوپ وتفنگ سر ہونے لگیں اور میدان کارزار میں ایسی آتش جنگ مشتعل ہوئی کہ دشمن اس آگ میں جلنے اور تباہ ہونے لگے، اگرچہ اس معرکہ میں اکثر شکست جہاں پناہ کے لشکر کو ہوئی، لیکن ان خرابیوں میں خیر وخوبی پنہاں تھی باوجودیکہ بادشاہ کے ساتھ دو ہزار سے زیادہ سوار نہ تھے، لیکن جہاں پناہ نے خدا پر بھروسہ کر کے دشمن کو پامال کرنا شروع کیا بادشاہ کی ہمّت اور دبدبہء شاہی کی تقویت نے خوفزدہ سپاہیوں کو بھی شیر بنایا، اور انہوں نے دشمن کو تباہ و پامال کرنا شروع کیا، شاہ شجاع کی فوج پراگندہ ہوئی اور راہِ فرار اختیار کی، یہ فتح وظفر جو بلا سپاہ ولشکر کے نصیب ہوئی محض تائید غیبی اور امدادِ سماوی کا نتیجہ تھی، جس نے قبلہء عالم کا سر نیاز خدا کی بارگاہ میں جھکایا اور بادشاہ نے مع فوج کے اپنی قیام گاہ سے کوچ فرما کر شاہ شجاع کے لشکر گاہ پر جو تالاب کے قریب تھا نزول اجلال فرمایا، جہاں پناہ نے اسی روز شاہزادہ محمد سلطان کو شاہ شجاع کے تعاقب میں روانہ کیا اور 26- تاریخ تک اس جگہ قیام پذیر رہے بادشاہ نے 27- تاریخ کو کھجوہ کے نواح سے کوچ فرما کر تیس تاریخ کو نہر گنگ کے کنارہ قیام فرمایا، اس مقام پر پہنچ کر بادشاہ نے معظم خاں ودیگر اعیان ملک کو شاہزادہ محمد سلطان کی امداد اور شاہ شجاع کے تعاقب میں پھر روانہ فرمایا۔

دارا شکوہ کا تعاقب

اب اس لشکر کا حال سنیئے جو شیخ میر صف شکن خاں کی ماتحتی میں دارا شکوہ کے تعاقب میں

روانہ ہوا تھا۔ صف شکن خاں نے چوتھی محرّم کو ملتان سے داراشکوہ کے تعاقب میں کوچ کیا۔ صف شکن خاں نے دریائے بیاس کو عبور کیا اور سُنا کہ داراشکوہ آگے بڑھ چکا ہے، خان مذکور بھی تعاقب میں آگے روانہ ہوا، اس نے چند روز شیخ میر دلیر خاں کے لشکر کی آمد کا انتظار کیا ہر دو لشکر جمع ہو گئے اور معلوم ہوا کہ داراشکوہ نے بھکّر میں دریا کو عبور کر کے اب سکّھر میں قیام کیا ہے، امرائے شاہی نے مشورہ کے بعد یہ طے کیا کہ شیخ میر دلیر خاں اپنی فوج کے ہمراہ دریا کو عبور کر کے اس طرف سے سکّھر روانہ ہوں اور صف شکن خاں دریا کے پار سے بھکّر کی طرف قدم آگے بڑھائے، تاکہ حریف پر دونوں راستوں کا طے کرنا مشکل ہو اور وہ درمیان میں گھر جائے، چنانچہ دوسرے روز صف شکن خاں شیخ میر سے جُدا ہو کر سکّھر روانہ ہوا اور شیخ میر دو روز میں دریا کو عبور کر کے پانچویں صفر کو سکھر سے بارہ کوس کے فاصلہ پر پہنچ گیا، صف شکن خان شیخ میر سے تین روز پیشتر بھکّر پہنچا تھا، اور ایک روز پہلے وہاں سے کوچ کر چکا تھا، معلوم یہ ہوا کہ داراشکوہ اپنے مال واسباب کو بھکّر کے قلعہ میں چھوڑ کر تیس محرّم کو اور آگے روانہ ہو چکا ہے اور اس کا بقیہ مال واسباب کشتیوں میں ہے اور خود جنگل کی راہ سے سفر کی منزلیں طے کر رہا ہے یہ بھی معلوم ہوا کہ داراشکوہ کے خاص حاشیہ نشینوں میں داؤد خاں اور دیگر سرداروں نے اس سے جدائی اختیار کر لی ہے اور اب مغرور شہزادہ کا ارادہ ہے کہ قندھار روانہ ہو، لیکن رفیقوں کی جدائی اور اپنے حرم کی ناراضی کی وجہ سے اس وقت اس نے ٹھٹھہ کا رُخ کیا ہے، صف شکن خاں نے اعز خاں کو دیگر سرداروں کے ہمراہ بھکّر میں چھوڑا تاکہ وہ اہل قلعہ کو پریشان و تنگ کرے اور خود سیوستان روانہ ہوا اس دوران میں وہاں کے قلعہ دار محمد صالح ترخاں کا ایک نامہ صف شکن خاں کو ملا جس کا مضمون یہ تھا:۔

> ''داراشکوہ قلعہ سے پانچ کوس کے فاصلہ پر پہنچ گیا ہے تم جلد سے جلد اس نواح میں آؤ اور اس کے خزانہ کی کشتیوں کے سدراہ بنو۔''

خان مذکور نے پہلے اپنے داماد محمد معصوم کو ایک جرار لشکر کے ہمراہ روانہ کیا تاکہ داراشکوہ کی کشتیوں سے درگذر کر کے دریا کے کنارے مورچل تیار کرے، اور خود بھی اسی شب کوچ کر کے داراشکوہ کی فوج سے تین کوس کے فاصلے پر قیام کیا۔ صف شکن خاں غنیم کی کشتیوں کے انتظار میں بیٹھا تھا، اس امیر نے ارادہ کیا کہ دریا کو عبور کر کے دشمن کے دفعیہ کی کوشش کرے اور محمد معصوم کو پیغام دیا کہ اس سمت سے کشتی روانہ کرے، محمد معصوم کی تقدیر میں اس خدمت کی بجا آوری لکھی نہ

تھی، اس نے جواب دیا کہ اس کنارہ پر دریا کی گہرائی کمر تک ہے، اس طرف سے کشتیاں دریا کو عبور کر جائیں گی، صف شکن خان نے محمد معصوم کے جواب کی بناء پر دریا کو عبور نہ کیا، دوسرے روز دریا کے اُس سمت گرد وغبار اُٹھا اور معلوم ہوا کہ داراشکوہ نے کوچ کیا اور اس کی کشتیاں بھی اسی جگہ سے گذر گئیں، غرض کہ فتح کا ایسا نادر موقع محمد صالح کی کوتاہ اندیشی سے ہاتھ سے جاتا رہا۔

مختصر یہ کہ داراشکوہ نے سیستان کے بلند پشتہ کو عبور کیا اور صف شکن خاں نے بھی اس کے تعاقب میں اس راہ سے دو منزلیں طے کیں، دوسری جانب سے شیخ میر بھی پہنچ گیا، اور اس نے صف شکن خاں کو پیغام دیا:۔

> ''مناسب یہ ہے کہ تم دریا کو عبور کر کے اس طرف آ جاؤ تا کہ دونوں امیر مل کر مفرور کا تعاقب کریں۔''

صف شکن خاں نے دریا کو عبور کیا تو معلوم ہوا کہ داراشکوہ ٹھٹھہ پہنچ چکا ہے، اور اب گجرات روانہ ہونے والا ہے۔

صف شکن خاں نے شیخ میر پر سبقت کی، اور دریائے ٹھٹھہ کے ساحل سے ایک کوس کے فاصلہ پر پہنچ گیا، داراشکوہ نے دوسری جانب سے کوچ کر کے گجرات کا رُخ کیا، صف شکن خاں نے بھی سات روز میں پُل باندھ کر دریا کو عبور کیا، اسی دوران میں حکم شاہی نافذ ہوا کہ شیخ میر، دلیر خاں اور صف شکن خاں تعاقب سے دست بردار ہو کر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو جائیں، جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ داراشکوہ گجرات روانہ ہوا ہے بادشاہ الہ آباد سے واپس ہوئے اور غرۂ جمادی الاولیٰ کو دریائے گنگ کے کنارہ شاہزادہ محمد سلطان کی عرضداشت سے معلوم ہوا کہ الہ آباد فتح ہو گیا، قبلۂ عالم جسونت سنگھ کو تنبیہ کرنا ضروری خیال فرماتے تھے، راجہ کا ارادہ تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو داراشکوہ سے جا ملے، بادشاہ نے ماہ مذکور کی دوسری تاریخ گھاٹم پور کی منزل سے محمد امین خاں میر بخشی کو نو ہزار سواروں کے ہمراہ جسونت سنگھ کے تباہ کرنے کے لئے مقرر فرمایا قبلۂ عالم کا ارادہ تھا کہ جسونت سنگھ کی سرکوبی اور داراشکوہ کے دفعیہ کی مہم کو جس قدر جلد ممکن ہو طے فرمالیں، بادشاہ نے اکبرآباد کا رُخ نہ کیا بلکہ ماہ مذکور کی بیس تاریخ کو باغ نور منزل سے اجمیر کی طرف روانہ ہوئے پچیس تاریخ کو رودناس کے شکارگاہ سے کوچ فرمایا اسی دوران میں شیخ میر دلیر خاں، داراشکوہ کے تعاقب سے دست کش ہو کر بادشاہ کے حضور میں حاضر ہو گئے، شاہی لشکر کی واپسی

سے داراشکوہ کو کچھ اطمینان ہو گیا اور جنگل کی راہ سے کچھ میں وارد ہوا اور کچھ سے گجرات پہنچ گیا، رحمت نقاب نواب دل رس بانو بیگم کے والد شاہ نواز خاں صفوی گجرات کے شاہی صوبہ دار نے ایک ماہ سات یوم کمال نادانی سے ہمّت ہار کر داراشکوہ کا ساتھ دیا، اور گجرات میں قیام کیا، اور بائیس ہزار سواروں کا لشکر تیار کر لیا، داراشکوہ نے یکم جمادی الآخر کو گجرات سے کوچ کیا۔ اثنائے راہ میں جسونت سنگھ کے خطوط ملے جس میں داراشکوہ کو قدم آگے بڑھانے کی ترغیب دی گئی تھی، مغرور شاہزادہ کو ان خطوط سے جرأت ہوئی اور اجمیر کی طرف روانہ ہوا، ساتویں جمادی الآخر کو شاہی سواری ہنڈون کے نواح میں پہنچی اور ہنڈون سے قصبہ ٹودہ تک بادشاہ نے کسی مقام پر قیام نہیں فرمایا۔ ماہ مذکور کی پندرہویں تاریخ امیر خاں برادر شیخ میر، جو شاہی حکم کے مطابق شاہزادہ مراد بخش کو شاہ جہاں آباد سے گوالیار لے گیا تھا لشکر شاہی میں پہنچ گیا۔

داراشکوہ کی شکست

داراشکوہ اجمیر پہنچ کر آمادہ پیکار تھا چوبیس ماہ مذکور کو بادشاہ نے تالاب رامیسر میں قیام فرمایا اور اسی مقام پر صف آرائی کا حکم صادر ہوا، داراشکوہ راجہ جسونت سنگھ کے ورود سے قوی دل ہو کر اور زیادہ اظہار جرأت کر رہا تھا، اسی دوران میں راجہ جے سنگھ کو جسونت سنگھ کے حال پر رحم آیا اور اس نے اس گنہ گار کے عفو تقصیر کا معروضہ جہاں پناہ کے حضور میں پیش کیا۔ قبلہء عالم نے جے سنگھ کی درخواست قبول فرمائی چنانچہ راجہ جے سنگھ نے ایک خط اس خوش خبری کا راجہ جسونت سنگھ کے نام روانہ کیا جس میں داراشکوہ کے ساتھ اظہار ہمدردی پر بہت زیادہ زجر و ملامت بھی کی گئی تھی، راجہ جسونت سنگھ نے یہ مژدہ سُنا اور خود ہنڈون سے بیس کوس کے فاصلہ پر پہنچ کر واپس ہوا، داراشکوہ نے جسونت سنگھ سے اپنی رفاقت پر بے حد اصرار کیا، بلکہ سپہر شکوہ کو اس کے پاس بھیجا، لیکن کچھ کار براری نہ ہوئی اور راجہ بھی بدنصیب شاہزادہ سے علیحدہ ہو گیا۔

شاہی لشکر اجمیر کے نواح میں پہنچ چکا تھا، داراشکوہ مجبوراً جنگ آزمائی پر آمادہ ہوا چونکہ حریف، شاہی فوج سے مقابلہ نہ کر سکتا تھا اس لئے اس نے کوہستان اجمیر کے درہ کو جو سر راہ واقع تھا، مورچہ بنایا۔ شاہی فوج موضع دیواری میں خیمہ زن ہوئی یہ مقام اجمیر سے تین کوس پر تھا اور یہاں سے داراشکوہ کی قیام گاہ بھی کچھ زیادہ دور نہ تھی دوسرے روز شاہی فوج نے نصف کوس اور

آگے قدم بڑھایا۔ شاہی حکم نافذ ہوا کہ توپ خانہ آگے لے جا کر آتش باری کی جائے۔ حریف نے بھی ترکی بہ ترکی آتش باری کی، تقریباً ڈیڑھ روز لڑائی کا بازار گرم رہا، شاہ نواز خاں صفوی، محمد شریف میر بخشی وغیرہ حریف کے بہترین امراء اس معرکہ آرائی میں کام آئے، شاہی امراء میں شیخ میر جیسے عقیدت مند افسر کے سینہ پر بندوق کی ایک گولی لگی جس کی ضرب سے وہ راہی عدم ہوا، میر ہاشم نامی ایک شخص نے جو شیخ میر کا ہم قوم اور ہاتھی پر اس کے ساتھ سوار تھا، مجروح کو حسنِ تدبیر سے اپنی آغوش میں لے لیا اور ایک ایسے مقام پر پوشیدہ کر دیا کہ کسی کو اس امیر کی موت کی اطلاع نہ ہوئی، داراشکوہ نے شاہی امیروں کی جاں بازی و جرأت و ہمت دیکھ کر راہ فرار اختیار کی، باوجودیکہ اس کے مورچل بے حد مستحکم تھے، مگر گجرات روانہ ہو گیا اس فتح سے ملک وملّت کو استحکام حاصل ہوا۔

سجدۂ شکر

قبلہء عالم نے فتح کا مژدہ سُن کر خدا کی درگاہ میں سجدۂ شُکر ادا کیا۔

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ سلاطینِ عالم میں شاید ہی کسی فرماں روا کو اس قلیل مدّت میں اتنی معرکہ آرائیاں کرنی پڑی ہوں، بادشاہ عالم پناہ کو باوجود بااقتدار دشمنوں کی کثرت کے ایک سال کے اندر اس قدر عظیم الشان معرکے پیش آئے، لیکن ہر معرکہ میں خدا نے مدد فرمائی، اور جہاں پناہ کو فتح نصیب ہوئی۔ بادشاہ عالم پناہ ان تمام فتوحات کو اپنی کوشش و مردانگی کا نتیجہ نہیں خیال فرماتے، بلکہ ہمیشہ یہ ارشاد فرماتے ہیں، کہ میں ان فتوحات کو حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا روشن ترین معجزہ سمجھتا ہوں، قبلہء عالم ہمیشہ شکر الٰہی بجا لاتے اور شریعت کے احکام نافذ فرماتے اور بدعات و منکرات کو مٹانے میں مصروف رہتے ہیں، اپنی نیک باطنی سے باوجود کثرت جاہ و حشم ایک لحہ بھی یادالٰہی سے غافل نہیں رہتے اور خدا کی یاد و شکر گزاری کے ساتھ رعایا پروری و انصاف گستری میں شبانہ روز بسر فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ قبلہء عالم کے وجود گرامی سے ملک وملت ظاہری و باطنی برکات سے ہمیشہ فیض یاب رہیں گے۔

دوسرے روز یعنی تیس جمادی الآخر راجہ جے سنگھ اور بہادر خاں کو داراشکوہ کے تعاقب میں روانہ کیا، قبلہء عالم کو داراشکوہ کی مہم سے نجات ہوئی اور چوتھی رجب کو اجمیر سے واپس ہوئے۔

شاہزادہ محمد سلطان کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ شاہ شجاع مونگیر میں خیمہ زن ہے، شاہ شجاع کا ارادہ تھا کہ چند روز مونگیر میں قیام کر کے شاہی لشکر کے قریب پہنچ جائے لیکن اب خوف زدہ ہو کر جہانگیر نگر روانہ ہوا ہے معظم مونگیر پہنچ گیا ہے، ماہ مذکور کی چوبیس تاریخ بادشاہ فتح پور پہنچے اور چھٹی شعبان کو تخت گاہ روانہ ہونے کے لئے تیار ہوئے۔ شاہزادہ محمد سلطان کی ایک اور عرضداشت موصول ہوئی جس سے معلوم ہوا کہ شاہ شجاع جہانگیر نگر پہنچ کر وہاں مقیم تھا لیکن افواج شاہی کے قریب پہنچنے سے پہلے اپنا مال واسباب کشتیوں پر لاد کر فرار ہو گیا، اور جہانگیر نگر پر شاہی قبضہ ہو گیا، بادشاہ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ داراشکوہ اجمیر سے گجرات گیا ہے اور اس کا ارادہ ہے کہ باردگر گجرات پر قبضہ کرے، لیکن گجرات کے امیر سردار خاں نے اس کی مدافعت کی اور شاہزادہ شہر سے دست بردار ہو کر گالجھی کولی روانہ ہوا۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا دوسرا سال

1069ھ/1659ء

انیسویں ماہ مذکور کو بادشاہ خضر آباد پہنچے اور پندرہ روز یہاں قیام کر کے بیس شعبان کو تخت گاہ کے قلعہ میں پہنچ گئے، قبلہء عالم کے جشن جلوس کی ترتیب یورش پنجاب کی وجہ سے بہت مختصر کی گئی تھی، بادشاہ نے جشن کا انعقاد اور خطبہ وسکہ ولقب کا تعین فتنہء پنجاب کی وجہ سے کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دیا تھا۔

اب اس مہم سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ناظمان سلطنت کے نام فرامین جاری ہوئے کہ جشن جلوس کا انتظام کریں۔

جشن جلوس

کار پردازانِ سلطنت نے جشن مرتب کیا اور بادشاہ دیں پناہ نے چوتھی رمضان 1069 ہجری (1692ء) مطابق پچیس خورتاد کو تخت سلطنت پر جلوس فرمایا، اس وقت بادشاہ شمسی حساب سے چالیس سال سات ماہ تیرہ روز کا تھا، اور قمری حساب سے عمر گرامی کے اکتالیس سال دس ماہ و دس یوم گزر چکے تھے۔

نہایت دھوم دھام سے اس جشن کا آغاز ہوا، خطیب نے پہلے خطبہ پڑھا، اور اس کا دامن گوہر مراد سے مالا مال ہوا، بے شمار روپے اور اشرفیاں بادشاہ پر نچھاور کی گئیں، اہل استحقاق کو انعام واکرام عطا ہوا، اور بہی خواہانِ ملک عطائے خلعت سے سرفراز کئے گئے۔

نیا سکہ

قدیم زمانہ سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ اشرفی و روپیہ پر کلمہ طیبہ نقش کیا جاتا تھا، یہ سکے

انسان کے ہاتھوں میں آتے اور پاؤں کے نیچے پامال ہوتے تھے، بادشاہ نے حکم دیا کہ یہ طریقہ بے ادبانہ ہے، اسے ترک کیا جائے، اور اس کے بجائے کچھ اور کلمات سکّوں پر کندہ کئے جائیں اسی دوران میں میر عبدالباقی صہبائی نے اپنا طبع زاد ایک شعر پیش کیا جو بے حد پسند آیا، اور حکم ہوا کہ سکوں کے ایک طرف یہ شعر لکھا جائے اور دوسری جانب ضرب بلدہ اور سنہ جلوس کندہ کئے جائیں۔ شعر مذکور یہ ہے:

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

قبلہء عالم نے حکم دیا کہ بادشاہ کا نام نامی منشور حکومت میں ان القاب کے ساتھ تحریر کیا جائے:۔

''ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب بہادر عالمگیر بادشاہ غازی''

فرمان مبارک صادر ہوا کہ تمام ممالک محروسہ میں جشن جلوس کے تہنیت نامے روانہ کئے جائیں، بادشاہ دادگستر نے ہر شاہزادہ و بیگم و نیز دیگر خدام بارگاہ کو انعامات سے مالا مال فرمایا، اعیانِ ملک کے مراتب و خطابات میں اضافہ ہوا اور نیز جدید القاب مرحمت ہوئے، درویشوں و گوشہ نشینوں اور نیز ارباب نشاط و شعراء کو ان کی جاں نثاری کے گراں بہا صلے مرحمت ہوئے، قبلہء عالم نے حکم صادر فرمایا کہ جشن جلوس اسی زیب و زینت اور اسی فرح و انبساط کے ساتھ ماہ ذی الحجہ تک قائم رہے، اور عیدالضحیٰ سے متصل کر دیا جائے، تاکہ اس طویل مدت میں ہر شخص اپنی آرزو و تمنا حاصل کرے۔

تاریخ جلوس

ملا شاہ بدخشی نے ظل الحق اور ایک شاعر نے:۔

''بادشاہ ملک ھفت اقلیم''

سنہ جلوس کی تاریخ نکالی، دوسرے نکتہ سنج نے جلوس مبارک کی تاریخ:۔

''مذیب اورنگ و تاج ھائے شھاں'' کہی۔

ملا عزیز اللہ خلف ملا تقی اصفہانی نے کلامِ الٰہی سے یہ تاریخ نکالی کہ:۔
"اِن المُلک لِلّٰہِ یُوتِیہِ مَنْ یَشاءُ" (ملک اللہ کا ہے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے)
چونکہ قبلہء عالم کی حکمرانی کا آغاز ماہ رمضان سے ہوا اس لئے حکم شاہی نافذ ہوا کہ تمام دفاتر اور جنتریوں میں ابتدائے عہد عالم گیری یکم ماہ رمضان سے مندرج کیا جائے۔

جشن نشاط افروز

چونکہ عہد معدلت سے پیشتر جمشید و کسریٰ کی تقلید میں یکم فروری کو یوم عید سمجھا جاتا تھا اور اس روز بزم نشاط آراستہ کر کے عیش پرستی کی جاتی تھی، بادشاہ دیں پناہ نے حکم صادر فرمایا کہ بجائے جشن نوروز کے ایک جشن نشاط رمضان کے مقدس مہینے میں منعقد کیا جائے، اور عید الفطر کے مبارک روز سے متصل کر دیا جائے، تمام بہی خواہان ملک اس جشن میں عیش و عشرت کے داد دیں، بادشاہ نے اس بزم کو جشن نشاط افروز کے نام سے موسوم کیا۔

قبلہء عالم نے مکروہات و غیر مشروع افعال و اشیاء کی روک تھام کے لئے مُلّا عوض وجیہہ جیسے فرزانہء روزگار کو عہدۂ احتساب مرحمت فرمایا۔ ملّائے مذکور پندرہ ہزار کے سالانہ عطیہ سے فیضیاب اور منصب ہزاری صد سوار پر فائز ہوئے، خدا کا شکر ہے کہ دیں پناہ بادشاہ کی مسند نشینی سے آج تمام ہندوستان بدعتوں اور خواہشات نفسانی کی برائیوں سے پاک و صاف ہے۔

اسی دوران میں معلوم ہوا کہ بادشاہ زادہ محمد سلطان جو معظم خاں کے ہمراہ شاہ شجاع کے تباہ کرنے پر مامور ہوا تھا، شاہ شجاع کے دام فریب میں گرفتار ہو گیا اور ستائیس رمضان کو اپنے بعض ملازمین کے ہمراہ کشتی میں بیٹھ کر شجاع کی موافقت کے لئے روانہ ہوا ہے اور بادشاہ کا مخالف بن گیا ہے۔

داراشکوہ کی گرفتاری

اکیس شوال کو داراشکوہ اور اس کے فرزند سپہر شکوہ کے گرفتار ہونے کی خوش خبری ملک جیون زمیندار دادو کے خط سے جو اس نے بہادر خاں کے نام روانہ کیا تھا سنائی دی، ملک جیون نے بہادر خان کو جلد سے جلد پہنچ کر دونوں قیدیوں کو حراست میں لینے کی تاکید کی تھی، بادشاہزادہ محمد معظم کے

بجائے امیر الامراء صوبہ دار دکن مقرر ہوا، اور عاقل خاں بجائے عقیدت خاں کے قلعہ دولت آباد کے شاہی قلعہ کا محافظ مقرر کیا گیا۔ عاقل خاں کو حکم ہوا کہ وہ وزیر خاں کے ہمراہ شاہ زادہ کے ساتھ شاہی حضور میں حاضر ہو۔

اکیسویں شوال کو شاہ زادہ محمد اعظم کا شمسی حساب سے چھٹا سال شروع ہوا، اور شاہ زادہ ماہ مذکور کو مرصع سر پیچ وخلعت و موتیوں کا ہار اور پانچ گھوڑے سرکار شاہی سے عطا ہوئے۔

ملک جیون کو حسن خدمت کے صلہ میں خلعت روانہ کیا گیا۔ اور منصب ہزاری دوصد سوار اور بختیار خاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا، بادشاہ نے راجہ راج روپ کو سری نگر روانہ کیا تا کہ پرتھی بت زمیندار سری نگر کو وعدہ وعید سے دام سیاست میں گرفتار کر کے سلیمان شکوہ کی حمایت کرنے سے باز رکھے، بنگالہ کے واقعہ نویس نے اطلاع دی کہ شاہ شجاع نے اکبر نگر سے ٹانڈہ کو رُخ کیا اور اسے معلوم ہوا کہ اللہ وردی خاں اس سے جُدا ہونے کے لئے بالکل آمادہ ہے، شجاع نے اللہ وردی اور اس کے فرزند سیف اللہ کو محض اسی گناہ پر قتل کیا۔

اسی دوران میں حکم نافذ ہوا کہ قلعہ اکبر آباد کا دور یعنی حصار شیر حاجی کی تعمیر کی جائے، چنانچہ اعتبار خاں کے اہتمام سے تین سال کے اندر یہ عمارت تیار ہوگئی۔

تیئس ذی قعدہ کو وزن قمری کی مجلسِ جشن منعقد ہوئی اور اہل استحقاق کو زر وزن عطا کیا گیا، اور امراو خُدامِ بارگاہ، اضافہ منصب وانعام جواہر واسپ وفیل سے سرفراز کئے گئے۔

دارا شکوہ کا خاتمہ

اسی زمانہ میں بہادر خاں، دارا شکوہ کو بارگاہِ شاہی میں لے آیا، اور قیدی محل خضر آباد میں اُتارا گیا، چونکہ اکثر وجوہات کی بنا پر دارا شکوہ کا وجود باعث خرابی تھا، اس لئے اکیس ذی الحجہ کو اس کی زندگی کا خاتمہ کر کے لاش جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ کے مقبرہ میں پیوند خاک کر دی گئی، سیف خاں کو حکم ہوا کہ سپہر شکوہ کو قلعہ گوالیار میں نظر بند کر کے خود تخت گاہ کو واپس آئے، راجہ جے سنگھ جو بہادر خاں کے بعد شاہی ملازمت میں حاضر ہوا عنایاتِ شاہی سے سرفراز کیا گیا، چونکہ متعدد معرکہ آرائیوں میں راجہ جے سنگھ اور بہادر خاں کے گھوڑے بہت زیادہ ضائع ہوئے تھے، بادشاہِ خدام نواز نے راجہ کو دو سو سوار اور بہادر خاں کو ایک سو گھوڑے سرکارِ شاہی سے عطا فرمائے۔

عام بخشش

اسی زمانہ میں بادشاہِ رعیت پرور نے غلہ و دیگر اجناس کا محصولِ راہداری ہمیشہ کے لئے معاف فرمایا، اس عام بخشش سے مبلغ پچیس لاکھ نقد خالصہ شریفہ کی سالانہ آمدنی میں کم ہو گئے، اس کے علاوہ جس قدر محاصل کہ تمام ممالکِ محروسہ میں معاف فرمائے گئے ان کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔

ذوالفقار خاں قرامانو نے وفات پائی اور اس کا پسر اسد خاں اور اس کے داماد نامدار خاں کو خلعت مرحمت ہوا۔ بختیار خاں زمیندار داور کو اپنی جاگیر پر جانے کی اجازت عطا ہوئی، معظم خاں نے کرناٹک کا ملک قطب الملک سے لے لیا تھا، اور اس نواح کے بہترین قلعہ کنجی کوتہ پر خان مذکور کے ملازمین کا قبضہ تھا، قطب الملک اس قلعہ پر دانت لگائے ہوئے تھا، بادشاہ نے میر احمد خوانی کو مصطفیٰ خاں کا خطاب دے کران حدود کے انتظام کے لئے روانہ فرمایا۔

کابل کے حادثات میں سے یہ واقعہ سمع مبارک تک پہنچا، کہ شبیر اللہ ولد سعادت خاں بنیرۂ تربیت خاں مرحوم نے جمدھر سے اپنے باپ کو قتل کیا اور مہابت خاں ناظم کو مقید کر لیا ہے، بادشاہ نے بجائے مقتول کے شمشیر خاں کو قلعہ کابل کا حاکم مقرر فرمایا۔

توران سے خبر آئی کہ سُبحان قلی خاں حاکم بلخ اور اس کے بھائی قاسم سلطان امیر میں جو قلعہ کا حاکم تھا نزاع ہوئی اور سبحان قلی نے حُسنِ تدبیر سے فتنہ کو فرو کر دیا۔

بادشاہ زادہ محمد سلطان، شاہ شجاع کا ہم نوا ہوا تھا اور شاہ زادہ کی اس مخالفت سے بنگال کی فوج کو نقصان عظیم پہنچا تھا، باوجودیکہ بادشاہ کو معظم خاں کے وجود سے اس نواح کی طرف سے پورا اطمینان تھا، لیکن پھر بھی احتیاط و دور اندیشی سے کام لیا اور جشن وزن شمسی کے اختتام کے بعد آٹھویں ربیع الاوّل کو ساحل گنگا کی طرف روانہ ہوئے، راجہ جے سنگھ کو ایک لاکھ روپیہ مرحمت ہوا اور راجہ جسونت کا خطابِ مہاراجہ بحال فرما کر اس کے قصور کی معافی کا حکم صادر ہوا۔

میر ابراہیم ولد میر مغاں مختلف سامان اور چھ لاکھ تیس ہزار روپیہ لے کر مکہ معظمہ و مدینہ منورہ روانہ ہوا تا کہ یہ رقم حرمین شریفین کے اہل استحقاق کو تقسیم کی جائے۔

شاہزادہ محمد معظم کا نکاح

انیس تاریخ شاہی سواری گڑھ مکتیسر پہنچی اور بائیسویں تاریخ کو شاہزادہ محمد معظم وزیر خاں کے ہمراہ دکن سے آ کر شاہی ملازمت سے سرفراز ہوئے، پندرہویں ربیع الثانی کو شاہزادہ مذکور کا نکاح خراسان کے ایک شریف کی دختر سے کیا گیا۔اور چوتھی جمادی الاوّل کو بادشاہ گڑھ مکتیسر سے الہ آباد روانہ ہوئے۔اسی زمانہ میں معظم خاں کی عرض داشت پہنچی جس سے معلوم ہوا کہ خان مذکور نے دریا کو عبور کر کے شاہ شجاع کے تباہ کرنے پر کمر ہمّت باندھی ہے، چونکہ اس سفر سے بادشاہ کا اصل مقصد لشکر بنگالہ کی امداد تھی اور وہ خان مذکور کی وجہ سے پوری ہو چکی تھی اس لئے شمس آباد سے تخت گاہ کی جانب واپس ہوئے اور گیارہ جمادی الآخر کو آگرہ کے قلعہ میں تشریف فرما ہوگئے۔......

مسجد کی تعمیر

چونکہ بادشاہِ درویش منش کا ارادہ یہ تھا کہ فریضہ نماز مسجد میں باجماعت ادا فرمائے، لہٰذا قیام گاہ کے قریب ایک مختصر سی مسجد سنگ مرمر کی نہایت منقش اور خوش قطع تعمیر فرمانے کا حکم دیا یہ مقدس عمارت پانچ سال کے عرصہ میں تیار ہوئی اور اس کی تعمیر میں ایک لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ صرف ہوئے، عاقل خاں نے آیۂ کریمہ

"اِنَّ المَساجِدَ لِلّٰہِ فَلَا تَدعُوا مَعَ اللّٰہِ اَحداً"۔

(تحقیق کہ مسجدیں اللہ کی ہیں، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کر کے مت پکارو) بنائے مسجد کی تاریخ نکالی۔

اسی زمانہ میں بنگال کے واقعات سے معلوم ہوا کہ بادشاہزادہ محمد سلطان شاہ شجاع کے جہانگیر نگر سے فرار ہونے کے وقت اپنی حرکت پر بے حد نادم ہوا۔اور جس طرح گیا تھا اسی طور پر اکبر نگر واپس آ کر اسلام خاں کے پاس مقیم ہے، محمد میرک، گرز بردار شاہزادہ کے لئے خلعت لے کر روانہ ہوا۔اور فدائی خاں کو حکم ہوا کہ شاہزادہ مذکور کو شاہی حضور میں لے آئے۔شاہزادہ بادشاہ کے قیام گاہ کے قریب پہنچا اور پچیس شعبان کو اللہ وردی خان حضور میں سفارش کر کے شاہزادہ کو دریا کی راہ سلیم گڑھ لے گیا اور معتمد خاں حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا تیسرا سال

1070ھ/1660ء

اسی زمانہ میں رمضان کا مبارک مہینہ آ گیا، چوبیسویں رمضان کو ایک نہایت پُر لطف و دل کش جشن عشرت منعقد کیا گیا، اہل زمین نے ساکنانِ افلاک کو اور اہل سماء نے بنی آدم کو تہنیت و مبارک باد دی، اسی مسرت انگیز دن بنگال سے یہ خبر آئی کہ شاہ شجاع جہانگیر نگر میں بھی قیام نہ کر سکا اور چھبیس رمضان کو جو سنہ جلوس کا تیسرا سال ہے ملکِ رخنگ میں آوارہ وطن ہوا، اور معظم خاں نے جہانگیر نگر پر قبضہ کر لیا۔ چونکہ یہ طے ہو چکا تھا کہ ماہ رمضان کی چوبیس تاریخ سے جس روز کہ جلوس ثانی واقع ہوا ہے جشن عشرت منعقد کر کے اس مبارک بزم کو عید الفطر سے متصل کر دیں، چنانچہ ایسا ہی عمل میں لایا گیا، اور بادشاہ دریا نوال نے خورد و بزرگ، قریب و بعید ہر عقیدت شعار کو اپنے ابر کرم سے سیراب فرمایا، عید الفطر کا دن آیا اور قبلہء عالم نے نماز عید کے لئے مسجد کا رُخ کیا، اور یوم عید کے بعد دو روز اور جشن عشرت ہوتا رہا۔

شاہ شجاع کی تباہی

فتح مند بادشاہی لشکر کی ہمت و بہادری سے شاہ شجاع ایسا پامال ہوا کہ بدنصیب و سیہ روزگار شاہزادہ کے ہمراہ سوا یا وہ کش سید مسمی سید عالم اور سید قلی اوزبک اور بارہ مغل سواروں، اور چند دیگر نفوس کے کوئی نہ رہا، غرض کہ شاہ شجاع سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا دنیا کے بدترین حصہ یعنی جزیرہ رخنگ میں داخل ہوا اور اسی کفر انگیز زمین میں پیوند خاک ہوا، جس کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔

وزن قمری کا جشن

اسی زمانہ میں سترہویں ذی قعدہ کو وزن قمری کا جشن منعقد کیا گیا اور بادشاہ کی عمر کا

چوالیسواں سال شروع ہوا۔ انعام واکرام عام طور پر عطا ہوا۔ اور بادشاہ زادوں پر طرح طرح کی نوازشیں کی گئیں، معظم خاں سپہدار بنگال کو سپہ سالار خان خاناں کا خطاب اور منصب ہفت ہزاری وہفت ہزار سوار دواسپہ وسہ اسپہ مرحمت ہوا، بادشاہ نے اس امیر کے لئے ان عنایات کے علاوہ خلعت وشمشیر مرصع روانہ فرمایا، علاوہ خان خاناں کے فوجی عہدہ داروں اور نیز صوبہ داروں اور تمام ملازمین وخدام کو مرحمت شاہانہ سے شاد فرمایا۔ نجابت خاں کا جو اپنی تقصیرات کی وجہ سے مورد عتاب تھا قصور معاف فرمایا گیا، اور یہ امیر جو بے ساز وسامان کے آ رہا تھا، شمشیر مرصع کے عطیہ سے سرفراز کیا گیا۔

عبداللہ خان والیٔ کاشغر کا بھائی منصور خاں اور اس کا برادر زادہ مہدی خان جو خان مذکور سے خوف زدہ ہو کر بدخشاں کی راہ سے ہندوستان آ رہے تھے، آستانہ ٔوالا پر حاضر ہو کر حضوری سے فیضیاب ہوئے۔

ملکہ ثریا جناب ودیگر بیگمات وشاہزادوں کے پیش کش یعنی جواہرات ومرصع آلاتِ شاہی، ملاحظہ میں پیش ہوئے، اور انہیں شرف قبولیت عطا ہوا۔ اسی دوران میں عید الضحیٰ کا مسرت بخش روز آیا، اور شاہانہ نوازش نے خلق کثیر کو اپنے انعام سے ممنون احسان بنایا۔

راؤ کرن بھورتیہ، داراشکوہ کے اغوا سے دکن سے فرار ہو کر بلا اجازت اپنے وطن روانہ ہوا تھا، بادشاہ نے اس زمانہ میں امیر خاں کو اس نواح کی طرف روانہ فرمایا، اور اسے تاکید کی کہ اگر خوف زدہ مجرم اپنے قصور پر نادم ہو کر عذر خواہ ہو تو اس کو اپنے ہمراہ بارگاہ شاہی میں لے آئے، ورنہ اس کو تباہ وبرباد کرے خان مذکور بیکانیر کے نواح میں پہنچا اور راؤ کرن خاں کے پاس حاضر ہو کر اس کے وسیلہ سے بادشاہ جرم بخش کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ اور عنایت شاہی سے سرفراز ہوا۔

ساتویں محرم کو اخلاص خاں خویشگی شاہ شجاع کے جواہرات وخزانہ ودیگر مال واسباب مع اس کی بیگمات کے اپنے ساتھ بنگالہ سے بادشاہ کے حضور میں لے آیا۔

قلعہ چاکنہ کی فتح

اسی زمانہ میں قلعہ چاکنہ امیر الامراء صوبہ دار دکن کی کوشش سے فتح ہوا، قلعہ مذکور پر مکار سیواجی نے حکومت بے جاپور کے انقلاب کے وقت بیجاپوری امیر کو قتل کر کے قبضہ کیا تھا،

امیرالامراء نے چند مقامات پر سیواجی کے گماشتوں کو سزا بھی دی، اور اپنی چوکیاں مقرر کر دیں۔

اسی دوران میں جشن وزن شمسی کا مبارک زمانہ آیا اور بادشاہ کی عمر کا تینتالیسواں سال شروع ہوا، اور تمام عالم بادشاہ کے جود و احسان سے فیض یاب ہوا، پرینڈہ کا قلعہ بلا جنگ و جدال کے سر ہوا، غالب نام تھانہ دار نے جو عادل خاں کی طرف سے قلعہ کا محافظ تھا، امیرالامراء کے پاس پیغام بھیج کر اظہار اطاعت کیا، امیرالامراء نے مختار خاں کو قلعہ دار مقرر کیا اور اپنے پاس طلب کر کے شاہی حکم سے منصب چار ہزاری و خطاب خانی و دیگر عنایات سے سرفراز کیا۔

سلیمان شکوہ کی گرفتاری

پرتھی سنگھ زمیندار کوہستان سری نگر نے ایک معروضہ روانہ کیا اور اپنے قصور کی معافی کا خواہاں ہوا۔ اور راجہ جے سنگھ کو پیغام دیا کہ سلیمان شکوہ کی حفاظت سے دست بردار ہو کر شاہزادہ کو بادشاہ کے سپرد کرنے کے لئے تیار رہے۔ راجہ جے سنگھ نے بادشاہ کے حکم کے مطابق اپنے فرزند کنور رام سنگھ کو سری نگر روانہ کیا اور رام سنگھ شاہزادہ سلیمان شکوہ کو تخت گاہ میں لے آیا، یہ شاہزادہ بھی قلعہء سلیم گڑھ میں نظر بند کر دیا گیا، ماہ مذکور کی چوبیس تاریخ مرتضیٰ خاں نے سلیماں شکوہ اور محمد سلطان دونوں کو گوالیار پہنچا دیا۔

حاکم بصرہ اور حاکم بلخ کے نامہ تہنیت

بندر سورت سے اطلاع ملی کہ حسین پاشا حاکم بصرہ نے ایک نامہء تہنیت مع عربی نژاد گھوڑوں کے اپنے ایک ملازم قاسم آقا کے ہمراہ بارگاہ شاہی میں روانہ کیا ہے، بادشاہ نے مصطفیٰ خاں بتصدی بندر سورت کے نام فرمان صادر کیا کہ مبلغ چار ہزار روپیہ قاسم آقا کو مدد خرچ دے کر قاصد کو حضور شاہی میں روانہ کرے۔

اسی زمانہ میں سلیمان قلی خاں حاکم بلخ کا سفیر مسمی ابراہیم بیگ نامہء تہنیت و توران کے تحائف کے ہمراہ آستانہء والا پر حاضر ہوا، ابراہیم بیگ عرصہ کا مریض تھا، چند روز کے بعد دنیا سے کوچ کر گیا اس کے ہمراہیوں کو خلعت اور مبلغ میں ہزار روپیہ عطا کر کے ان کو واپسی کی اجازت مرحمت ہوئی۔

چونکہ ممالک محروسہ کے اکثر شہروں میں گرانی غلہ سے رعایا پریشان تھی، بادشاہ نے حکم دیا کہ سالانہ لنگروں کے علاوہ دس لنگر خانے تخت گاہ میں اور بارہ لنگر خانے نواح کے پرگنوں میں قائم کئے جائیں، اس طرح لاہور میں بھی چند جدید لنگر خانے قائم کئے گئے۔ اس کے علاوہ جو نقد رقم محرم، رجب، شعبان، ربیع الاول و ذی الحجہ میں خیرات کی جاتی تھی اس سے دوچند اس سال فقراء کو تقسیم کی گئی۔ بادشاہ رعیت پرور نے امراء کو بھی حکم دیا کہ اپنی جانب سے بھی خیرات خانے قائم کریں۔ غرض کہ جب تک قحط کی مصیبت رفع نہ ہوئی یہ کارِ خیر برابر جاری رہا۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا چوتھا سال

1071ھ/1661ء

رمضان کا مبارک مہینہ آیا اور عہد معدلت کا چوتھا سال شروع ہوا، اگر چہ بادشاہ نے اس مبارک مہینے کی چوبیس تاریخ کو تخت حکومت پر جلوس فرمایا تھا، اور سال گذشتہ اسی تاریخ سے جشن کا آغاز ہوا تھا لیکن چونکہ یہ مہینہ صیام کا ہے اور اہل اسلام کو بوجہ صوم کے جشن عشرت سے پوری طرح بہرہ اندوز ہونے کا موقع نہ ملتا تھا، اسی لئے قبلہء عالم نے اس جشن جلوس کا آغاز یوم عیدالفطر کو مقرر فرمایا اور مدت جشن دس روز معین فرمائی۔

اسی سال شاہزادہ محمد معظم کے محل میں فرزند پیدا ہوا جو معزالدین کے نام سے موسوم کیا گیا۔
سی درمیان میں بادشاہ کو معلوم ہوا کہ بوداق بیگ شاہ عباس ثانی بادشاہ ایران کا ایلچی تیس شعبان کو ملتان وارد ہوا۔ اور تربیت خان صوبہ دار نے اس کی مہمان داری کر کے پانچ ہزار روپیہ نقد اور نو تھان کپڑے کے اس کو پیش کئے، اسی طرح لاہور میں خلیل اللہ خاں نے قاصد کی عمدہ مہمانداری کر کے بیس ہزار روپیہ وخنجر مینا کار، شمشیر اور سات تھان ہندوستان کے نفیس و بہترین کپڑوں کے عنایت کئے، سفیر سرائے باؤلی پہنچا اور الش خاصہ کے عطیہ سے سرفراز ہو کر تیسری شوال کو آستانہ بوسی کے لئے مامور ہوا، عید کا چاند نمودار ہوا، اور بدستور سابق جشن خسروانہ کی تیاری کی گئی، قبلہء عالم عید گاہ تشریف لے گئے اور بعد فراغتِ نماز، مخلوق کو انعام و اکرام سے مالا مال فرمایا، شاہزادوں واعیان مملکت وراجگان عقیدت شعار وامرائے نامدار پر طرح طرح کی نوازشیں فرمائی گئیں، قاسم آقا رومی آستانہ شاہی پر حاضر ہوا، اور پانچ عربی نژاد گھوڑے حسین پاشا کا تحفہ شاہی ملاحظہ میں پیش کیا۔ قاصد نے خود اپنی جانب سے بھی چند گھوڑے اور ایک گرجی غلام نذر دیا،

بادشاہ دیں پناہ نے قاصد کو خلعت اور پانچ ہزار روپیہ مرحمت فرمایا۔

شاہ ایران کا تہنیت نامہ

بوداق بیگ سفیر ایران بھی تخت گاہ کے قریب پہنچا، عید الفطر کے تیسرے روز اسد خاں، سیف خاں و ملتفت خاں اس کا استقبال کر کے شہر میں لائے یہ سفیر دیوان خاص و عام میں پائے بوسی سے مشرف ہوا، قاصد نے کورنش ادا کرنے کے بعد شاہ ایران کا تہنیت نامہ پیش کیا، بادشاہ نے سفیر کو خلعت چوغہ و خنجر مرصع اور ارگجہ جشن معہ پیالہ و خوانچہء طلاء و پان یا پاندان و خوان طلاء مرحمت فرمایا اور رستم خاں کی حویلی سفیر کے قیام کے لئے عطا ہوئی، اور میر عزیز بدخشی اس کی مہمانداری پر مامور ہوا، ساتویں شوال کو سفیر نے شاہ ایران کے تحائف بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کئے جن میں چھیاسٹھ گھوڑے اور ایک دانہ مروارید جس کا وزن سینتیس قیراط شاہی تھا، شامل ہیں شاہ ایران کے کل موصولہ تحائف کی قیمت چار لاکھ بائیس ہزار روپے اندازہ کی گئی۔

انیسویں ذی قعدہ کو جشن وزن قمری منعقد ہوا اور بادشاہ کی عمر گرامی کا پینتالیسواں سال شروع ہوا۔ اہل دربار و نیز قریب و بعید کے عقیدت مندوں نے طرح طرح کی خوشیاں منائیں، دسویں ذی الحجہ کو عید الضحیٰ نے شاہانہ عطیات وانعامات کو ہر کس و ناکس کے لئے عام کیا، بادشاہ نے سفیر ایران کو رخصت کیا اور ایک لاکھ روپیہ نقد، خلعت و خنجر مینا کار و علاقہ مروارید و اسپ بازین و لگام و فیل با ہودج طلاِ و ساز نقرہ و زربفت کی جھول، ایک دریائی ہاتھی اور پالکی باساز طلائی سفیر کو مرحمت فرمائیں، قبلہء عالم نے فرمایا کہ بادشاہ کے نامہ کا جواب بعد کو روانہ کیا جائے گا۔ غرض کہ ایلچی مذکور کو اول سے آخر تک پانچ لاکھ روپیہ اور اس کے ہمراہیوں کو پینتیس ہزار روپے مرحمت فرمائے گئے، عاقل خاں نے گوشہ نشینی اختیار کرنے کا معروضہ پیش کیا اور بادشاہ نے اس کی درخواست قبول فرما کر ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر فرمایا۔

اسی دوران میں جشن وزن شمسی منعقد ہوا اور 44 سال کا آغاز ہوا، رعایا نے اپنی آرزوئیں اور مرادیں حاصل کیں۔

قاسم آقا حسین پاشا کے قاصد کو بارہ ہزار روپیہ اور خلعت عطا فرما کر واپسی کی اجازت مرحمت ہوئی، اس کے ہمراہیوں کو ایک ہزار روپیہ عطا ہوا اور ایک شمشیر مرصع حسین پاشا کے لئے

روانہ کی گئی۔

شاہ بخارا کی سوغات

چوتھی ربیع الثانی کو خواجہ احمد پسر خواجہ محمود عبد العزیز والیٔ بُخارا کا سفیر تخت گاہ کے نواح میں پہنچا، سیف خاں و قباد خاں اس سفیر کو شاہی حضور میں لے آئے۔ ایلچی نے شاہ بُخارا کی سوغاتِ شاہی ملاحظہ میں پیش کیں، ترکی گھوڑے نر و مادہ و شتران بختی اور دیگر تحائف بادشاہ کے ملاحظہ میں گزارے گئے، منجملہ ان تحائف کے ایک قطعہ لعل بھی تھا جس کی قیمت چوبیس ہزار اندازہ کی گئی، بادشاہ نے ایلچی کو اسی روز خلعت و خنجر و علاقہ مروارید اور بیس ہزار روپیہ مرحمت فرما کر ایک مکان قیام کے لئے عطا فرمایا۔

شاہزادہ محمد معظم کا نکاح

اسی مبارک زمانہ میں قبلۂ عالم نے راجہ روپ سنگھ کی دختر کا جو مسلمان ہو کر محل شاہی میں پرورش پا رہی تھی شاہزادہ محمد معظم کے ساتھ نکاح کر دیا۔

داؤد خاں صوبہ دار پٹنہ نے پلانون کا ملک جو صوبۂ بہار کے تعلقات میں سے ہے شدید معرکہ آرائیوں کے بعد فتح کر لیا تھا، بادشاہ رعیت نواز نے صوبہ دار مذکور کو خلعت عزت روانہ فرمایا۔

سید امیر خاں بجائے مہابت خاں کے کابل کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔

رجب کی پہلی تاریخ فاضل خاں اکبر آباد سے حضور میں آیا، اور اعلیٰ حضرت کے فرستادہ جواہرات و مرصع آلات بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کئے۔

خلیل اللہ خاں صوبیدار لاہور کی وفات

دوسری رجب کو معلوم ہوا کہ خلیل اللہ خاں صوبہ دار لاہور نے جو بیمار ہو کر تخت گاہ میں حاضر ہوا تھا وفات پائی، مرحوم کی وفات کے دوسرے دن بادشاہ خود اس کے مکان پر تشریف لے گئے، میر خان، روح اللہ خاں اور عزیز خاں، مرحوم خلیل اللہ کے ہر سہ فرزندوں کو خلعت مرحمت ہوا اور شاہانہ نوازش سے سرفراز فرمائے گئے خلیل اللہ خاں کی زوجہ مسماۃ مجیدہ بانو کو جو مہد علیا حضرت ممتاز

الزمانی کی ہمشیرہ مسماۃ ملکہ بانو کی دختر تھی پچاس ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ مرحمت ہوا۔

چھبیس رجب کو شاہزادہ محمد اکبر کی ختنہ کی رسم ادا کی گئی۔

اسی زمانہ میں بادشاہ نے بخارا کے ایلچی مسمی خواجہ احمد کو خلعت و خنجر مرصع و علاقہ مروارید و مبلغ تیس ہزار روپیہ انعام دے کر بخارا واپس جانے کی اجازت دی، ایلچی مذکور کو اوّل سے آخر تک مبلغ ایک لاکھ بیس ہزار روپے مرحمت ہوئے، یکم شعبان کو شاہ شجاع کے ہاتھیوں میں سے اَسّی ہاتھی خانخاناں کے فرستادہ اور دو ہاتھی پلانوں کے مال غنیمت کے بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کئے گئے۔

بادشاہ کی صیدَ افگنی

بادشاہ کی صید افگنی کا مفصل حال لکھنا بے حد مشکل ہے مشتے نمونہ از خروارے، مختصر حال معرضِ تحریر میں لاتا ہوں۔

اس سال بادشاہ نے ایک سو پچاس کلنگ شکار کئے اور شکار قمرغہ میں تین سو پچپن ہرن دام میں گرفتار ہوئے آٹھ ہرن بادشاہ نے اپنے دستِ مبارک سے سینتالیس ہرن اہل دربار نے جن کو اجازت مرحمت ہوئی تھی شکار کئے بقیہ جانوروں کی بابت حکم ہوا کہ آزاد کردیئے جائیں۔

بادشاہ سے عرض کیا گیا کہ بیشتر ہرنوں کی کثیر تعداد قمرغہ کے احاطہ میں داخل ہوئی لیکن تمام جانور یکبارگی بھڑکے اور چوکڑی بھر کر اہل قمرغہ پر حملہ آور ہوئے پانچ شخص جانوروں کے سینگوں سے زخمی ہوئے اور دو آدمی ہلاک ہوگئے اور تقریباً ایک ہزار ہرن احاطہ کے باہر نکل گئے۔

ایک عجیب وغریب واقعہ

اسی زمانہ میں بادشاہ سے عرض کیا گیا، وہ یہ کہ قصبہ سون پت میں لڑکوں کی ایک جماعت شاہ و وزیر کی بازی میں مصروف تھی، اس جماعت میں دو لڑکے چور بنائے گئے، کوتوال۔ ان نقلی چوروں کو بادشاہ کے سامنے لایا، جعلی چور کو شاہ نے سزا دینے کا حکم دیا، کوتوال ناعاقبت اندیش نے چھڑی کی ایک ایک ضرب جو اس کے ہاتھ میں تھی چوروں کے سر پر ایسی لگائی کہ بے گناہ چوروں کا خاتمہ ہوگیا، اور لڑکوں کے کھیل نے اصل واقعہ کی صورت اختیار کر لی۔

کوچ بہار اور آسام کی فتح کا ذکر

1067 ہجری (1657ء) کے آخر میں اعلیٰ حضرت کی ناسازی مزاج کی وجہ سے سرحد میں ہر چہار طرف شورش برپا ہوگئی تھی، بھیم نارائن کوچ بہار کے زمیندار نے ولایت کامروپ پر جو بادشاہی علاقہ تھا قبضہ کرلیا، اسی درمیان میں جے دھج سنگھ راجہ آسام نے جو اپنے ملک کو تباہی افواج کی پائمالی سے محفوظ و مامون سمجھتا تھا۔ دوسرے ممالک پر قبضہ کرنے کا خیال خام کیا اور خشکی کی راہ سے ایک بہت بڑی فوج کامروپ کی مہم پر روانہ کی۔ خانخاناں نے ان دونوں مہموں کا انجام دینا بہت ضروری خیال کیا، اور جہاں پناہ کی اجازت سے اٹھارہ ربیع الاول سنہ 4 کو جلوس خضر پور سے روانہ ہوا، اور ساتویں ربیع الثانی کو اس نے شہر کوچ بہار کو فتح کر کے شہر کو عالم گیر نگر کے نام سے موسوم کیا۔

خانِ خاناں آٹھویں ماہ مذکور کو گورہ گھاٹ کے راستہ سے آسام فتح کرنے کے لئے بڑھا، اور پانچ مہینے کی کدوکاوش کے بعد پانچویں شعبان کو گرگاؤں کو جو آسام کا پائے تخت ہے اسلام کے انوار و برکات سے روشن کیا، مسلمان سپاہیوں کی جرأت اور بہادری ان کی دینداری اور ان کی محنت اور مشقت کا جو بے حد خلوص اور اعتقاد کے ساتھ انہوں نے اس کامیاب سفر میں برداشت کی اور خود آسام اور کوچ بہار کے نادرالوجود تحفوں اور واقعات کا ذکر اور وہاں کے زندہ اور مردہ اشخاص کے حالات وہاں کے درختوں، پھلوں نباتات جنگلوں، سمندروں کے احوال اور وہاں کی خوراک اور پوشاک کی نوعیت، وہاں کے قلعوں اور عمارتوں کا ذکر اس مختصر کتاب میں شرح وبسط کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ (1)

جہاں پناہ کو خانخاناں کے عریضہ سے اس فتح کی اطلاع ہوئی اور بادشاہ دیں پناہ نے خان خاناں کے فرزند کو اپنے حضور میں طلب فرما کر خلعت سے سرفراز فرمایا اور خود سپہ سالار کو اظہار خوشنودی کا فرمان روانہ فرما کر خلعت اور ایک کروڑ دام کے انعام سے مالا مال فرمایا اور اسے دہ ہزاری امیر بنا کر صاحب نوبت ونقارہ بنایا۔

1- یہ تمام واقعات عالمگیر نامہ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا پانچواں سال

1072ھ/1662ء

اسی مبارک زمانہ میں رمضان کا مقدس مہینہ آیا اور طاعت اور عبادت الٰہی میں سارا زمانہ ختم ہوا، سنہ جلوس کا پانچواں سال شروع ہوا، پیش گاہ دولت کے ملازمین اور سربراہ کار اسباب جشن کی ترتیب میں مشغول ہوئے اور آتش بازی کی آرائش اور سامان کا انتظام ہر سال کے موافق شروع ہوا، بادشاہ دیں پناہ نے عید کے دن نماز سے فارغ ہو کر خاص خاص درباریوں اور اطراف و جوانب کے حکام اور صوبہ جات کے اِمراء کو شرف باریابی عطا فرمایا اور ہر امیر شاہانہ نوازش سے سرفراز فرمایا گیا، امراء کے پیش کش بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کئے گئے اور ہدیوں کو قبولیت کی عزت عطا ہوئی۔

قبلہء عالم کی بیماری اور صحت

دربار کے تیسرے دن شاہی مزاج کچھ ناساز ہوا جس کا علاج فصد سے کیا گیا، خون کے نکل جانے سے ضعف پیدا ہوا اور بادشاہ پر غشی طاری ہو گئی، مرض نے طول کھینچا اور دسویں ذی قعدہ تک بادشاہ کی یہی حالت رہی، حکیم مہدی اور حکیم محمد امین نے معقول طریقہ پر علاج کیا، خیرات کثرت سے کی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کا مرض دفع ہوا اور اہل حاجت کو سکون اور اطمینان حاصل ہو گیا، سترہویں ماہ مذکور کو بادشاہ نے غسل صحت کیا دسویں ذی الحجہ کو بادشاہ نے عید الضحیٰ کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد کا رُخ کیا، اور اس دن چھوٹے اور بڑے سب بادشاہ کے دیدار سے مشرف ہوئے اور رعایا نے دوہری عید کی خوشیاں منائیں۔

جشن وزن قمری

سولہویں ذی الحجہ کو جشن وزن قمری ترتیب دیا گیا اور بادشاہ کی زندگی کا چھیالیسواں سال شروع ہوا مہابت خاں مہاراجہ جسونت سنگھ کے تغیر سے گجرات کا صوبہ دار مقرر ہوا اور چھ ہزاری امیر بنا کر شاہانہ الطاف سے سرفراز کیا گیا، رضوی خاں بخاری نے خلوت نشینی کو ترک کیا اور دو ہزار پانصدی منصب دار اور چار سو سواروں کا امیر کیا گیا، عادل خاں کے ملازمین جو پیش کش لے کر حاضر ہوئے تھے، خلعت سے سرفراز فرما کر رخصت کئے گئے، تقرب خاں نے رحلت کی، اس کا فرزند محمد علی خاں جو باپ کے قصور کی وجہ سے خود بھی منصب سے معزول کر دیا گیا تھا شاہانہ نوازش سے سرفراز ہوا، اسے خلعت ماتمی عطا ہونے کے بعد ایک ہزار پانصدی کا منصب دار اور دو سو سواروں کا سردار مقرر کیا گیا۔

سیف خاں منزدی سرہند سے حاضر ہوا اس امیر کو خلعت و شمشیر مرحمت ہوئی اور دو ہزار کا منصب دار اور ڈیڑھ ہزار سواروں کا امیر بنایا گیا۔

جشن وزن شمسی

پہلی جمادی الاوّل کو وزن شمسی کا جشن مرتب ہوا اور دورۂ شمسی کے لحاظ سے بادشاہ کی زندگی کا پینتالیسواں سال شروع ہوا اور ساری دنیا نے اپنی مراد حاصل کی۔

نجابت خاں جو جلوس کے سال اوّل اپنے قصور کی وجہ سے معتوب ہو چکا تھا دوبارہ پنج ہزاری منصب دار اور چار ہزار سواروں کا امیر ہوا۔

لاہور میں آمد

اس مہینہ کی ساتویں تاریخ بادشاہ نے پنجاب کا رُخ کیا۔ کرنال پہنچ کر بادشاہ نے فاضل خاں میر سامان کو رخصت کیا تاکہ یہ امیر لشکر کے زوایدات اور کارخانہ جات کو ہمراہ لے کر راہ رست سے دارالسلطنت لاہور روانہ ہوا اور جہاں پناہ خود شکار کھیلتے ہوئے مخلص پور کی طرف سے پنجاب روانہ ہوئے، بادشاہ دسویں رجب کو لاہور پہنچے۔ جہاں پناہ نے کشمیر کی سیر کا ارادہ کیا اور خدمت گاروں کو راہ کے درست کرنے اور سامان سفر فراہم کرنے کے لئے روانہ کیا۔ پندرہویں

رجب کو قطب الدین خان خویشگی فوجدار جونا گڑھ نے رائے سنگھ ستر سال زمیندار ولایت جام کو جو فساد کا مرکز بن کر خرابیاں پیدا کر رہا تھا مع ایک فرزند اور ایک جماعت اور دوسرے قرابت داروں کے جو کل تین سو آدمی تھے تباہ کیا، رائے سنگھ نے اپنے بھتیجے کو اس کے باپ کے مرنے کے بعد ملک سے بے دخل کر دیا تھا اور خود اس پر قابض تھا، یہ ملک، خانِ مذکور کی کارگذاری سے اسلام آباد ہوا اور ولایت کا نام بھی اسلام نگر تجویز ہوا۔

آسام کے بقیہ واقعات

خان خاناں سپہ سالار نے برسات کا زمانہ بسر کرنے کے لئے متھرا پور میں قیام کیا، تمام حصہء ملک میں سیلاب اور زمین بالکل پانی میں ڈوب گئی، اہل آسام کو مسلمانوں کی اس مجبوری سے حیرت ہوئی اور چونکہ شاہی فوج کے پیادے دریا کو عبور نہ کر سکتے تھے، اہل آسام کی بے باکی حد سے گزر گئی، راجہ بھی رام روپ سے یہاں پہنچ گیا اور اس نے تھانے برخاست کر دیئے، نتیجہ یہ ہوا کہ سوائے گرگاؤں اور متھرا پور کے، باقی حصہ شاہی قبضہ میں نہ رہا، اور غلہ اور چارہ مفقود ہو گیا، ہوا کی سمیت کی وجہ سے وبا پھیلی اور بے شمار انسان ہلاک ہوئے، آسام کے سارے ملک کی یہی حالت ہوئی، حریفوں کا ایک بہت بڑا گروہ کوہستان میں بھی راہی عدم ہوا، اس پریشانی کے زمانہ میں اہل لشکر اور جانوروں کی بسر اوقات چاول اور گائے کے گوشت پر تھی جو بکثرت دشمن سے حاصل ہوئے تھے، اس مصیبت کا علاج سوا صبر کے اور کچھ نہ تھا، لوگ تن بہ تقدیر بیٹھے تھے، اور برسات کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے، زمانہ وسط میں بارش میں کمی ہوئی اور اسی درمیان میں غلہ کی کشتیاں بھی پہنچ گئیں، ربیع الاوّل کے آخر میں ہر چہار طرف زمین نمودار ہوئی اور افواجِ بادشاہی نے چاروں طرف تاخت و تاراج شروع کی اور دشمنوں کے بہت بڑے گروہ کو تہ تیغ کیا۔

راجہ کوہستان میں بھاگ گیا اور اس نے صلح کی درخواست کی سپہ سالار نے راجہ کی التماس قبول نہ کی اور کامروپ پر دھاوا کرنے کا ارادہ کیا انہیں واقعات کے دوران میں خان سپہدار امراض مختلف کا شکار ہوا، اہل لشکر اتنی مصیبت اٹھانے کے بعد بھی سردار کی زندگی سے مایوس ہوئے اور خان مذکور کی وفات کا خیال ان کے لئے باعث پریشانی ہوا، سپاہیوں نے سردار کو چھوڑ کر بنگال بھاگنے کا ارادہ کیا خان اس واقعہ سے آگاہ ہوا اور اسے بے حد رنج ہوا، چوتھی جمادی الاوّل کو سپہ دار

نے ایک منزل اور سفر کیا اور مجبوراً حریف سے صلح کر کے واپس آنے کا ارادہ کیا، راجہ اپنی گرفتاری کو جلد اور یقینی جانتا تھا، اس نے دلیر خان کو واسطہ بنایا اور دلیر خان نے خان خاناں کو راضی کیا جمادی الآخر کی پانچویں تاریخ کو راجہ کے وکیل دربار میں آئے، اور انہوں نے تیس ہزار تولہ سونا اور ایک لاکھ ساٹھ ہزار تولہ چاندی اور پچیس ہاتھی سرکار کے لئے اور پندرہ خان خاناں اور پانچ دلیر خان کے لئے پیش کئے، ان ہدیوں کے ساتھ خود راجہ رام روپ اور راجہ آسام کی جو راجہ روپ کا عزیز قریب تھا بیٹیاں بھی مسلمانوں کے لشکر میں پہنچائی گئیں، ان کے علاوہ راجہ کے ارکینِ دولت کے چار بیٹے بھی بطور یرغمال مسلمانوں کے حوالہ کئے گئے، اور یہ طے پایا کہ جب تک دوسرے پیش کش نہ پہنچ جائیں یہ لڑکے بطور ضمانت بنگال میں مقیم رہیں، دسویں ماہ مذکور کو خان خاناں نے کوہستان کامروپ کے دہانہ سے کوچ کیا اور بنگال کی طرف واپس ہوا۔ خان خاناں بائیسویں تاریخ رکھ کر پہنچا اور تیرہویں رجب کو کجلی سے کوچ کر کے موضع باندر میں جو گواہٹی کے مقابل دریا کے اس طرف آباد ہے اُترا اور رشید خاں کو کامروپ کی فوجداری پر فائز کیا۔

خان خاناں کی وفات

اسی زمانہ میں خان خاناں کی بیماری قابل علاج نہ رہی، سپہ دار کو اپنی زندگی سے ناامیدی ہو گئی، اور اس نے عسکر خاں کو کوچ بہار کی تسخیر کے لئے جس پر بھیم نرائن قابض ہو گیا تھا، نامزد کیا، اور خود خضر پور روانہ ہوا۔ خان خاناں نے دوسری رمضان سنہ 6 جلوس کو ایک مقام پر جو خضر پور سے دو کوس کے فاصلہ پر ہے وفات پائی۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا چھٹا سال

1073ھ/1663ء

پچیسویں رمضان کو سلطنت کے خدام نے جشن جلوس کا سامان شروع کیا۔ یہ جشن باغ دلکشا میں جو دریائے راوی کے دوسرے ساحل پر واقع ہے ترتیب دیا گیا، جہاں پناہ اسی روز سفر کشمیر کے ارادہ سے اس باغ میں رونق افروز ہوئے اور اسی دن خان خاناں کی وفات کی خبر بادشاہ کو معلوم ہوئی، شاہزادہ محمد معظم، محمد امین خاں کے مکان پر گئے اور اسے جہاں پناہ کے حضور میں لے آئے، محمد امین کو خلعت عطا ہوا اور اس کی سوگواری کا زمانہ ختم ہوا، عید کی نماز خیمہ کے مصلے پر پڑھی گئی، اور بادشاہِ دیں پناہ نے شاہزادوں درباریوں اور صوبے کے امراء کو خلعت عطا فرمائے، تیسری شوال کو بادشاہ نے سفر کیا۔

سیوا جی کا شب خون

اس زمانہ کے حوادث میں سیوا جی کا شب خون بے حد مشہور واقعہ ہے۔ سیوا جی نے امیر الامراء کے دائرہ پر شب خون مارا، امیر الامراء نے حریف کا مقابلہ کیا، جس میں اس کے کلمہ کی انگلی کٹ گئی اور اس کا فرزند ابوالفتح خاں قتل کیا گیا، چونکہ یہ واقعہ امیر الامراء کی غفلت سے واقع ہوا، بادشاہ نے صوبوں کی حکومتوں میں تغیر فرمایا، اور محمد معظم کو صوبہ دار دکن اور امیر الامراء کو شاہزادہ کے بجائے صوبہ دار بنگال مقرر کیا، بادشاہ چودھویں شوال کو موضع تھتھر پہنچے۔ یہ جگہ کوہستان کشمیر کا داخلہ ہے، جہاں پناہ نے لاہور میں اس قدر قیام و توقف کیا کہ برف پیر پنجال کی راہ سے بالکل زائل ہو گئی، بادشاہ نے اس راستہ سے کوچ کیا اور حکم دیا کہ راجہ جے سنگھ اور نجابت خاں مع دوسرے زوائد لشکر کے دریائے چناب کے ساحلوں پر قیام کریں، طاہر خاں امراء کے ایک گروہ

کے ساتھ اپنی جاگیر کو روانہ ہوا، اور صف شکن خاں پاسبانوں کی ایک جماعت کے ہمراہ تھتھر کے پائیں ٹھہرے، اور دہانہ کوہ کی حفاظت اور خبرداری میں کوتاہی نہ کرے، اس کے علاوہ بہت سے امیر اور خدام خود بادشاہ کے ساتھ آئیں اور محمد امین خان اور فاضل خاں اس سفر میں بادشاہ کے تین منزل کے فاصلہ سے سفر کریں۔

ایک حادثہ

سولھویں شوال کو تھتھر سے کوچ ہوا، دہشت ناک پہاڑ پیر پنجال کو عبور کرتے ہوئے ایک ہاتھی خوف زدہ ہوکر آگے سے پھرا اور دہانہ کوہ کی طرف واپس چلا، یہ ہاتھی بلائے ناگہانی اور تیز آندھی کی طرح منہ پھیر کر بھاگا اس واقعہ سے انسان وحیوان سب پر مصیبت نازل ہوئی، کئی سرکاری ہتھنیاں جن پر انسان سوار تھے اس کوہ راول کی ٹکر سے ہلاکت کے غار میں گر پڑیں، اور ایسی تباہ ہوئیں کہ ان کی ہڈیوں کا نشان بھی نہ ملا، جب ان کوہ پیکر جانوروں کا یہ حال ہوا تو انسان کا کیا ذکر۔

اس واقعہ سے بادشاہِ ذرّہ پرور کی طبیعت اس قدر پریشان ہوئی کہ اسی زمانہ سے جہاں پناہ نے یہ مصمم ارادہ کرلیا کہ اب دوبارہ کشمیر کا سفر نہ فرمائیں گے۔

یکم ذی قعدہ کو بادشاہ کشمیر پہنچے راجہ رَگھناتھ کشمیر کے صاحب دیوان نے وفات پائی اور شہر مذکور کی وزارت پر فاضل خان اور خان سامانی کے عہدے پر افتخار خاں فائز کئے گئے، اعلیٰ حضرت کے زمانۂ حکومت میں ہر سال پانچ ماہ تک اُناسی ہزار روپیہ کی خیرات صدر الصدور کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور دیگر سات ماہ کے لئے کوئی منظورہ رقم نہ تھی، جہاں پناہ نے حکم دیا کہ پانچ ماہ تو حسب دستور سابق اسی قدر رقم خیرات کی جائے اور دیگر سات ماہ کے لئے ستر ہزار روپیہ مزید منظور فرمائے جاتے ہیں، یعنی ہر مہینہ دس ہزار روپیہ کی تقسیم کی جائے، غرض کہ سال میں ایک لاکھ اُنچاس ہزار روپیہ کی تقسیم اہل استحقاق کے لئے منظور فرمائی گئی۔

جشن وزن قمری

ذی قعدہ کی سترہویں تاریخ کو وزن قمری ہوا اور سینتالیسواں سال بادشاہ کی عمر کا شروع ہوا،

تمام درباری اور صوبہ جات کے امراء اور حکام ہر طرح کے عطیوں سے سرفراز ہوئے، فاضل خان مرتبہ دیوانی پر فائز ہونے کے بعد شدید بیمار ہوا اور ستائیسویں ذی قعدہ کو اس نے وفات پائی، فاضل خاں کا برادر زادہ برہان الدین جو حال ہی میں ایران سے آیا ہوا تھا، خلعت پا کر گوشہء ماتم سے نکلا اور بادشاہ کی عنایتوں سے سرفراز ہوا، بادشاہ کشمیر کے تمام تفریح بخش مقامات کی سیر سے فارغ ہو کر بائیسویں محرم کو اس دل کشا شہر سے کوچ فرما کر لاہور روانہ ہوئے۔

جعفر خاں صوبہ دار مالوہ وزارت کی خدمت پر سرفراز ہونے کے لئے طلب کیا گیا، اور نجابت خاں اس کی جگہ پر مقرر کیا گیا۔ ساتویں ربیع الاوّل کو بادشاہ کی سواری مع شاہی لشکر کے دارالسلطنت لاہور پہنچی۔

جشن وزن شمسی

گیارہویں ربیع الثانی کو جشن وزن شمسی منعقد ہوا۔ اور چھیالیسویں سال کا آغاز ہوا۔

عاقل خاں لاہور میں گوشہ نشین تھا، جہاں پناہ کی عنایت سے منصب دو ہزاری اور سات سو سوار پر فائز ہو کر دوبارہ خدام درگاہ کے گروہ میں داخل ہوا، تربیت خاں شاہ ایران کے نامہ کا جواب لے کر جسے بداق بیگ ایران سے ہندوستان لایا تھا، مع نادرالوجود تحفوں کے جن کی قیمت ساٹھ لاکھ روپیہ تھی، سفارت کے مرتبہ پر فائز ہوا اور ایران روانہ کیا گیا۔

سترہویں ربیع الثانی کو بادشاہ پائے تخت کی طرف روانہ ہوئے، جعفر خاں نے پانی پت میں سعادت ملازمت حاصل کی اور وزارت کے بلند مرتبہ پر فائز ہوا، ماہ مذکور کے آخر میں جہاں پناہ پائے تخت تشریف لائے۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا ساتواں سال

1074ھ/1664ء

اس اطمینان کے زمانہ میں ماہِ مبارکِ رمضان کا چاند دکھائی دیا، اور جشن جلوس کی تیاری کی گئی، جہاں پناہ نے عید کی نماز سے فارغ ہو کر تختِ سلطنت پر جلوس فرمایا، اور شاہزادوں امیروں اور محتاجوں غرض کہ ہر شخص کی آرزو برآئی، پیش کش اور تحفے جہاں پناہ کے ملاحظہ میں گزرائے گئے، اور بادشاہ نے ان ہدیوں کو شرف قبولیت عطا فرمایا، اکیسویں ذی قعدہ کو وزن قمری کا جشن ترتیب دیا گیا، اور جہاں پناہ کی زندگی کا اڑتالیسواں سال شروع ہوا شہزادہ محمد معظم کا معروضہ ملاحظہ میں پیش ہوا جس سے معلوم ہوا کہ شاہزادہ کے محل میں محمد معز الدین کی والدہ کے بطن سے فرزند پیدا ہوا، جہاں پناہ نے مولود کو اعزالدین کے نام سے موسوم کیا۔ مصطفےٰ خاں، خوانی سفیر بنا کر توران روانہ کیا گیا، اور ایک خط جس کو دانش مند خاں نے اپنے قلم سے لکھا تھا مع نادرالوجود تحفوں کے جن کی قیمت ایک لاکھ پچاس ہزار روپیہ تھی، عبدالعزیز خاں والیٔ بخارا کے نام، اور ایک نامہ مع بیش قیمت ہدیوں کے جو ایک لاکھ روپیہ سے کم قیمت کے نہ تھے سبحان علی خاں والیٔ بلخ کے نام بھیجا گیا۔

سیواجی کی سرکوبی کا حکم

اس زمانہ میں اگرچہ مہاراجہ جسونت سنگھ نے سیواجی کے تباہ کرنے اور ملک کو برباد کرنے اور اس کے قلعوں کو فتح کرنے میں پوری کوشش کی تھی، لیکن بادشاہ کی خواہش کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہوا تھا، اس لئے جہاں پناہ نے راجہ جے سنگھ کو نامی امراء کے ایک گروہ کے ساتھ سیواجی کی سرکوبی پر مقرر فرمایا، انیسویں ربیع الاوّل کو وزن شمسی کا جشن منعقد ہوا اور بادشاہ نے سینتالیسویں مرحلہ میں

قدم رکھا، شاہزادے اور خواتین، شاہانہ نوازشوں سے سرفراز ہوئے، اس دوران میں معلوم ہوا کہ نجابت خاں صوبہ دار مالوہ نے وفات پائی، جہاں پناہ نے اس صوبہ کے ملکی اور مالی مہمات کا انتظام وزیر خاں صوبہ دار خاندیس کے سپرد کیا، اور داؤد خاں کو جو راجہ جے سنگھ کی امداد کو گیا ہوا تھا خاندیس کا حاکم مقرر کیا۔ اور اس کے نام اس مضمون کا فرمان صادر ہوا، کہ اپنے کسی عزیز کو برہان پور میں چھوڑ کر خود خاندیس روانہ ہو جائے۔

شاہزادہ محمد معظم کے معروضہ سے معلوم ہوا کہ چھبیسویں جمادی الاوّل کو شاہزادہ کے محل میں روپ سنگھ راٹھور کی دختر کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا ہے، بادشاہ نے مولود کو محمد عظیم کے نام سے موسوم کیا۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا آٹھواں سال

1075ھ/1665ء

ماہ رمضان کا مبارک مہینہ آ گیا اور عہد معدلت کا آٹھواں سال شروع ہوا، جشن جلوس ترتیب دیا گیا اور جہاں پناہ نے عید کی نماز سے فراغت کر کے اپنی شاہانہ نوازشوں سے نمک خواروں کو اور زیادہ اپنا گرویدہ اور شیدائی بنایا۔

حاجی احمد سعید جو جلوس شاہی کے چوتھے سال چھ لاکھ ساٹھ ہزار روپیہ حرمین شریفین کی نذر لے کر سلطنت کی طرف سے گیا ہوا تھا، واپس ہو کر سعادت ملازمت سے سرفراز ہوا، اور اس نے چودہ عربی گھوڑے جہاں پناہ کے ملاحظہ میں پیش کیے۔

شریف مکہ کا قاصد سید یحییٰ بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا، اور اس نے تین گھوڑے اور تبرکات بادشاہ کے سامنے پیش کیے، جہاں پناہ نے سید یحییٰ کو خلعت فاخرہ اور چھ ہزار روپیہ کے انعام سے سرفراز فرمایا۔ والیٔ حبش کا سفیر سیدی کامل اور سید عبداللہ حاکم حضرموت کا قاصد دونوں نادرالوجود تحائف و ناموں کے ساتھ جہاں پناہ کے ملاحظہ میں پیش ہوئے، اور بادشاہ دیں پناہ نے ان قاصدوں کو عطائے خلعت اور نقدی سے سرفراز فرمایا، اسی زمانہ میں نو عربی گھوڑے حاکم یمن امام اسماعیل کے فرستادہ ملاحظہ عالی میں پیش کیے گئے اور یہ جشن پانچ روز کامل باعث رونق عالم رہا، بندگانِ دولت کو معلوم ہوا کہ اعتبار خاں حارس (حاکم) اکبرآباد نے وفات پائی، جہاں پناہ نے رعد انداز خاں حاکم نواح اکبرآباد کو مرحوم کی جگہ مقرر فرمایا۔ اور رعد انداز کی خدمت پر ہوشدار خاں صوبہ دار مامور کیا گیا۔

آٹھویں ذی قعدہ کو مہاراجہ جسونت سنگھ دکن کی مہم سے واپس آ کر سعادت ملازمت سے

سرفراز ہوا، سترہویں شوال کو وزن قمری کا جشن منعقد ہوا۔ اور 1075 ہجری کے اعتبار سے بادشاہ کی عمر کا انچاسواں سال شروع ہوا۔ بادشاہ ذرہ پرور نے درباری صوبجات کے امیروں اور ملازموں کو شاہانہ نوازشوں سے سرفراز فرمایا۔ مکہ معظّمہ اور حبش اور حضرموت کے قاصد گراں بہا اجناس اور نقدی کے انعام سے شادکام ہوئے اور انہیں ہندوستان سے واپس جانے کی اجازت مرحمت ہوئی۔ دسویں ذی الحجہ کو عیدالضحیٰ کی مسرت نے رعایا کے دلوں کو وہ چند شادومسرور کیا۔ اور ذی الحجہ کی انیسویں تاریخ جشن عید گلابی میں بلند اقبال شہزادوں اور نامور امیروں نے مرصع اور مینا کار صراحیاں ملاحظہء سلطانی میں پیش کر کے فخر ومنزلت حاصل کی۔

سیوا جی کی درخواست

اسی دوران میں معلوم ہوا کہ راجہ جے سنگھ، دلیر خاں اور دوسرے صف شکن خاں امیروں کی سعی وکوشش سے سیوا جی کے مقبوضات میں سے پورن دھر، رودھر مال اور دوسرے قلعے فتح ہو چکے اور سیوا جی نے اپنی تباہی کا یقین ہونے کے بعد قاصد راجہ کے پاس بھیجے اور اس سے سامان کا خواست گار ہوا، راجہ نے مناسب شرائط پر سیوا جی کی درخواست قبول کی اور مرہٹہ سردار نے تئیس قلعے شاہی امراء کے سپرد کر کے اپنی جان بچائی۔

سیوا جی قلعوں کی سپردگی کے بعد آٹھویں ذی الحجہ کو غیر مسلح، راجہ کے پاس آیا، اور اس سے ملاقات کی، راجہ جے سنگھ نے سیوا جی سے مصافحہ کیا اور بڑی تعظیم وتکریم کے ساتھ اسے اپنے پاس بٹھایا اور اس کی جان و مال کو امان دے کر سیوا جی کو شمشیر اور جمدھر مرصع عطا کیا، اور اس کے بعد سیوا جی کو دلیر خاں کے پاس بھیجا، دلیر خاں نے مرہٹہ سردار کے ساتھ مناسب رعایتیں کیں۔

جہاں پناہ کو ان واقعات کا علم ہوا اور بادشاہ نے راجہ جے سنگھ کے معروضہ کے مطابق سیوا جی کے نام امان نامہ لکھ کر روانہ فرمایا۔ بادشاہ نے سیوا جی کے فرزند سنبھا جی کو پنج ہزاری منصب دار اور پانچ ہزار سواروں کا امیر مقرر فرمایا، ہندوستان کے راجاؤں کا سرتاج مہاراجہ جے سنگھ حسن خدمت کے صلہ میں شاہانہ نوازشوں سے سرفراز کیا گیا، راجہ کے منصب ومراتب میں ترقی ہوئی اور بادشاہ نے جے سنگھ کو ہفت ہزاری منصب دار اور ساٹھ ہزار سوار دو اسپہ اور سہ اسپہ کا امیر مقرر فرمایا۔

عادل خاں بیجاپوری پیش کش ادا کرنے میں سستی سے کام لیتا اور سیوا جی کو مدد دینے میں

نے جواہرات و مرصع آلات، جہاں پناہ کے ملاحظہ میں پیش کیے، خواجہ اسحاق کاشغر کی سفارت پر مامور ہوا تھا لیکن ملک کے اندرونی فتنہ و فساد کا حال سُن کر راستہ ہی سے واپس آیا تھا، جہاں پناہ نے خواجہ مذکور کو بار دگر اسی خدمت پر مامور کر کے کاشغر روانہ ہونے کا حکم دیا۔

والیٔ ایران کی وفات

والیٔ ایران، فرخ آباد سے اصفہان روانہ ہوا۔ لیکن خناق کے مرض میں گرفتار ہو کر اسی سال غرہ ربیع الاوّل کو موضع خارسمان میں دنیا سے کوچ کر گیا، ایران کے ارکان دولت نے شاہ ایران کے فرزند بزرگ صفی میرزا کو تخت حکومت پر بٹھایا، چوتھی جمادی الآخر کو بادشاہ کو شکار گاہ میں عرائض نویسوں کے معروضوں سے اس واقعہ کی خبر ہوئی اور بادشاہ نے فرمایا کہ میری خواہش تو کچھ اور ہی تھی لیکن خدا نے خود اسے اس کی بدنیتی کی سزا دی اب یہ انسانیت کا تقاضا نہیں ہے کہ ایران کی سرزمین پر فوج کشی کی جائے، بادشاہ زادہ محمد معظم کے نام شاہی فرمان صادر ہوا کہ لاہور سے قدم آگے نہ بڑھائے بلکہ چند روز اسی شہر میں قیام پذیر رہے، بہادر خاں بادشاہ زادہ کے ہم رکاب تھا مگر اس سے رخصت ہو کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صوبہ الٰہ آباد کے انتظام پر مامور کیا گیا۔

سیوا جی کے داماد کی گرفتاری

راجہ جے سنگھ نے سیوا جی کے داماد نیتو کو گرفتار کر کے شاہی بارگاہ میں بھیج دیا، نیتو، فدائی خاں کے سپرد کیا گیا اور اس کی ہدایت سے مسلمان ہو کر دین و دنیا کی سعادت سے بہرہ مند ہوا، راجہ جے سنگھ، سیوا جی کی مہم سر کرنے کے بعد جرار فوج ہمراہ لے کر عادل خاں کی تنبیہ کو گیا ہوا تھا، دو منزلیں طے کرنے کے بعد عادل خاں کے سرداروں میں سے ابوالمحمد بہلول نے راجہ سے ملاقات کی اور راجہ کی التماس کے موافق پنج ہزاری منصب دار اور پانچ ہزار سواروں کا سردار مقرر ہو کر راجہ کے مددگاروں میں شامل کیا گیا، راجہ کی رائے اور سیوا جی اور نیتو کی کوشش سے پھلتن اور ناتھورہ اور کھاون اور منگل بید کے قلعے فتح ہوئے۔

اسی دوران میں جنگ آزما اور بہادر اہل لشکر نے ابوالمحمد نبیرہ سے عادل خاں و خواص خاں کی تنبیہ کے لئے اکثر معرکہ آرائیاں کیں اور ہر معرکہ میں بادشاہی جاں نثار کامیاب رہے اور تمام

متعلقات بیجاپور بارِ دگر تاخت و تاراج کر دیئے گئے، عادل خاں نے قلعہ بیجاپور کو مستحکم کیا اور تالابوں کو توڑا اور کنوؤں کو توڑ کے درختوں سے پاٹ کر بیرون حصار کے مکانات کو زمین کے برابر کر دیا اور خود قلعہ میں پناہ گزیں ہو کر اپنی فوج کو شاہی لشکر کی مدافعت کے لئے مقرر کیا۔ راجہ کو قلعہ کا فتح کرنا مقصود نہ تھا اور نیز یہ کہ اس وقت قلعہ کشائی کے سامان اور اسباب بھی موجود نہ تھے، اس لئے چند روز اسی نواح میں قیام کر کے یہاں سے کوچ کر گیا، چوبیس رجب کو راجہ نے دریائے بہورا کو عبور کیا۔ عادل خاں کے معتمد مسمی دیانت خاں نے عذر آمیز پیغام راجہ کے پاس روانہ کر کے مرصع آلات بطور تحفہ پیش کئے چونکہ برسات کا زمانہ آیا اور شاہی حکم بھی راجہ کے نام صادر ہوا کہ موسم برشگال اورنگ آباد میں بسر کرے راجہ جے سنگھ نے شاہی حکم کی تعمیل میں یہاں سے بھی کوچ کیا۔

اسی زمانہ میں دلیر خاں فرمان شاہی کے مطابق ولایت چاندہ میں داخل ہوا مانجی ملار زمیندار چاندہ نے خان مذکور پانچ لاکھ روپیہ دے کر ایک کروڑ روپیہ بطور جرمانہ شاہی خزانہ میں داخل کیا اور دو لاکھ روپیہ سالانہ پیش کش ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ خان مذکور چاندہ سے دیوگڑھ روانہ ہوا اور کوک سنگھ حاکم دیوگڑھ سے مبلغ پندرہ لاکھ روپیہ سابقہ رقم وصول کی اور تین لاکھ سالانہ اس پر خراج مقرر کیا ان خدمات کو انجام دے کر راجہ حکم شاہی کے مطابق پھر دکن روانہ ہوا اور بادشاہِ خدّام نواز نے راجہ کو منصب پنج ہزاری و پنج ہزار سوار دو اسپہ وسہ اسپہ مرحمت فرمایا۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا دسواں سال

1077ھ/1667ء

رمضان کا مقدس مہینہ آیا اور اراکینِ دولت جشن کی تیاری وانعقاد میں مصروف ہوئے۔

ماہ مبارک کی دسویں تاریخ شاہی حرم سرا میں اودے پور کی عفت مآب رانی کے بطن سے فرزند پیدا ہوا، قبلہء عالم نے مولود کو محمد کام بخش کے نام سے موسوم کیا۔

شاہزادہ محمد معظم لاہور سے واپس آ کر پائے بوسی سے مشرف ہوئے۔

ماہِ صیام ختم ہوا، اور عید کا چاند نمودار ہوا، قبلہء عالم نے نماز سے فراغت حاصل کر کے تخت حکومت پر جلوس فرمایا اور شاہزادوں اور امیران عالی رتبہ کو شاہانہ نوازشوں سے سرفراز کیا۔

سیوا جی کا داماد نیتو مشرف بہ اسلام ہوا، ختنہ کے بعد عنایتِ سلطانی نے اسے منصب ہزاری ودو ہزار سوار مرحمت فرما کر محمد قلی خاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

میر عماد الدین دیوان بیوتات کو رحمت خاں اور عزیز الدین کو بہرہ مند خاں کے خطابا عطا ہوئے۔

اس ماہ کی ساتویں تاریخ شاہزادہ محمد معظم دکن کی صوبہ داری پر روانہ ہوئے اور پنج ہزار ہشت ہزاری دوازدہ ہزار سوار کے اضافہ سے سرفراز کئے گئے، مہاراجہ جسونت سنگھ ورائے صف شکن خان وسیف خاں وسر بلند خاں شاہزادہ کے ہمراہ کئے گئے، راجہ جے سنگھ کو حکم ہوا کہ شا آستانہ پر حاضر ہو۔

یوسف زئی افغانوں کی فتنہ انگیزی

یوسف زئی افغانوں کی شورش وفتنہ انگیزی کی اطلاع ملی، اور معلوم ہوا کہ ان شورہ پشتو

نے ایک مجہول فقیر کو محمد شاہ کے لقب سے اپنا سردار بنایا ہے اور چالاک درویش نے مکاری وفریب دہی سے فتنہ وفساد برپا کر رکھا ہے فوجدار اٹک مسمی کامل خاں کو حکم ہوا کہ نواح نیلاب کے تمام فوج دار و جاگیردار اتفاق کر کے ان بدبختوں سے معرکہ آرائی کریں، امیر خاں صوبہ دار کابل کے نام اس مضمون کا فرمان صادر ہوا کہ شمشیر خاں کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ ان فتنہ انگیزوں کی مدافعت پر مقرر کرے، کامل خاں نے اپنی کارطلبی سے شمشیر خاں کی آمد کا انتظار نہ کیا اور حریف کے ساتھ شدید معرکہ آرائی کر کے ان پر غلبہ حاصل کیا، اور شاہی مقامات پر دوبارہ قابض ہو گیا۔

اٹھارہویں ذی قعدہ کو امیر خاں نے دریائے نیلاب کو عبور کیا اور اٹک کی سمت روانہ ہو کر یوسف زئی قبیلہ کے ملک کے برابر پہنچ گیا افغان، کوہستان میں پناہ گزیں ہو کر موقع کے منتظر رہے۔

اسی تاریخ بادشاہ نے محمد امین خاں میر بخشی امیر خاں، قباد خاں اور دوسرے امیروں کے ہمراہ نو ہزار سواروں کی جمعیت کو ان شورہ پشتوں کی تنبیہ کے لئے تخت گاہ سے روانہ کیا، امین خاں کے ورود سے پیشتر شمشیر خاں نے دوبارہ شدید معرکہ آرائی کر کے تین سو قیدی جو معزز گھرانوں کے رکن تھے گرفتار کر لئے، بادشاہ کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی اور قبلہء عالم نے شمشیر خاں و کامل خاں کو شاہانہ نوازش سے سرفراز فرمایا۔

پچیس ذی قعدہ کو جشن وزن قمری ترتیب دیا گیا، اور بادشاہ کی عمر کا اکاون سال شروع ہوا، اس مبارک بزم میں شاہزادہ محمد اعظم سہ ہزاری کے اضافہ سے پانژدہ ہزاری وہفت ہزار سوار کے منصب دار مقرر فرمائے گئے اور شاہزادہ محمد اکبر ہشت ہزاری دو ہزار سوار سے منصب اور تومان و طوغ و نقارہ و آفتاب گیر کے عطیہ سے بہرہ یاب ہوئے جمدۃ الملک جعفر خاں و دیگر پرستارانِ حضور پر طرح طرح کی نوازش فرمائی گئی۔

بلخ و بخارا کے سفیر یعنی رستم بے وخوشی بیگ کو خلعتوں اور نقدی رقومات کے عطیات سے سرفراز فرما کر واپسی کی اجازت مرحمت ہوئی، غرض کہ سفیر بخارا کو اوّل سے آخر تک دو لاکھ اور سفیر بلخ کو ایک لاکھ پچاس ہزار کی رقم عطا ہوئی۔

رضوی خاں بخاری بجائے عابد خاں کے منصب وزارت پر فائز ہوا۔

تربیت خاں کا قصور معاف فرمایا گیا۔ اور خداوند خاں کے انتقال کے بعد اڑیسہ کا صوبہ دار

مقرر ہوا۔

راجہ جے سنگھ کی وفات

برہان پور کے عرائض نویسوں کی عرض داشتوں سے معلوم ہوا کہ راجہ جے سنگھ اورنگ آباد روانہ ہوکر آستانہء شاہی پر حاضر ہورہا تھا لیکن اٹھائیسویں محرم کو راستہ میں وفات پائی۔ قبلہء عالم نے اس کے فرزند کنور رام سنگھ کا جوان دنوں معتوب تھا قصور معاف فرما کر کنور مذکور کو راجہ کا خطاب عطا فرمایا۔ اور اس پر بیحد نوازش فرمائی، محمد امین خاں افغانوں کے ملک میں پہنچ کر ان کے مسکن و وطن کو بخوبی تاخت و تاراج کر چکا تھا، قبلہء عالم نے خان مذکور کے نام اس مضمون کا فرمان روانہ فرمایا کہ شمشیر خاں کو ولایت افاغنہ میں چھوڑ کر خود لاہور روانہ ہو اور بجائے ابراہیم خاں کے لاہور کی صوبہ داری کا کام انجام دے۔

پچیس جمادی الآخر کو جشن وزن شمسی ترتیب دیا گیا، اور بادشاہ کی عمر گرامی کا پچاسواں سال شروع ہوا۔

عبداللہ خاں والیٔ کاشغر شاہی ملازمت میں

کشمیر کے واقعہ نویسوں کے معروضات اور تبت کے زمیندار مراد خاں کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ خان والا شان عبداللہ خاں والیٔ کاشغر اپنے فرزند بوبرص خاں کی نانہجاری کی وجہ سے ترکِ وطن کر کے شاہی ملازمت میں حاضر ہوا ہے عبداللہ خاں کے اہل وعیال اور چند ملازم بھی اس کے ہمراہ ہیں، خان نالائق فرزند کے تسلط سے بے سروسامان و غارت زدہ بارگاہ شاہی میں فریادرسی کے لئے آرہا ہے، خواجہ اسحاق جو سفیر بن کر اس کے پاس گیا تھا، راستہ میں عبداللہ خاں سے ملا ہے اور اس کو مصائب سے نجات دینے میں بے حد کوشش کر رہا ہے، قبلہء عالم نے اپنی شاہانہ مہربانی سے خواجہ صادق بدخشی وسیف اللہ کو اس موروثی خان والا شان کی ضیافت و مہمان داری کے لئے مقرر فرمایا اور ایک بیش قیمت خنجر و جیغہء مرصع اور ایک سو نو عربی و عراقی و ترکی گھوڑے جن میں سے بعض ساز مرصع سے مزین اور دو ہاتھی اور اکثر طلائی و نقرئی برتن اور چند عدد ملبوس و بہترین کپڑے و خیمہ و خرگاہ و نفیس فرش و دیگر سامان حشمت ان امیروں کی معرفت ارسال

فرما کر حکم دیا کہ قاصد جلد سے جلد کشمیر پہنچ کر عبداللہ خاں سے ملاقات کریں اور خان مذکور کے بادشاہ تک پہنچنے میں اثنائے سفر جہاں جہاں قیام ہو، مہمان نوازی کے خدمات بخوبی بجالائیں، مختار خاں صوبہ دار کشمیر کے نام شاہی فرمان صادر ہوا کہ عبداللہ خاں جب کشمیر پہنچے تو اس کے تمام ضروریات کا سامان اور مبلغ پچاس ہزار روپیہ اس صوبہ کے خزانہ سے پیش کرے، جب عبداللہ خاں شاہی آستانہ پر حاضری کا قصد کرے تو مختار خاں خود بھی اس کے ہمراہ شاہی بارگاہ میں حاضر ہو۔

محمد امین خان صوبہ دار لاہور کے نام فرمان صادر ہوا کہ عبداللہ خاں کے لاہور پہنچنے پر اس کا پورا اعزاز و اکرام کرے اور بہترین ضیافت کر کے عمدہ طریقہ پر اس خدمت کو انجام دے اور پچاس ہزار روپیہ خالصہ شریفہ سے اور معتدبہ رقم اور قیمتی لباس اپنی جانب سے خان مذکور کی نذر کرے اسی طرح تمام حکام ممالک کے نام احکام صادر ہوئے کہ خان مذکور کی خاطر و مدارات میں کسی قسم کی کمی نہ ہونے پائے اور ہر افسر کو یہ تاکید کی گئی کہ مہمان کو بے حد عزت و شان کے ساتھ اپنے حدود حکومت سے رخصت کرے۔

تیرہ رجب کو دانش مند خاں بجائے محمد امین خاں کے بخشی گری کے معزز عہدہ پر فائز ہوا، اور اسے خلعتِ خاص و قلم دان مرصع عطا فرمایا گیا۔

اسی زمانہ میں معتمد خاں کی جگہ پر خواجہ بہلول گوالیار کا قلعہ دار مقرر ہوا اور اس امیر کو بھی خلعت خاص و خنجر و خطاب خدمت گار خاں کے عطیہ سے سرفرازی بخشی گئی، اور خدمت گار خاں کو خدمت گزار خان کا خطاب مرحمت ہوا۔

بنگالہ کے حالات

بنگالہ کے واقعہ نویسوں نے اطلاع دی کہ اس زمانہ میں آسامیوں کے ناہنجار گروہ نے پھر ناعاقبت اندیشی سے کام لیا۔ اور اپنے حد اقتدار سے قدم آگے بڑھا کر ایک کثیر جماعت کے ہمراہ گواہٹی پر بنگالہ کی سرحد ہے حملہ آور ہوئے، فیروز خاں نے ان بدبختوں کا مقابلہ کیا، لیکن چونکہ خان مذکور کو کسی قسم کی مدد نہیں پہنچی، حریف نے گواہٹی پر قبضہ کرلیا۔ اور فیروز خاں اکثر جاں نثاروں کے ہمراہ میدان جنگ میں کام آیا۔ قبلہء عالم نے یہ خبر سنی اور طے فرمایا کہ دربارِ شاہی کے کسی عمدہ امیر کو حریف کی تباہی کے لئے مامور کیا جائے، اور خود صوبہء بنگالہ کا امدادی لشکر بھی اس امیر کے

ساتھ مل کرنا عاقبت اندیش مجرمین کا قلع قمع کرے، اس قرارداد کے مطابق جہاں پناہ نے راجہ رام سنگھ کو اس مہم کے لئے نامزد فرمایا، اور اکیسویں ماہ مذکور کو راجہ کو اسپ وخلعت وسازِ طلائی وجمدھر مرصع وعلاقہ مروارید عطا فرما کر روانہ کیا، نصرت خاں، کبیر سنگھ بھورتیہ، رگھناتھ سنگھ و بیرم و یو بیسودیہ ودیگر امراء اور ایک ہزار پانچ سو احدی اور پانچ سو برق انداز راجہ کے ہمراہ روانہ کئے گئے۔

☆☆☆☆☆

تمہید

بعد حمت ونعت کے محمد ساقی مستعد خاں عرض کرتا ہے کہ کتاب عالمگیر نامہ مصنفہ میرزا محمد کاظم میں بادشاہ دیں پناہ ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی رحمتہ اللہ علیہ رحمتہ واسعتۂ کے عہد معدلت کے صرف دہ سالہ واقعات مندرج ہیں، جن کا خلاصہ سابقہ اوراق میں ہدیہء ناظرین ہو چکا، میرزا محمد کاظم عہد سلطانی کے بیشتر واقعات اس وجہ سے قلم بند نہ کر سکے کہ بادشاہ دیں پناہ، باطنی آرائش کے مقابلہ میں ظاہری نام ونمود کو قطعاً ہیچ تصور فرماتے تھے، اس لئے مرزا موصوف کو عہدِ معدلت کے حالات لکھنے سے ممانعت فرما دی گئی، حضرت خُلد مکاں کی رحلت کے بعد امیر پاک طینت صدر دیوان وزارت نواب عنایت اللہ خاں مرید خاص حضرت شاہ عالم گیر نے بادشاہ جہاں پناہ ابوالنصر قطب الدین محمد شاہ عالم بہادر بادشاہ غازی کے عہد معدلت میں خاکسار سے فرمایا کہ حضرت خلد مکاں کے عہد حکومت کے چہل سالہ واقعات و نیز حضرت کے احکام وانتظام صرف سینوں میں محفوظ ہیں، جو ہنوز سفینہ پر نہ آئے، ظاہر ہے کہ کارنامہء عالمگیری کا مدون نہ ہونا۔ ایک وقت میں انہیں قطعاً فراموش کردے گا۔ چونکہ تم حضرت خلد مکاں کے عقیدت شعار خادم ہو اور نیز یہ کہ فن انشاء میں بھی عمدہ سلیقہ رکھتے ہو، میرے خیال میں تم اس کام کو انجام دینے پر کمر ہمّت باندھو اور جس طرح ممکن ہو اس تالیف کو تمام کرو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ کام بے حد مشکل اور میری قابلیت و ہمت سے بالا ہے چونکہ وزارت پناہ حضرت خلد مکاں کے خادم بااخلاص و دل دادہ ہیں، اوران کا مدعا صرف یہ ہے کہ مرحوم کے واقعات کسی نہ کسی طرح قلم بند ہو جائیں، ممدوح نے میری معذرت کو قبول نہ فرمایا اور خاکسار ہی کو اس امر کے انجام دینے پر مجبور کیا، چونکہ خاکسار حضرت خلد مکاں کا نمک خوار و خانہ زاد اور وزارت پناہ کا بندۂ احسان ہے، اس

بارکو اپنے کاندھے پر اٹھانے کے لئے مجبور ہوا۔اس کتاب میں چشم دید واقعات کے علاوہ شنیدہ
حادثات مذکور ہیں وہ تمام تر قابلِ وثوق ناقلین کی روایتیں ہیں جو ہر طرح قابل اعتبار ہیں۔

چونکہ یہ کتاب بادشاہ خلد مکاں کے تمام حالات وفتوحات پر حاوی ہے اس لئے میں نے اس کتاب کو مآثر عالمگیری کے نام سے جو اس کا تاریخی نام بھی ہے موسوم کیا ہے، ہر چند بہ مقتضائے مثل مشہور ''خوان ناکشیدہ یک عیب است وکشیدہ صد عیب'' لیکن اپنی استطاعت کے موافق جو میرا سرمایہ ہے مہمان کے سامنے حاضر ہے، خدا کا شکر ہے جس نے مجھے اس مختصر مگر جامع تالیف کے مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائی، امید ہے کہ یہ قیمتی گوہر ارباب نظر کی نگاہ میں مقبول ثابت ہوگا، لیکن اگر اس آب دار موتی پر نقصان وخطا کی تیرگی کی کچھ جھلک نمودار ہو تو اسے جو ہر سنج حضرات اپنی اصلاح کی تنویر سے دور فرمائیں۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا گیارھواں سال

1078ھ/1668ء

اسی مبارک زمانہ میں رمضان کا مقدس مہینہ آیا، عہد معدلت کا دسواں سال ختم ہو کر گیارھواں سال شروع ہوا، خدام بارگاہ جشن کے انعقاد میں مصروف ہوئے، رمضان کا پورا مہینہ دن کو صوم اور رات کو طاعتِ الٰہی میں بسر ہوا۔ یہ مقدس زمانہ گزر گیا اور عید کا مسرت خیز چاند افق آسمان پر نمودار ہوا، بادشاہ دیں پناہ نے نماز عید الفطر ادا فرما کر دیوان خانہ ءعام میں جلوس فرمایا، بادشاہ زادوں اور امیروں نے آداب وتسلیمات کے بعد مبارک باد عرض کی اور اضافہ ءخلعت و خطابات سے سرفراز کئے گئے۔

شاہزادہ محمد معظم کو خلعت و دھرپ مرصع اور شاہ زادہ محمد اکبر کو خلعت مرحمت ہوا۔ جمدۃ الملک جعفر خاں کو خلعت و خنجر مع دستہ سیمیں مرصع عنایت کیا گیا۔ دانش مند خاں، میر بخشی خلعت و فیل کے علاوہ اضافہ ءمنصب دو ہزار پانچ صدی و یک صد سوار سے، ہمت خاں دو ہزار پانچ صدی یک ہزار و دو صد سوار لطف اللہ خاں ہزار و پانصدی پان صد سوار سے سرفراز فرمائے گئے، محمد اسمٰعیل ولد اسد خاں ابتداء منصب سہ صدی پر فائز ہوا، محمد یعقوب ولد شیخ میر چہار صدی یک صد سوار کا منصب دار تھا دو سو سواروں کا اور اضافہ فرمایا گیا۔

ابراہیم خاں بجائے لشکر خان کے صوبہ ءبہار کا ناظم مقرر ہوا۔ مہابت خاں صوبہ دار احمد آباد وگجرات شاہی ملازمت میں حاضر ہوا اور بجائے سید امیر خاں کے دارالملک کابل کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔

نغمہ ونشاط پر پابندی

چونکہ بادشاہ دیں پناہ کو فطرتاً لہو ولعب ونغمہ ونشاط سے رغبت نہیں اور اپنی انصاف پرستی وخدا

شناسی کی وجہ سے عیش وطرب کی طرف کم توجہ فرماتے ہیں اس لئے فرمان صادر ہوا کہ سرگروہِ ارباب نشاط خوش حال خاں، بہرام خاں رس پین و دیگر موسیقی داں صرف مجرائے شاہی کے لئے دربار میں حاضر ہوں لیکن نغمہ پردازی نہ کریں، مگر آخرِ میں بتدریج ان کی حاضری بھی بند ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قلیل عرصہ میں ہر خردہ بزرگ کے دل سے نغمہ وسرود کی آرزو قطعاً جاتی رہی۔

عبداللہ خاں کی آمد

آٹھویں شوال کو خان والا منزلت عبداللہ خاں تخت گاہ کے نواح میں پہنچا، خان مذکور ایک باغ میں فروکش ہوئے، اوران کی مہمان داری کا سامان بہ خوبی کیا گیا، گیارہویں ماہ مذکور امیر کبیر جمدۃ الملک جعفر خاں واسد خاں بیرون شہران کے استقبال کے لئے گئے اور عبداللہ خاں نے اسی طرح سواران امیروں سے مصافحہ کیا، خان مذکور دروازۂ خاص و عام تک سوار آیا اور یہاں سے پالکی پر بیٹھ کر کٹھرہ سرخ تک آیا۔اور کٹھرہ سرخ سے پیادہ کٹھرہ نقرہ تک پہنچ کر آرائش خاص و عام و تخت مرصع کے دیدار سے بہرہ مند ہوتا ہوا کٹھرہ طلاء کے پاس بیٹھ گیا، جہاں پناہ کی طرف سے جو نان و آب خاص مرحمت ہوا تھا، خان مذکور نے یہ عطیہ نوش جان کیا اور عصائے مرصع عطیہء حضرت قبلہء عالم کو بوسہ دے کر آغوش میں لیا، ایک ساعت چھ گھڑی گذرنے کے بعد عبداللہ خاں غسل خانہ میں آیا اوراس فردوس نشاں مکاں کے دیدار سے بہرہ اندوز ہو کر مشتاق دیدار بیٹھا تھا کہ ایک بجے دن کو حضرت قبلہء عالم دولت شاہی سے برآمد ہوئے، خان مذکور سامنے آیا اوراپنے طریقے کے مطابق آداب شاہی بجالایا، قبلہء عالم نے مصافحہ کی عزت سے سرفراز فرمایا۔اور خان مذکور شاہی عنایات ونوازش کو دیکھ کر کلفتِ سفر کو بالکل بھول گیا، اور بے حد شاد ومسرور ہوا۔قبلہء عالم نے خان مذکور کا ہاتھ پکڑا اوراسے اپنے ہمراہ لے کر مسجد میں تشریف لائے جہاں پناہ نے آدھ گھنٹہ کے بعد عبداللہ خاں کو رخصت کر دیا، یکہ تاز خاں اور خواجہ محمد صادق نے خان مذکور کو رستم خاں مرحوم کی حویلی میں جو عالی شان اور دل کش عمارت ہے اور خالصہ شریف کے عطا کردہ سامان و فرش وغیرہ سے پیشتر سے آراستہ و پیراستہ تھی پہنچایا، خان مذکور کو ایک لاکھ روپیہ نقد و بیس ہزار کا دیگر سامان واٹھارہ گھوڑے طلائی ونقرئی ساز مرصع سے مزین اور زربفت کی جھول جو بطور عطیہ شاہی دیوان خانہ میں پیشتر سے موجود تھی مرحمت فرمائی گئی۔

جمدۃ الملک کوحکم ہوا کہ ہاتھیوں کی جنگ شروع ہواور امیر عبداللہ خاں کو یہ عشرت انگیز تماشہ دکھائے اور خود بھی خان مذکور کے ہمراہ رہے بادشاہ جمدۃ الملک کو یہ حکم دے کر خود خواب گاہ میں تشریف لے گئے۔

ذی قعدہ کی تیس تاریخ جشن وزن قمری منعقد کیا گیا، اور بادشاہ کی عمر گرامی کا باون واں سال شروع ہوا، شاہزادگان والا قدر دامیرانِ دربار وصوبہ جات طرح طرح کی نوازشوں سے سرفراز کئے گئے، بہترین وبیش قیمت تحفے جناب قُدسی شمائل بیگم صاحبہ ودیگر خواتین محل داعیانِ ملک کی طرف سے قبلہء عالم کے حضور میں پیش کئے گئے۔

یکم ذی الحجہ کو رحمت بانو دختر والی آسام شاہزادہ محمد اعظم کے حبالہء عقد میں دی گئی اور ایک لاکھ اَسّی ہزار روپیہ دین مہر قرار پایا۔

صوبہ ٹھٹھہ کے واقعات سے معلوم ہوا کہ قصبہ سماوانی متعلقہ بندر لاہری زلزلہ کے شدید جھٹکوں کی وجہ سے تیس ہزار مکانات کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے زمین میں دھنس کر ناپید ہوگیا۔

دسویں ذی الحجہ کو قبلہء عالم نے نماز عید الضحیٰ ادا فرمائی۔

سترہ صفر کو بادشاہ زادہ محمد اعظم کا نکاح جہاں زیب بانو دختر شاہزادہ داراشکوہ کے ساتھ کیا گیا۔ اسی تاریخ نادرہ بیگم دختر جہاں بانو بیگم بنت سلطان مراد بھی شاہزادہ مذکور کے حبالہء عقد میں دی گئی، عروس دوئم کو نواب احتجاب جہاں آرا بانو بیگم المعروف بیگم صاحب نے جو قبلہ عالم کی ہمشیرۂ کلاں تھیں اپنی فرزندی میں لیا تھا اس لئے یہ جشن بیگم صاحبہ کے در دولت پر منعقد ہوا۔ جمدۃ الملک جعفر خاں ودیگر اعیان ملک نے ایک لاکھ ساٹھ ہزار کی ساچق در دولت پر روانہ کی۔

تیسری ربیع الاوّل کو طاہر خان بجائے لشکر خان کے ملتان کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔

صوبہء بنگال کے حالات

صوبہء بنگال کے واقعات سے معلوم ہوا کہ ملک میں پہلے ایک قسم کا غبار بلند ہوا اس کے بعد ایک خوفناک صورت بلند قامت نمودار ہوئی اور چند ساعت کے بعد نظروں سے غائب ہوگئی، لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ اس مقام سے آدھ کوس کے فاصلہ تک تمام جانور اور انسان زخمی یا مردہ پائے گئے۔

جون پور کے واقعات

سترہ ربیع الاوّل کو جونپور کے واقعات سے معلوم ہوا کہ نہم ماہ مذکور کو شدید بارش کا آغاز ہوا، اور دو روز متواتر موسلا دھار پانی برستا رہا، اکثر بلند عمارات گر گئیں اور قلعہ کی دیوار شرقی بائیس گز منہدم ہوگئی، چند مقامات پر بجلی بھی گری، چند اشخاص کی موت واقع ہوئی اور بعض بے ہوش ہو کر پھر ہوش میں آ گئے۔

عبدالنبی خاں فتح پور جھنجھورا کی خدمت سے علیحدہ کر کے متھرا کا فوج دار مقرر کیا گیا اور منصب دو ہزاری یک ہزار سوار کے عہدہ پر فائز کیا گیا۔

محمد علی خاں نواب روشن آرا بیگم کی سرکار کا دیوان مقرر ہوا۔

الٰہ آباد و اودھ کے صوبہ داروں کے نام فرمان شاہی صادر ہوا کہ بدکرداروں کا وہ گروہ جو مظلوم اطفال کو خواجہ سرا بنا کر ان کی زندگی کو تباہ کرتا ہے، تلاش و جستجو کر کے پابہ زنجیر حضور شاہی میں روانہ کیا جائے اور اس امر کی سخت تاکید کر دی جائے کہ آئندہ سے کوئی فرد بھی اس فعلِ شنیع کا مرتکب نہ ہو۔

جشن وزن شمسی کی رسم کا خاتمہ

جمادی الاوّل کی پچیس تاریخ کو وزن شمسی کا جشن منعقد ہوا اور بادشاہ نے انجمن خاص میں تخت سلطنت پر جلوس فرمایا۔ قبلہء عالم کی عمر گرامی کا 51 واں سال شروع ہوا۔ قبلہء عالم نے آئندہ سے انعقاد جشن کو برقرار لیکن وزن کی رسم کو قطعاً موقوف فرمایا۔ شاہزادے اور امرائے دربار آداب شاہی بجالائے اور ان پر شاہانہ نوازش کی گئی، بادشاہزادوں خواتین داعیان ملک کے پیش کش، شاہی لاحظہ میں پیش ہوئے، شاہزادہ محمد اعظم کو خلعت خاص بانیمہ آستیں و سرپیچ مرصع مرحمت ہوا۔

عبداللہ خاں کی رخصت

خان والا شان عبداللہ خاں نے آٹھ ماہ حضرت قبلہء عالم کے سایہء عاطفت میں بے حد مسرت و شادمانی کے ساتھ بسر کئے اور اس کے بعد حرمین شریفین کی زیارت کا ارادہ کیا جو عرصہ سے مرکوزِ خاطر تھا قبلہء عالم پر ظاہر کیا، بادشاہ دیں پناہ نے سامان سفر و تمام ضروریات زندگی کا

بخوبی انتظام فرمایا۔ اور شاہجہاں آباد سے بندر سورت تک تمام صوبہ داروں و حکام وفوج داران سلطنت کے نام فرامین جاری ہوئے کہ خان مذکور کو بے حد عزت و حرمت کے ساتھ اپنے حدود سلطنت سے رخصت کر دیں، اور خاطر مدارات میں کسی طرح کی کمی نہ واقع ہونے پائے، اور بدستور سابق جو سامان کہ خان مذکور کی آمد میں ہر جگہ کیا گیا تھا، وہی رخصت کے وقت بھی عمل مین آئے، غرض کہ اوّل سے آخر تک مبلغ دس لاکھ روپیہ خزانہ شاہی سے خان مذکور کے اخراجات و عطیات میں صرف ہوا۔

عنایت خاں دیوان خالصہ ء اصل و اضافہ ء منصب نو صد سوار پر فائز کیا گیا۔ میر حسینی کے بجائے شیخ سلیمان داروغہ ء عدالت مقرر کیا گیا، اور اصل و اضافہ ء منصب نہ صدی، ایک صد سوار کے شاہانہ مراحم سے بہرہ اندوز ہوا، عبدالعزیز خاں والیٔ بخارا کے میر آخور مسمی اسلام قلی خاں کو منصب یک ہزاری عطا فرمایا گیا، سید امیر خاں کابل کا معزول صوبہ دار شاہی خدمت میں حاضر ہوا، اور اس نے پانچ سو اشرفیاں دو ہزار روپیہ کی نذر پیش کی، خان مذکور قدم بوس ہوا، اور قبلہ ء عالم نے اس کی پیٹھ پر دست شفقت پھیر کر اس کی قدر و منزلت کو دہ چند بلند و بالا کیا، خوشحال خاں اور دیگر ارباب عشرت کو تین ہزار روپیہ اور چالیس خلعت مرحمت ہوئے۔

سید عثمان شریف مکہ کے قاصد کو واپسی کی اجازت مرحمت ہوئی، اور نو ہزار روپیہ اور ایک گھوڑا باساز نقرہ اسے عطا ہوا، ملتان کا معزول صوبہ دار طاہر خاں حضور شاہی میں حاضر ہوا، اور اس نے ایک سو اشرفیاں اور ایک ہزار روپیہ زر تصدق پیش کیا، مہابت خاں کے گھر میں فرزند پیدا ہوا اور نوید ولادت کے ساتھ پانچ سو اشرفیاں بطور نذر پیش کی گئیں، قبلہ ء عالم نے مولود کو زمانہ بیگ کے نام سے موسوم کیا۔ بخشیانِ ممالک کے نام فرمان صادر ہوا کہ سوا اہل خدمت و زمینداروں کے بقیہ تمام امراء سی صدی تک سواروں کو موقوف کریں، صف شکن خاں شاہزادہ محمد معظم کی خدمت سے اور مختار خاں حاکم قلعہ پرندہ شاہی آشانہ پر حاضر ہوئے، بادشاہ دین پناہ نے شریعت حقہ کا لحاظ فرما کر حکم دیا کہ سنگی ہاتھیوں کی دونوں مورتیں جو دروازۂ قلعہ کے ہر دو بازو پر نصب ہیں، اور جن کی وجہ سے اس دروازہ کو ہتیا پول کہتے ہیں اتار دی جائیں۔

شاہزادہ محمد اعظم کا جشن کدخدائی

رجب کی بیس تاریخ شاہزادہ محمد اعظم کا جشن کدخدائی کا آغاز ہوا دسویں شعبان کو قبلہ ء عالم

نے بعد نماز ظہر دیوان خاص میں اجلاس فرمایا، اور شاہزادۂ مذکور کو خلعت با چہار قب و دس عدد عربی و عراقی گھوڑے اور دو فیل مع ساز طلائی و شمشیر مرصع قیمتی بیس ہزار روپیہ و سرپیچ قیمتی ساٹھ ہزار و نقد بارہ لاکھ کی رقم عطا فرمائی، نواب قدسی خصال بیگم صاحبہ کو فیل سرور گنج قیمتی پندرہ ہزار اور نواب جہاں زیب بانو بیگم کو دو ہاتھی بطور انعام مرحمت فرمائے گئے، شاہزادہ محمد اعظم پانچ گھڑی رات گزرنے کے بعد بے حد شان و شوکت کے ساتھ اپنی حویلی سے قبلہء عالم کے حضور میں حاضر ہوئے، جہاں پناہ مسجد میں تشریف لائے اور قاضی عبدالوہاب نے میر سید محمد قنوجی کی وکالت وملّا عوض وجیہہ و شیخ سیف اللہ سرہندی کی شہادت میں خطبہء نکاح پڑھا، اور چھ لاکھ روپیہ دَین مہر قرار پایا، قبلہ عالم مع شاہزادہ کے گھوڑے پر سوار بیگم صاحبہ کی حویلی میں تشریف لائے، امرائے دربار ہزار سے پانصدی تک شاہزادہ کے جلو میں تھے، دو پہر اور ایک گھڑی شب گذرنے کے بعد جہاں پناہ واپس آئے، اور صبح کے وقت عروس کا ہودج شاہزادے کے محل سرا میں پہنچ گیا، جو زیب و زینت کہ اس جشن مسرت کی تھی اور جس قدر رقم اس میں خرچ کی گئی اور جو سامان داد و دہش کہ عمل میں آیا اس کا اندازہ و تفصیل حد بیان سے باہر ہیں۔

سترہ شعبان کو قبلہء عالم شاہزادہ کی حویلی میں تشریف لائے قلعہ سے لے کر شاہزادہ کے محل سرا تک سنہرے و روپہلے کپڑوں کا فرش بچھا تھا، جہاں پناہ نے تخت طلائی پر جلوس فرمایا، بادشاہ نے حکم دیا کہ ہزار و پانصدی تک کے امراء بخشیان ملک کے واسطہ سے خلعت حاصل کریں اور بقیہ امیروں کو داروغہء خلعت خانہء حضور میں لے آئے، شاہزادہ کے تحفے و نذرانے جہاں پناہ کے ملاحظہ میں پیش کئے گئے جواہرات و پارچہ تمام کی قیمت پانچ لاکھ اندازہ کی گئی، قبلہء عالم دولت سرا کو تشریف لے گئے، شاہزادہ سواری کے وقت بیرون دروازہ، نقار خانہ آداب و مجرا بجا لایا اور واپسی کے وقت اندرون غسل خانہ سے بے حد اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا گیا۔

تیرہ شعبان کو بولبارس خاں حاکم کاشغر کا سفیر مسمّی عبدالرشید خدمت شاہی میں حاضر ہوا اور حاکم کاشغر کا نیاز نامہ بادشاہ کے حضور میں پیش کیا، قبلہء عالم نے نامہء مذکور خدمت خاں داروغہء عرائض کے سپرد فرمایا۔

بیس شعبان کو حکم شاہی صادر ہوا کہ زربفت کی پوشش شرعاً منع ہے آئندہ سے یہ پارچہ استعمال میں نہ آئے۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا بارہواں سال

1079ھ/1669ء

اسی مبارک زمانہ میں رمضان کا مقدس مہینہ آیا اور خلعت خدا رحمتِ الٰہی سے بہرہ یاب ہوئی، بادشاہ جہاں پناہ کے عہد حکومت کا بارہواں سال شروع ہوا۔ دین دار فرماں روا نے تمام ماہ صوم وصلوٰۃ میں بسر کیا، کارکنان سلطنت شاہی حکم کے مطابق ترتیب جشن میں مشغول ہوئے عیدالفطر کا مسرت خیز دن جمعہ کو ہوا اور دو عیدوں کے جمع ہونے سے عیش مسرت بھی دو چند ہوگئی، جہاں پناہ نے نماز عیدالفطر عیدگاہ میں اور نماز جمعہ جامع مسجد میں ادا فرمائی عید کے دوسرے روز بادشاہ نے تخت مرصع پر جلوس فرمایا اور شاہانہ داد و دہش کا بازار گرم رہا، شاہزادگان عالی قدر و امیران دربار نے نذریں پیش کیں اور اہل دربار و دیگر صوبوں کے حکام کے تحائف شاہی ملاحظہ میں پیش کئے گئے۔

شاہزادہ محمد اعظم کو خلعت و منصب پانژدہ ہزاری و ہزار سوار مرحمت ہوا، شاہزادہ محمد اکبر کو خلعت فاخرہ عطا ہوا، جمدۃ الملک جعفر خان، اسد خان، عبدالرحمٰن، سلطان ولد نذر محمد خان و نامدار خان دانشمند خاں و سید منور خاں و دیگر خدام بارگاہ خلعت و عطیہء اسپ و فیل و نیز اضافہء منصب سے سرفراز کئے گئے، بدیع سلطان ولد خسرو سلطان دو ہزاری دو صد سوار کے منصب پر فائز ہوا، حسن علی خاں کے بجائے امیر خاں ولد خلیل اللہ خاں منصب داران جلو کا داروغہ مقرر فرمایا، معتقد خاں ولد نجابت خاں جو کسی قصور کی وجہ سے معزول کر دیا گیا تھا اپنے عہدہ و منصب دو ہزاری دو ہزار سوار پر بحال فرمایا گیا، ابو محمد نبیرۂ بہلو خاں میانہ آستانہ شاہی پر حاضر ہو کر پنج ہزاری چہار ہزار سوار کے منصب و اخلاص خان کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔ بیدر کے قلعہ دار مختار خاں کو واپسی

راہ بتائی، بادشاہ غرباء پرور نے اپنی شرفانوازی سے ارتق بیگ گرز بردار کو حکم دیا کہ خلعت و پالکی و فیل لے کر سرہند جائے اور حاکم بصرہ کو یہ اشیاء پہنچا کر اسے آئندہ مراحم خسروانہ کا ایسا امیدوار بنائے کہ حسین پاشا اطمینان کے ساتھ ہندوستان روانہ ہو۔

اسی دوران میں گیارہ صفر کو معلوم ہوا، کہ پاشا مذکور اعز آباد پہنچ گیا ہے، بادشاہی حکم کے مطابق فولاد خاں کوتوال مندوی تک اور بخشی الملک اشد خاں وصدالصدور عابد خاں و یکہ تاز خاں میر تزوک لاہوری دروازہ تک پیشوائی کے لئے گئے، اور حسین پاشا کو بارگاہ شاہی میں لے آئے حسین پاشا حسب دستور آداب بجالایا اور تخت مبارک کو حسب اجازت بوسہ دیا، قبلہء عالم نے اس کی پشت پر دست شفقت رکھ کر غم گین مسافر کو شاد فرمایا۔

حسین پاشا کے فرزندوں یعنی افراسیاب بیگ و علی بیگ نے پانچ ہزار روپیہ بطور تصدق پیش کیے اور خود حسین پاشا نے ایک قطعہء لعل قیمتی بیس ہزار روپیہ اور دس عربی گھوڑے نذر گزرانے، قبلہء عالم نے حسین پاشا کو اسلام خان کے خطاب سے سرفراز فرمایا اور منصب پنج ہزاری و پنج ہزار سوار اور خلعت خاص و شمشیر مرصع قیمتی چھ ہزار و خنجر مرصع و فیل با ساز نقرہ اور ایک لاکھ روپیہ نقد حسین پاشا کو مرحمت فرمائے گئے افراسیاب بیگ خطاب و منصب دو ہزاری و یک ہزار سوار و علی بیگ خطاب خانی اور منصب ہزار و پانصدی و پانصد سوار کے عطیات سے سرفراز فرمائے گئے۔

رستم خاں کی حویلی جو عالی شان و دل کشا منزل ہے مع فرش و دیگر لوازم کے ان کے قیام کے لئے عطا ہوئی، جس کشتی پر سوار ہو کر یہ مسافر در دولت پر حاضر ہوئے تھے وہ مع فرش کے ان کو عطا ہوئی، حسین پاشا صاحب فہم و فراست امیر ہے، اور شجاعت و بہادری کی شان اس کے بشرہ سے نمایاں ہے یہ امیر اور اس کے دونوں فرزند موزوں طبع اور سخن سنج بھی ہیں۔

اٹک بنارس کے حالات سے معلوم ہوا کہ چوتھی صفر کو زمین میں زلزلہ کی وجہ سے پچاس گز دور کا ایک غار ہو گیا، ہر چند اس غار کی گہرائی معلوم کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

واقعات کشمیر سے معلوم ہوا کہ تیسری صفر کو شام سے زلزلہ کا آغاز ہوا اور صبح تک تمام عمارات گہوارہ کی طرح ہلتی رہیں، لیکن کسی قسم کا نقصان نہیں ہوا۔

سید منور خان پسر سید خان جہان بارہہ گوالیار کا فوجدار مقرر کیا گیا، رائے مکرند بریلی کی

ہمراہ روانہ کیا گیا۔

حاکم چین کے قاصد سید عبدالوہاب نے شرف قدم بوسی حاصل کیا، اور عطائے خلعت سے سرفراز فرمایا گیا۔

صالح بہادر گرز بردار ملارنہ کا بُت خانہ ڈھانے پر مامور کیا گیا۔

قبلہء عالم تیرہ محرم کو ایک گھڑی رات گزرنے کے بعد باغ حیات بخش کے راستہ سے شیخ سیف اللہ سرہندی رحمتہ اللہ علیہ کے مکان پر تشریف لے گئے اور دیر تک حقائق و معارف کی گفتگو فرما کر دولت خانہ واپس آ گئے۔

بادشاہ کو معلوم ہوا کہ فرقہ ہنود کا مشہور گرو ادھو بیراگی اغوا کے جرم میں چبوترہ کوتوالی میں مقید تھا، دو راجپوت جوگی کے ہم قوم قاضی ابوالمکارم پسر قاضی عبدالوہاب کے پچاس جوگی کی رہائی کی کوشش میں آتے جاتے تھے، اثنائے راہ میں ہندوؤں نے قاضی صاحب کو شہید کر دیا، بادشاہ دیں پناہ نے گرو اور اس کے ہر دو چیلوں کو قتل کرایا، رگھناتھ سنگھ سیسودیہ رانا سے جدا ہو کر شاہی آستانہ پر حاضر ہوا، قبلہء عالم نے رگھناتھ سنگھ کو جمدھر قیمتی ایک ہزار عنایت فرما کر منصب ہزاری صد سوار کے مرتبہ پر فائز کیا۔

حسین پاشا حاکم بصرہ کا آستانہء شاہی پر حاضر ہونا

اس سے پیشتر قبلہء عالم کو ملتان کے اخبار نویسوں کے ذریعے سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حسین پاشا حاکم بصرہ اور فرماں روائے ملک روم میں کچھ ایسی نزاع واقع ہوئی کہ پاشا مذکور اپنی خدمت سے علیحدہ کیا گیا اور اس کی جگہ یحیٰی پاشا کا تقرر عمل میں آیا، حسین پاشا بصرہ میں اپنا قیام خلاف مصلحت سمجھا اور نیز یہ کہ بادشاہ روم کی بارگاہ میں بھی اسے پناہ لینے کا موقع نہ ملا، یہ معزول امیر بہ حالت مجبوری ترک وطن کر کے ایران وارد ہوا، لیکن ایران پہنچ کر اس کی قدر و توقیر نہ ہوئی اور مایوسی کے عالم میں آستاں بوسی کے لئے ہندوستان آ رہا ہے، چونکہ دور و نزدیک ہر گوشہء دنیا کے حاجت مند بارگاہ عالی پر جبہ فرمائی کر کے اپنی مرادیں حاصل کرتے اور غم واندوہ سے نجات پا کر شاد و آباد ہوتے ہیں اور نیز یہ کہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ قبلہء عالم کا در دولت ہر مصیبت زدہ کا ملجا و ماوا ہے، حسین پاشا کا خوابیدہ نصیب بھی جاگا، اور تقدیر کی یاوری نے اس برگشتہ بخت کو درِ دولت کی

کی اجازت مرحمت ہوئی۔ ستره ذی قعدہ کو سورج گرہن ہوا اور قدیم دستور کے مطابق نماز پڑھی و خیرات تقسیم کی گئی۔

کتب باطلہ کے درس و تدریس کی ممانعت

بادشاہ دیں پناہ کو معلوم ہوا کہ صوبہ ٹھٹھہ و ملتان میں بالعموم اور خاص کر بنارس میں برہمنوں نے مدارس قائم کیے ہیں اور کتب باطلہ کے درس و تدریس میں مشغول ہیں، ہندو و مسلم طلبا دور دراز مقامات سے سفر کر کے ان علوم کی تحصیل کے لئے آتے ہیں، قبلہء عالم نے عام صوبجات کے نظماء کے نام فرامین روانہ کیے کہ یہ مدارس مسمار کر دیئے جائیں اور ان علوم کے درس و تدریس کی ممانعت کی جائے۔

اٹھارہ ذی قعدہ کو جشن وزن قمری کا انعقاد ہوا اور قبلہء عالم نے تخت فرماں روائی پر جلوس فرمایا، رسم وزن جو سال گذشتہ سے موقوف کر دی گئی تھی امسال بھی عمل میں نہیں آئی، ارباب نشاط ونغمہ پردازوں کو باریابی کی اجازت مرحمت نہ ہوئی، نوبت نوازوں نے کوس شادمانی بلند کیا۔ اور جہاں پناہ کی عمر گرامی کا ترپنواں سال شروع ہوا، شاہزادہ محمد اعظم کو خلعت اور ایک سپر گل ہائے مرصع کا مرحمت ہوا، شاہزادہ محمد اکبر بھی عطائے خلعت سے سرفراز کیا گیا، جمدۃ الملک جعفر خان و دیگر خدام بارگاہ بھی عطیہء خلعت سے سرفراز کیے گئے، شاہزادہ محمد معظم نے ایک قطعہء لعل مرسلہ عادل خاں دنیادار بیجاپور شاہی حضور میں روانہ کیا، یہ لعل وزن میں پانچ ٹانک و پانچ سرخ تھا، جس کی قیمت بیس ہزار روپیہ اندازہ کی گئی، بادشاہ نے شاہزادہ محمد معظم کو خلعت فاخرہ روانہ فرمایا۔

دلیر خاں دیوگڑھ کی فتح کے صلہ میں پنج ہزاری و پنج ہزار سوار کے منصب پر فائز ہوا۔

صوبہ الہ آباد کے واقعہ نویس نے اطلاع دی کہ شمشیر خاں عالم گیر شاہی نے وفات پائی، حسن علی خان وارسلان خان و محمد شاہ و امان اللہ خان و شریر خان و حسین علی خان و سنجر خاں مرحوم کے بھائیوں کو خلعت تعزیت مرحمت ہوئے، اور بادشاہ رعایا پرور کی شفقت و عنایت سے ماتم سے آزاد ہوئے۔

اللہ وردی خان کے بجائے میر خان صوبہ دار الہ آباد مقرر ہوا، اور منصب چار ہزاری و سہ ہزار سوار دو اسپہ و عطائے خلعت سے سرفراز فرمایا گیا میر خاں کے تغیر سے معتقد خاں اور معتقد خاں

کے عہدہ پر ہمت خاں کے تقررات عمل میں آئے، کامگار خاں ولد جمدۃ الملک جعفر خاں داروغہ جو ماہر بازار و لطف اللہ خان پسر سعد اللہ خاں، عاقل خاں کے بجائے داروغہ ڈاک چوکی مقرر کئے گئے، میر شہاب الدین والی بخارا کے قاصد کو دو گھوڑے مرحمت ہوئے، دسویں ذی الحجہ کو بادشاہ نے نماز عید الضحیٰ ادا فرمائی اور قربانی کے بعد دولت سرا میں تشریف لائے، سر بلند خاں دکن سے آستانہ شاہی پر حاضر ہوا، حکیم ابراہیم جو شاہی حکم کے موافق عبداللہ خاں کاشغری کے ہمراہ بندر سورت تک گیا تھا خدمت والا میں واپس آیا میرزا اکرم خاں خلوت گزینی سے باہر آیا اور بے براق شاہی ملاحظہ میں حاضر ہوا، قبلہء عالم نے میرزا اندکور کو شمشیر مرصع عطا فرمائی۔

مبارز خاں کے بجائے سیف خاں صوبہ دار کشمیر مقرر رہوا۔

عبدالنبی خاں فوجدار کا قتل

اکیس ذی الحجہ کو معلوم ہوا کہ عبدالنبی خاں فوج دار متھرا نے موضع بسہرا کے مفسدوں پر حملہ کیا، پہلے تو اسے سرکشوں پر فتح ہوئی، اور فتنہ پردازوں کو تباہ کرتا رہا، لیکن انتہائے جنگ میں ایک گولی کی ضرب سے قتل ہوا یہ امیر بے حد فیاض و شجاع تھا، متھرا میں ایک مسجد اس کی یادگار موجود ہے، محمد انور جو اس کا برادر زادہ و داماد تھا خلعت تعزیت کے عطیہ سے سرفراز فرمایا گیا، اور اس کے مال و متاع پر شاہی عمال نے قبضہ کر لیا اس کے خزانہ میں ترانوے ہزار اشرفیاں، تیرہ لاکھ روپیہ اور چار لاکھ پچاس ہزار کا سامان برآمد ہوا۔

تئیس تاریخ کو رعد انداز خاں تخت گاہ کے نواح کے مفسدوں کی سرکوبی پر مامور ہوا اور اسے ایک گھوڑا مع ساز طلائی مرحمت ہوا، ہمت خاں کے بجائے سر بلند خاں قور بیگی کی خدمت پر مقرر کیا گیا۔

محمد امین خاں ناظم لاہور کو واپسی کی اجازت عطا ہوئی، معصوم خاں نے عرض کیا مورنگ کے نواح میں ایک جعلی شجاع پیدا ہوا ہے جس نے اطراف میں ہنگامہ برپا کر رکھا ہے، قبلہء عالم نے ابراہیم خاں و فدائی خاں کے نام تاکیدی فرامین اسی مضمون کے جاری فرمائے کہ اگر یہ شخص ذرا بھی سر اٹھائے تو فوراً تہ تیغ کیا جائے، صف شکن خاں متھرا و دلیر خاں ولد بہادر خاں رہیلہ عبدالنبی خان کی وفات کی وجہ سے ندرآباد کے فوج دار مقرر کئے گئے، بیرم ویوسیودیہ، صف شکن خاں کے

خدمت سے علیحدہ کر کے بنگالہ میں متعین کیا گیا شاہزادہ محمد کام بخش کو ایک بچہء فیل مرحمت ہوا۔

راجہ رام سنگھ پسر راجہ جے سنگھ کو ایک ہزار سوار عنایت ہوئے، اسلام خان کے منصب میں ہزار سواروں کا اضافہ فرمایا گیا اور دس ماہ کی تنخواہ اسلام خان کو اور آٹھ ماہ کی تنخواہ اس کے فرزند کو مرحمت ہوئی اور اس کے علاوہ اسلام خان کو ہمیشہ کے لئے جانوروں کی خوراک کی معافی عطا ہوئی، اور اس کے بیٹوں کے ساتھ صرف دو سال کے لئے یہ رعایت منظور فرمائی گئی۔

عبداللہ خاں منصب دو ہزاری و ہزار سوار پر بحال فرمایا گیا، اور اس کو خلعت و جمدھر مینا کار عطا فرما کر غسل خانہ کا داروغہ مقرر فرمایا۔

پندرہ ربیع الآخر کو مکرم خان صفوی نے تپ محرقہ کے عارضہ میں وفات پائی۔

بادشاہ دیں پناہ کو معلوم ہوا کہ کارکنان سلطنت نے فرمان مبارک کے مطابق بنارس کے بُت خانہ کو بالکل منہدم کر دیا، دوسری جمادی الاوّل کو یکہ تاز خاں اور گرو ہرداس سیسودیہ میں انتظامی معاملہ میں لاہوری دروازہ کے سامنے جنگ ہوئی ہندو امیر قتل ہوا اور یکہ تاز خاں کے جسم میں پانچ زخم کاری لگے اور پانچ اشخاص اس کے ہم قوم قتل کئے گئے۔

افتخار خاں خانساماں کو حکم ہوا کہ اونٹوں، گائے اور خچر کا سال میں دو بار معائنہ کرایا کرے۔

پندرہویں تاریخ معتقد خاں، ہمت خاں اور روح اللہ خاں باہم گفتگو کر رہے تھے، دلدار ولد الفت خاں محمد طاہر نبیرۂ دولت خان جو ملتفت خان کی طرف سے آزردہ خاطر تھا، دونوں ہاتھوں میں تلوار پکڑ کر ملتفت خان کی پشت پر تلوار کا وار کیا، ملتفت خاں نے وار سپر پر روکا، اور ایک زخم شمشیر کا لگایا، اسی دوران میں ہمت خاں نے ایک ہاتھ تلوار کا مارا اور فضل اللہ خاں میر توزک نے یک لکڑی اس کے سر پر ماری جس کی وجہ سے وہ پریشان ہو کر بھاگا، بہرہ مند خاں وغیرہ نے بھی چند لکڑیاں رسید کیں اور مجرم چوکی سنگ مرمر تک پہنچا تھا کہ اس درمیان میں جمیل بیگ، خواص بونر دھال نے جمدھر کی ایک کاری ضرب لگائی اور اس کا کام تمام ہو گیا، مقتول کی لاش دیوان خانہ کے باہر پھینک دی گئی۔

اس واقعہ سے دنگل چپ کے سواروں و نیز اسی سمت کے چھل ہائے چوکی کے منصب میں کمی کی گئی۔

شاہزادہ محمد معظم کی جاگیر چکلہ حصار میں سے دو کوور دام بطور جاگیر مرحمت ہوئے اور اس

کے عوض میں شاہزادہ مذکور کو دکن کے خزانہ سے تنخواہ مرحمت ہوئی، پچیس تاریخ کو معلوم ہوا کہ شب کو چار گھڑی گذرنے کے بعد ایک ستارہ مشرق کی جانب آسمان سے جدا ہو کر مغرب کے سمت گرا، اسی کی روشنی چاندنی کی طرح پھیل گئی اوراس کے بعد گرج کی آواز سنائی دی۔

دسویں جمادی الآخر مطابق چودہ آبان کو جشن وزن شمسی منعقد ہوا، اور بادشاہ کی عمر گرامی کا ترپن واں سال شروع ہوا، اہل دربار نے نذریں وتحائف پیش کئے شاہزادہ محمد اعظم ومحمد اکبر ونیز اعیان دولت طرح طرح کی نوازشوں سے سرفراز فرمائے گئے۔ اسلام خاں کو ایک سو تھان زربفت کے مرحمت ہوئے۔

سفیر بخارا مسمی شادمان خواجہ کو فضل اللہ خان وہنر برخان دروازہ غسل خانہ سے بارگاہ کے اندر لائے شادمان نے خان والاشان حاکم بخارا کا سلام نیاز عرض کیا اور جہاں پناہ نے سفیر کو دس ہزار روپے مرحمت فرمائے۔

تربیت خاں کے بجائے صفی خاں اڑیسہ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔

پندرہ وسولہ تاریخ جہاں پناہ نے مقامات متبرکہ کی زیارت کی جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد قبلہ عالم حضرت شیخ نظام الدین محبوب الٰہی وحضرت خواجہء خواجگان قطب الدین بختیار چشتی رحمتہ اللہ علیہما کے مزارات پُر انوار پر حاضر ہوئے، ہرسہ مقامات کے خدام کو انعام واکرام سے شادو مالا مال فرمایا۔

محمد یار خاں ولد اعتقاد خاں جدید چہار صدی منصب دار مقرر فرمایا گیا، علی اکبر حاجب دنیادار گولکنڈہ ملازمت شاہی میں حاضر ہوا اور ایک ہزار اشرفیاں و پندرہ ہاتھی پیش کش اپنے ہمراہ لایا۔

میر شہاب الدین ولد عابد خاں کے طالع بیدار نے یاوری کی اور ولایت سے جہاں پناہ کی درگاہ میں حاضر ہوا، خان مذکور نے وقت قدم بوسی ایک سپر میناکار ملاحظہء والا میں پیش کیا اور منصب سی صدی وہفتاد سوار کے عطیہ سے سرفراز کیا گیا۔

خواجہ محمد یعقوب نے جن کا مجمل حال آئندہ اوراق میں پیش کیا جائے گا خاکسار مؤلف نے یہ نقل بیان کی کہ خان والاشان سلیمان قلی خان ہم کو بھی اپنے ہمراہ سیر باغ کے لئے لے گئے، میں اور رستم بے اتالیق ایک طرف گوشہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتہً میر شہاب الدین ہمارے پاس آئے اور کہا کہ میرے والد مجھے طلب کررہے ہیں اور جناب عالی کی طرف سے اجازت نہیں

ہوئی، چونکہ وقت آ چکا تھا میں اور اتالیق دونوں نے طے کرلیا کہ خان مذکور سے اس بارے میں عرض کریں اور منشور بھی لکھ کر تیار کرلیا، تاکہ اجازت کے بعد روانگی میں تاخیر نہ ہو، حضر مے وقت ہم نے گزارش پیش کی اور اجازت حاصل ہوگئی، میر شہاب الدین نے اس وقت گٹھریاں شال کی پنے باپ کے فرستادہ خان مذکور کی خدمت میں پیش کیں اور سلیمان قلی خان نے منشور پر دستخط فرما دیئے خان نے فاتحہء رخصت پڑھا، میر شہاب الدین چند قدم چلا ہوگا کہ خان نے اس کو دوبارہ طلب کیا، اور کہا کہ تم ہندوستان جاؤ گے اور وہاں جا کر نام ونمود حاصل کرو گے، بڑے آدمی ہو کر ہم کو فراموش نہ کرنا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ میر شہاب الدین کا نصیب جاگا، اور یاوری تقدیر اس کو ہندوستان جنت آشیان میں لے آئی جس کا ثمرہ یہ ملا کہ میر مذکور اپنی بلندی طالع وحضرت ظل سبحانی کی توجہ وعنایت سے ایسا عالی مرتبہ ہوا کہ حد بیان سے باہر ہے ظاہر ہے بلخ و بخارا کے سلاطین کی دولت وثروت کو سوا نام شاہی کے بارگاہ والا سے کیا مناسبت ہے۔

جہاں پناہ کا مفسدوں کی تنبیہ کے لئے اکبر آباد تشریف لانا

چودہ رجب کو حسب الحکم سراپردۂ شاہی، دریائے جمنا کے کنارے لایا گیا اور جہاں پناہ نے نیک ساعت میں اکبر آباد کا رُخ کیا، راہ میں کوئی روز ایسا کم گذرا ہوگا جس میں بادشاہ نے شکار نہ کھیلا ہو۔

بیس رجب کو ریوارہ چندر کھ اور سرخرو کے مفسدوں کی فتنہ انگیزی کا حال بادشاہ کو معلوم ہوا اور قبلہء عالم نے حسن علی خاں کو اس گروہ کی تنبیہ کے لئے مقرر فرمایا۔

دو پہر تک ہنگامہء کارزار گرم رہا، لیکن آخر میں اقبال شاہی نے فتنہ انگیزوں کو پسپا کیا، حسن علی خاں کے اکثر رفیق اس معرکہ میں کام آئے، اور تین سو مفسد تہ تیغ کئے گئے اور اڑھائی سو زن و مرد اسیر ہوئے، حسن علی خاں نے شاہی حضور میں حاضر ہو کر صورت واقعہ بیان کی اور جہاں پناہ نے حکم دیا کہ قیدی اور مویشی اس موضع کے جاگیردار سید زین العابدین کے سپرد کر دیئے جائیں، صف شکن خاں متھرا کا جاگیردار حاضر ہوا اور بادشاہ نے حکم دیا کہ دو سو سوار مقرر کرے جو زراعت کی حفاظت کریں، اہل لشکر پر کسی طرح کا ظلم نہ ہونے پائے اور کسی قوم کے لڑکے گرفتار نہ کئے جائیں، فوج دار مراد آباد نامدار خاں شاہی ملازمت میں حاضر ہوا اور اس نے ایک سو اشرفیاں اور

ایک ہزار روپیہ رقم تصدق کی اور دو سیاہ شاہین ملاحظہ عالی میں گزرانے۔

صف شکن خاں کے بجائے حسن علی خاں متھرا کا فوجدار مقرر ہوا، اور سہ ہزار پانصدی و دو ہزار سوار کا اس کے منصب میں اضافہ کیا گیا، اور شمشیر و اسپ کے عطیہ سے سرفراز ہوا۔

امان اللہ خاں پسر اللہ وردی خاں فوجدار نواح اکبر آباد کے منصب میں تین سو سواروں کا اضافہ منظور ہوا، اور خان مذکور کے ساتھ روانہ کیا گیا، ہوش دار خاں ناظم اکبر آباد نے حاضر ہو کر شاہی ملازمت حاصل کی۔

دولت افزا فرزند شاہزادہ محمد معظم کی پیدائش

غرۂ شعبان کو شاہزادہ محمد معظم کی عرض داشت سے معلوم ہوا، کہ شاہزادہ کے محل میں راجہ روپ سنگھ کی دختر کے بطن سے فرزند پیدا ہوا ہے، مولود، دولت افزا کے نام سے موسوم کیا گیا، اور جواہرات، قیمتی ایک لاکھ روپیہ شاہزادہ اور اس کی والدہ کے لئے روانہ فرمائے گئے۔

مزار شاہجہاں پر حاضری

سترہ شعبان کو قبلہء عالم نے حضرت فردوس آشیانی و ممتاز الزمانیؒ کے مزارات پر حاضر ہو کر سعادت دارین حاصل کی، اور روضہ کے مجاوروں کے لئے اپنے اور دونوں شاہزادوں کی طرف سے چوالیس ہزار روپیہ بطور نذر پیش کئے، اٹھارہ شعبان کو قبلہء عالم نے قلعہ اکبر آباد کی سیر فرمائی۔

کوکلا جاٹ جو پٹنہ کے مفسدوں کا سرگروہ اور بیحد سنگ دل قزاق تھا اور جس کے ناپاک وجود کی وجہ سے عبدالنبی نے شہادت پائی تھی اور نیز جس کافر نے پرگنہء سعد آباد کو تباہ و برباد کر دیا تھا، حسن علی کاں کی سعی و کوشش سے گرفتار ہوا، اس بد بخت کے گرفتار کرنے میں رضی الدین نے بھی بے انتہا کوشش کی، حسن علی خاں نے اس مفسد کو مع اس کے رفیق طریق مسمی سنگی کے شیخ میر کے ہمراہ بارگاہ عالی میں روانہ کر دیا شاہی حکم کے موافق چبوترہ کوتوالی پر ان دونوں مفسدوں کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔

کوکلا کا فرزند اور اس کی دختر دونوں تربیت کے لئے جواہر خاں کے سپرد فرمائے گئے، دختر تو بعد اس کے شاہ قلی چیلہ کے حبالہء عقد میں آئی اور کوکلا جیسے شقی کا فرزند شاہی توجہ سے ایسا جید حافظ

کلام اللہ ہوا کہ بادشاہ دیں پناہ کو اس سے زیادہ کسی کے حفظ پر اعتماد نہ تھا، اور یہی شخص برابر شاہی قرأت کی سماعت کی عزت حاصل کیا کرتا تھا۔

شیخ رضی الدین بھاگلپور بہار کے شرفا میں سے تھے، یہ فاضل مؤلفین فتاویٰ عالم گیری میں شامل تھے، اور تین روپیہ یومیہ ان کی تنخواہ مقرر تھی، شیخ رضی الدین علاوہ ایک فاضل تبحر ہونے کے فن سپاہ گری میں کامل تھے، اور عملداری وندیمی وغیرہ کمالات میں بھی ان کو کافی دستگاہ حاصل تھی۔

حضور پُر نور کے محتسب قاضی محمد حسین ومقرب درگاہ مسمی بختاور خاں نے ان کے کمالات و ہمہ گیر قابلیت سے قبلۂ عالم کو آگاہ کیا بادشاہ ہنر پرور نے ایک صدی منصب دار مقرر فرمایا، رفتہ رفتہ حسین علی خاں اعانت وامداد اور اپنی سلیقہ شعاری سے مرتبہ امارت وخانی پر فائز ہو کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا تیرہواں سال

1080ھ/1670ء

اسی مسرت انگیز زمانے میں ماہ رمضان کا مقدس مہینہ آ گیا اور جہاں پناہ کے عہد معدلت کا تیرہواں سال شروع ہوا، بادشاہ دیں پناہ نے تمام ماہ رمضان عبادت و اطاعت الٰہی میں بسر کیا، پندرہ رمضان کو بادشاہ انصاف پرور نے یہ حکم نافذ فرمایا کہ دادخواہوں کو درشن کی طرف سے درخواست دینے کی ممانعت نہ کی جائے اور محلیان ان کے عرائض رسی میں باندھ دیا کریں اور پھر اوپر کھینچ کر شاہی ملاحظے میں پیش کیا کریں۔

متھرا کے بُت خانہ کا انہدام

اس مقدس مہینے میں بادشاہ دین پناہ نے حفظ شریعت و پابندی احکام الٰہی کا لحاظ فرما کر متھرا کے بُت خانے کے انہدام کا حکم صادر فرمایا۔ یہ بُت خانہ جو ایک عالی شان و مضبوط عمارت تھا، کارپردازان سلطنت کی کوشش سے قلیل زمانے میں زمین کے برابر کر دیا گیا اور اس کی جگہ رقمِ کثیر صرف کر کے ایک مستحکم مسجد کی بنیاد ڈالی گئی، بُت خانہ مذکور نرسنگھ دیو بندیلہ کا تعمیر کیا ہوا تھا۔

جنت مکانی حضرت جہانگیر بادشاہ کے عہد سے پیشتر اس شخص نے شیخ ابوالفضل کے قتل کرنے میں بے حد سعی و کوشش کر کے جنت مکانی کے دل میں اپنی جگہ کر لی تھی، جہانگیری جلوس کے بعد اس نے بادشاہ مرحوم سے اجازت حاصل کر کے اس عمارت کی تعمیر میں تینتیس لاکھ روپیہ صرف کیا، خدا کا شکر ہے کہ اس عہد مبارک میں ایسا اہم کام اس قدر خوبی و عجلت کے ساتھ عمل میں آیا کہ اس کو دیکھ کر تمام ہندو راجہ انگشت بدنداں رہ گئے۔

متھرا کے نام کی تبدیلی

اس بُت خانے کے تمام خرد و بزرگ اصنام، اکبر آباد میں لائے گئے اور نواب قدسیہ بیگم کی تعمیر کردہ مسجد کے زینوں کے نیچے دفن کر دیئے گئے شہر متھرا، اسلام آباد کے نام سے پکارا اور لکھا جانے لگا۔

اسی دوران میں شوال کا مسرت انگیز مہینہ آیا اور اس کار پردازِ سلطنت نے جشن جلوس کی ترتیب و انعقاد کی تیاریاں شروع کیں، نغمہء شادی کی پُر جوش آواز سے زمین و آسمان گونج اُٹھے، بادشاہ دریا نوال نے اپنے ابر کرم سے ہر گوشے کو سیراب فرمایا، قبلہء عالم ہاتھی پر سوار ہو کر عید گاہ تشریف لے گئے، شہزادہ محمد اعظم بادشاہ کے ہمراہ تھے۔

عید کے دوسرے روز جہاں پناہ نے دیوان خاص و عام میں تخت طلائی پر جو امیر الامراء علی مردان خان نے نذر دیا تھا اور جو وسط صحن میں رکھا گیا تھا، جلوس فرمایا، شہزادہ محمد اعظم و شہزادہ محمد اکبر کو خلعت عنایت ہوئے جمدۃ الملک جعفر خاں کو عطیہء خلعت کے علاوہ ایک کروڑ دام، مرحمت ہوئے اور منصب میں ایک ہزار سواروں کا اضافہ فرمایا گیا، راجہ رام سنگھ دراصل چار ہزاری و چار ہزار سوار دو اسپہ کا منصب دار تھا، اس شرط پر کہ راجہ آسام کی مہم پر تعینات کیا جائے اس کے منصب میں مزید ہزار سواروں کا اضافہ منظور ہوا، کنور کشن سنگھ ولد راجہ رام سنگھ کو مرصع سر پیچ عنایت فرمایا گیا، حسن علی خان کو بلا کسی شرط کے پانچ سو سواروں کا منصب مرحمت ہوا، اشرف خان و نجف خاں کو اضافہء پانصدی، میر تقی کو مرتبہء سہ ہزاری اور ملتفت خاں و مغل خاں کو پانصدی کا اضافہ عطا ہوا، سردار خاں و فضل اللہ خاں ہر ایک کو سو سوار مرحمت ہوئے، بخشی الملک اسد خاں و فیض اللہ خاں کو دو بہترین گھوڑے مرحمت ہوئے، عبدالرحمٰن سلطان و بہرام ہر ایک کو ایک ایک ہزار روپیہ کا انعام دیا گیا، شادماں خواجہ قاصد بلخ کو واپسی کی اجازت مرحمت ہوئی اور پچیس ہزار روپیہ نقد اور خلعت و شمشیر مرصع قیمتی پانچ ہزار و فیل با زین نقرہ اور ایک سو پانچ جامہ وار اور اسی قدر چیرہ آغابانی و گجراتی مرحمت ہوئے، اور اس کے ہمراہیوں کو دس ہزار روپیہ انعام عطا ہوئے، محمد عابد ولد زاہد خاں پنجابی یک ہزار و پانصدی و سی صد سوار کے منصب و نوازش خاں کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا، عبداللہ خاں کے بجائے داراب خاں داروغہ بندوق خانہ، غسل خانہ کا داروغہ مقرر ہوا۔

تخت گاہ ملک یعنی اکبر آباد کے اعمال نے غلّے کا نرخ نامہ بادشاہ دین دار کے حضور میں پیش کیا اور خلقت خدا فرمانروائے رعیت نواز کے ازدیاد عمر و دولت میں زمزمہ پرداز ہوئی۔

پندرہ ذی قعدہ (مطابق سترہ فروری 1676ء) کو قمری حساب سے بادشاہ کی عمر گرامی کا چونواں سال شروع ہوا، جہاں پناہ نے اس جشن کی رسم موقوف فرما دی، نقار خانہ کے عملے کو حکم ہوا کہ بدستور سابق نوبت بجائیں۔

داروغہ خواصان مسمی بختیاور خاں کو خنجر دستہ بلورین و ساز مینا کار طلائی مرحمت ہوا۔

آدابِ سلام میں تبدیلی

قاضی محمد حسین کے انتقال کی وجہ سے سید احمد خان پسر سید محمد قنوجی کو خدمت احتساب عنایت ہوئی، اہل دربار جو حضور شاہی میں ہاتھ سر پر رکھ کر آداب کے لئے جھکتے تھے ان کو حکم ہوا کہ مسنون طریقہ پر سلام کیا کریں۔

ملّا عبدالعزیز عزّت

نویں ذی الحجہ کو ملّا عبدالعزیز عزت پسر ملا رشید اکبر آبادی ہمت خاں و بختیاور خاں کے وسیلے سے آستانہ والا پر حاضر ہوا، ملائے مذکور نے تحصیل علومِ عقل و نقل کے بعد اکثر علوم وفنون میں قابلیت حاصل کی تھی، اور تین روپیہ یومیہ وظیفہ پر قناعت کے ساتھ اپنے وطن میں خلوت نشین رہتا تھا، اس فاضل نے کبھی اہل دولت کے آستانے پر قدم نہیں رکھا، لیکن چونکہ اس کے مقدر میں شہرت و نام و نمود لکھی تھی، لہٰذا اب اس کی فطرت کی بلندی، قابلیت، متانت، وقت نظر غرض کہ ہمہ گیر طبیعت نے بادشاہ پایہ شناس کی توجہ اس پر منعطف کرائی اور پہلے ہی موقعہ پر منصب چہار صدی و ہفتاد سوار پر فائز ہوا، اور خلعت و پانچ گھوڑے اور شمشیر و جمدھر و برچھی و پالکی باساز و اسباب اس کو مرحمت فرمائی گئیں، تین روز کے بعد ملا عبدالعزیز عزت مکرّر سلام کے لئے حاضر ہوا اور بادشاہ خدام نواز نے بجائے لطف اللہ خاں کے ملّا عبدالعزیز کو داروغہ عرض مکرر مقرر فرما کر منصب میں یک صدی و سی سوار کا اضافہ فرمایا، اس کے علاوہ پیش برآمد و دربار خاصہ کی حاضری کی عزت عطا ہوئی، اور آداب و مجرے کی خدمت سے بری فرما کر ان کو صرف سلام علیک کہنے کی اجازت مرحمت ہوئی۔

سیوا جی کا حصار پورندھر پر قبضہ

صوبہ دکن کے واقعات سے معلوم ہوا کہ سیوا جی برگشتہ بخت نے حصار پورندھر پر قبضہ کر کے رضی الدین قلعہ دار کو نظر بند کر لیا ہے۔

بختاور خاں نے تمام اہل دیوانی کو اطلاع دی کہ سال ختم ہونے کے بعد آمدنی و اخراجات کا مفصل حساب حضور میں پیش کریں اور چہار شنبہ کے روز تمام جلدیں دفاتر خالصہ کی ہمراہ لے کر عمارت غسل خانہ میں حاضر ہوں۔

عنایت خاں نے حضرت فردوس آشیانی کے عہد حکومت سے آج تک آمدنی سے چودہ لاکھ روپیہ کے زائد خرچ کی فرد حساب بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش کی، فرمان ہوا کہ خالصہ کی رقم چار کروڑ مقرر کی جائے، اور اس قدر حساب دیگر اخراجات کا بھی ملاحظہ فرما کر قبلہء عالم نے سرکار بادشاہی و بیگمات و شہزادوں کی سرکار میں سے اکثر ابواب میں معتدبہ کمی منظور فرمائی۔

جہاں پناہ نے سُنا کہ حسن علی خاں نے فتنہ پردازوں کے قتل و قید اور ان کے مکانوں اور مال و اسباب کے تاراج کرنے میں پوری جانفشانی سے کام لیا اور شاہ محمد نواز و صیدم بلوچ رضی الدین و لعل محمد و نذر محمد وغیرہ کو ان کے محال زمینداری پر مستقل و برقرار کر دیا۔ قبیلہء عالم نے خان مذکور کو حضور میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔

حسن علی خاں پچیس تاریخ آستانہء شاہی پر حاضر ہوا اور بادشاہ خدام نواز نے تحسین و آفرین سے اس کو دل شاد فرمایا۔

بدر النساء بیگم کا انتقال

اٹھائیس تاریخ نواب عفت مآب بدر النساء بیگم صبیعہء حضرت قبلہء عالم کے انتقال پر ملال کی خبر وحشت اثر تخت گاہ سے پہنچی، جہاں پناہ کو اگر چہ دختر نیک اختر کی وفات سے بے حد رنج ہوا لیکن نہایت خلوص کے ساتھ راضی بہ رضائے الٰہی ہوئے اور حسب الحکم مرحومہ کی روح کو ثواب رسانی کی غرض سے خیرات و مبرات کے مراسم عمل میں لائے گئے بادشاہ دین پناہ کی توجہ سے عفت مآب نے حفظ کلام اللہ کی سعادت حاصل کی تھی اور بہترین اخلاق و آداب کا اپنے کو

نموتہ بنایا تھا۔

شہزادہ محمد معظم کی خود پسندی

جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ شاہزادہ محمد معظم باوجود صاحب شعور و فہم فراست ہونے کے بداخلاق، حاشیہ نشینوں کی صحبت ان کی خوشامد و چاپلوسی سے کچھ راہِ راست سے منحرف ہو گئے ہیں، اور نیز یہ کہ شہزادۂ مذکور نے خود آرائی وخود پسندی کو اپنا شعار بنالیا ہے۔

بادشاہ نے شفقت و مرحمت پدری کے جذبہ سے مجبور ہو کر بار ہانصیحت آمیز فرامین روانہ فرمائے، لیکن شہزادہ پران تحریرات کا کچھ اثر نہ ہوا، قبلہء عالم نے شہزادۂ مذکور کی والدہ یعنی عفت مآب نواب بائی صاحبہ کو تخت گاہ سے اپنے حضور میں طلب فرمایا تاکہ بیگم صاحب خود شہزادہ کے پاس جا کران کو فہمائش کریں اور جس طرح ممکن ہوراہ راست پر لائیں۔

جہاں پناہ نے افتخار خاں خانساماں کو بھی جو ایک سمجھ دار ملازم شاہی تھا شہزادہ کے پاس روانہ فرمایا اوراس کی زبان سے بہترین نصائح شہزادہ کے کانوں تک پہنچائے۔

چونکہ شہزادہ کی نیت قطعی صاف تھی اور مخبروں کے بیانات میں صدق وراستی کی جھلک بھی نہ تھی شہزادہ کو کمال خجالت ہوئی اور سوا اطاعت و فرماں برداری قبول کرنے کے چارۂ کار نظر نہ آیا۔

شہزادہ محمد معظم کی عجز وانکساری

شہزادہ محمد معظم نے بے حد عجز وزاری و غایت شرم ساری کا اظہار کیا اور خدائے مجازی و خداوند حقیقی کی رضا جوئی کو سرمایہء دین و دنیا سمجھ کر سعادت دارین حاصل کی، بادشاہ جُرم پوش نے بھی فرزند ارجمند کو طرح طرح کی نوازش سے سرفراز فرمایا۔

التفات خاں اور ملتفت خاں پر عتابِ شاہی

افتخار خاں سے جو لغزش واقع ہوئی اس کی بنا پر جہاں پناہ اس سے بے حد ناراض ہوئے، افتخار خاں بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا اور قبلہء عالم نے اس کو اور اس کے برادر ملتفت خاں کو مورد عتاب سمجھ کران کے خطاب ومنصب ضبط فرمائے۔

تیرہ تاریخ بادشاہ کو معلوم ہوا کہ دلیر خاں دیوگڑھ کے زمیندار کو اس کے محال پر مستقل کر کے

خوداورنگ آباد پہنچ گیا۔

عفت مآب نواب بائی صاحبہ جو حسب الطلب تخت گاہ سے آستانہ شاہی کو روانہ ہوئی تھیں دوسری ذی الحجہ کو بہشت آباد سکندرہ کے قریب پہنچیں، شہزادہ محمد اکبر و بخشی الملک اسد خاں و بہرہ مند خاں ملکہ کے استقبال کے لئے گئے، اور سواری کو حرم سرا تک پہنچا دیا۔

دسویں ذی الحجہ کو قبلہء عالم نے نماز وقربانی کی رسم ادا فرمائی، اور حسب دستور سابق دوست محمد خطیب کو خلعت و پانچ سو روپیہ انعام اور نعمت خاں بکاول کو ایک چاقو مرحمت فرمایا۔

جہاں پناہ نے دلیر خاں داؤد خاں کو خلعت و جمدھر مرصع گرز بردار کی معرفت روانہ کیا۔

مکرمت خاں کی تبدیلی سے حاجی شفیع خاں دکن کی دیوان داری پر مقرر کیا گیا، اور اس کی جگہ کفایت خاں دیوان دفتر تن کے عہدے پر فائز ہوا، شاہ خواجہ کو بجائے کفایت خاں کے داروغہ داغ و تصحیحہ مقرر فرمایا۔

عفت مرتبت نواب بائی اورنگ آباد روانہ ہوئیں اور حکم ہوا کہ بادشاہ زادہ محمد سلطان کے پاس جو گوالیار کے قلعہ میں قید تھا دو روز قیام کریں، سربلند خاں نے بیگم صاحب کو شہزادہ محمد معظم کے پاس دکن پہنچا دیا۔

جمدۃ الملک جعفر خاں کی وفات

جمدۃ الملک جعفر خاں کے مرض نے طول پکڑا اور بادشاہ بندہ پرور دو مرتبہ اس کے مکان پر تشریف لے گئے، پچیس تاریخ کو جمدۃ الملک نے وفات پائی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ امیر بہترین عادات وصفات کا مجموعہ تھا، قبلہء عالم کو جمدۃ الملک جیسے بہترین اعیان دولت کی رحلت کے بے حد قلق ہوا اور حکم دیا کہ تین روز متواتر ایک سو بیس قاب خاصہ کے اہل ماتم کے پاس روانہ کئے جائیں، شہزادہ محمد اعظم و شہزادہ محمد اکبر کو حکم ہوا کہ جعفر خاں کے فرزندوں نامدار خاں و کامگار خاں کے مکان پر اُن سے جا کر اور عفت مرتبت فرزانہ بیگم ان کی والدہ سے مراسم ماتم پُرسی بجالائیں، جمدۃ الملک کے دونوں بیٹوں کے لئے خلعت خاص اور ان کی والدہ کے واسطے لباس مرحمت ہوا، شہزادہ محمد اکبر مرحوم کے دونوں فرزندوں کو سوگواری کے غم واندوہ سے نجات دے کر حضور شاہی میں لایا گیا قبلہء عالم نے دونوں کو خلعت خاص خنجر مرصع مع علاقہ

مروارید کے مرحمت فرما کر ہر طرح کی نوازش و شفقت سے سرفراز فرمایا اور ان کو قید غم سے قطعاً آزاد کیا۔

غنی الملک اسد خاں و میرزا بہرام و بہرہ مند خاں و شرف الدین اس کے فرزندوں اور التفات خاں اور مفتخر خاں اور مفاخر خاں و روشن دل خان وغیرہ کو خلعت ماتمی خان مذکور کا مرحمت ہوا۔

غنی الملک اسد خاں نیابت دیوانی پر فائز ہوا اور اس کو مرصع خنجر اور دو بڑے پان کے دست مبارک سے عطا ہوئے، جہاں پناہ نے حکم دیا کہ اسد خان بادشاہ زادہ محمد معظم کی سرکار میں سیاہہ نویسی کرے۔ اور دیانت خاں شاہزادہ مذکور کا مُہر بردار مقرر کیا جائے۔

ستائیس تاریخ کو یکہ تاز خان سفارت بخارا کی خدمت پر مامور ہوا، اور اسپ یک صد مہری و فیل قیمتی چار ہزار و جمدھر مرصع و جیغہ ء مرصع مرحمت ہوا، یکہ تاز خاں در اصل ہزار و پانصدی و پان صد سوار کا منصب دار تھا اب سو سواروں کے اضافہ سے شادکام فرمایا گیا۔

عبدالعزیز والی بخارہ کو علاوہ ہندوستانی تحائف کے جن کی قیمت دو لاکھ روپیہ سے زائد تھی پانچ تازی و چار عدد کچھی گھوڑے بھی روانہ فرمائے گئے، یکہ تاز خاں کے بجائے مغل خاں میر تزک مقرر ہوا اور اسے عصائے طلا مرحمت ہوا، ناظم خاں کے بجائے مبارز خاں ناظم ملتان ہوا، جہانگیر قلی خاں شہزادہ محمد اعظم کی نیابت میں چکلا سنبھل کا فوج دار مقرر فرمایا گیا۔

جہاں پناہ نے بجائے مہابت خاں کے سرگروہ عمایدِ محمد امین خاں کو بذریعہ فرمانِ مبارک صوبہ کابل کے بندوبست و انتظام کا حکم دیا، فدائی خاں کے بجائے تربیت خاں اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا، اور فدائی خاں حضور شاہی میں حاضر ہوا اور جہاں پناہ نے بنابر مصلحت حکم دیا کہ گوالیار میں قیام کرے، بادشاہ نے فدائی خاں کو خلعتِ رخصت عطا فرمایا۔ اور یہ امیر شرف قدم بوسی حاصل کر کے روانہ ہو گیا۔ فدائی خاں کے ہمراہیوں میں رعد انداز خاں داروغہ ء توپ خانہ رکاب راجہ دھنی سنگھ و غنی خاں و سید علی اکبر و رومی خان و کار طلب خاں میواتی و بدیع سلطان بلخی، میرزا صدرالدین ولد میرزا سلطان وغیرہ اپنے اپنے مراتب کے مطابق اضافہ ء منصب و خلعت و اسپ و شمشیر مرصع و جمدھر وغیرہ کے عطیات سے سرفراز کئے گئے۔

جانی خان، رعد انداز خاں کی نیابت میں داروغہ ء توپ خانہ رکاب مقرر ہوا۔

بیدار بخت کی پیدائش

ستائیس ربیع الاوّل کو شاہزادہ محمد اعظم کے محل میں جہاں زیب بانو بیگم کے بطن سے فرزند نرینہ پیدا ہوا، قبلہء عالم اس پوتے کی ولادت سے بے حد خوش ہوئے اور شاہزادے کو خلعت فاخرہ عطا فرما کر مولود کو بیدار بخت کے نام سے موسوم کیا، جہاں پناہ نے بچے کو کلاہ مروارید قیمتی دس ہزار اور بیگم کو مالائے مروارید قیمتی دس ہزار اور سمرنی قیمتی سات ہزار مرحمت فرمائیں امانت خاں عرف سید احمد کو خطاب خانی مرحمت فرما کر صوبہء بنگالہ کا دیوان مقرر کیا، خان علوشان عبداللہ خان والی کاشغر، حرمین شریفین کی زیارت سے بہرہ اندوز ہو کر بارگاہ شاہی میں واپس آیا، اور قبلہء عالم نے خان مذکور کو سورت و مالوہ کے خزانہ سے ایک لاکھ روپیہ بطور انعام مرحمت فرمائے۔

دانشمند خاں کی وفات

معلوم ہوا کہ دانش مند خاں میر بخشی ناظم وقلعہ دار اکبر آباد نے دسویں ربیع الاول کو وفات پائی، یہ نامی امیر اپنے زمانہ کا فاضل وعلامہّ دہر تھا، اور زندگی بے حد تقویٰ وعبادت کے ساتھ بسر کرتا تھا۔

لشکر خاں صوبہ دار ملتان جو بادشاہ کے حضور میں حاضر تھا بخشی گری اول کی خدمت پر مامور کر دیا گیا، یہ شخص اصل چار ہزاری و چار ہزار سوار کا منصب دار تھا، اب ایک ہزاری ہزار سوار کا اضافہ منظور ہوا۔

ہمت خاں بخشی سوم اسد خاں کے بجائے بخشی گری دوم کے عہدہ پر فائز ہوا۔

نامدار خاں اکبر آباد کا ناظم و معتمد خاں قلعہ دار مقرر کئے گئے، سید امیر خاں جو منصب سے استعفیٰ دے کر اکبر آباد میں مقیم تھا، سترہ ربیع الآخر کو فوت ہوا، محمد ابراہیم ومحمد اسحاق ومحمد یعقوب اس کے برادرزادے یعنی شیخ میرزا کے فرزند خلعت تعزیت وعنایات شاہی سے سرفراز کئے گئے۔

پشاور کے معروضہ سے معلوم ہوا کہ محمد امین خاں دس ربیع الآخر کو شہر میں پہنچ گیا، اسد خاں، مرتضیٰ خاں، عابد خاں وحسن علی خاں وطاہر خان وغیرہ کو خلعت مرحمت ہوئے، احمد سعید خاں، بیگم صاحب کی سرکار میں دیوان مقرر کیا گیا، اور بجائے اس کے لطف اللہ خاں داروغگی عرض مکرر کی خدمت پر سرفراز کیا گیا بادشاہ زادہ کے وکلاء کے بجائے فیض اللہ خاں فوج دار سنبھل مقرر فرمایا

گیا، اور اس کے بجائے سربلند خاں کو قوش بیگی کی خدمت عطا ہوئی۔

چوبیس جمادی الآخر مطابق سترہ آبان کو جشن وزن شمسی منعقد کیا گیا، اور بادشاہ نے طلائی تخت پر جلوس فرمایا، شہزادوں اور امرائے دربار نے مبارک باد عرض کی اور ہر شخص نوازشِ سلطانی سے شاد فرمایا گیا۔

سیواجی کا بندر سورت پر حملہ

جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ سیواجی مرہٹہ نے بندر سورت پر حملہ کر کے اہل شہر کو تباہ و برباد کیا اور اس کے بعد واپس گیا۔

محمد معظم کے ایک اور فرزند کی پیدائش

میرزا محمد وکیل نے شہزادہ محمد معظم کی عرض داشت مع ایک ہزار اشرفیوں کے بادشاہ کے ملاحظے میں پیش کی جس سے معلوم ہوا کہ شہزادہ مذکور کے محل میں نور النساء بیگم دختر سنجر نجم ثانی کے بطن سے فرزند نرینہ پیدا ہوا ہے، بادشاہ نے مولود کو رفیع الشان کے نام سے موسوم فرمایا۔

مہابت خاں

سربلند خاں جو ملکہ نواب بائی کے ہمراہ دکن گیا ہوا تھا، آستانہ ءوالا پر حاضر ہوا، مہابت خاں صوبہ کابل کا معزول حاکم خدمت اقدس میں حاضر ہو کر شرف قدم بوسی سے فیض یاب ہوا جہاں پناہ نے اس امیر کو دیکھ کر زبان مبارک سے فرمایا کہ: ''خوش آمدید وصفا آوردید۔'' پچیس رجب کو مہابت خاں دکن روانہ ہوا، اور اس کو خلعت بانیمہ آستین گریبان دار واسپ باساز طلا و فیل مرحمت ہوا، اس کے فرزند بہرام کو خنجر مرصع مرحمت ہوا، راؤ روپ سنگھ ولد راؤ کرن و راجہ امر سنگھ ولد کشن سنگھ و دلیر ہمت برادر و سہراب برادر زادۂ مہابت خاں، خلعت و فیل واسپ و خنجر و شمشیر کے عطیات سے سرفراز فرمائے گئے، جہاں پناہ نے حکم صادر فرمایا کہ شہزادوں اور امراء کی کشتیوں اور پالکیوں پر فرنگیوں سے مشابہ زنجیر نہ ٹا کے جائیں۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا چودھواں سال

1081ھ/1671ء

اسی مبارک زمانہ میں رمضان کا مقدس مہینہ آ گیا اور خلقت خدا پر آسمانی برکات کا مینہ برسنے لگا، بادشاہ دین پناہ کے عہد معدلت کا چودھواں سال شروع ہوا، دولت خانہ شاہی میں حسب دستور سابق آئین بندی کی گئی اور ہر چہار جانب عیش و مسرت کا دور دورہ ہوا، عیدالفطر کے روز قبلہء عالم نے بعد نماز تخت کامرانی پر جلوس فرما کر رعایا کو داد و دہش سے دل شاد کیا، شہزادوں و امرائے نامدار کے تحائف بادشاہ کے ملاحظہ میں پیش ہوئے۔

لشکر خاں کے انتقال کی وجہ سے اسد خاں بخشی گری درجہء اول پر فائز ہوا، حسن علی خاں اسپ و خلعت کے عطیہ سے سرفراز فرمایا گیا، سفیر بخارا مسمی محمود شریف پانچ ہزار روپیہ کے انعام خلعت و اسپ باساز طلا کے گراں بہا عطیات سے بہرہ مند ہوا۔

شریف مکہ معظمہ کے قاصد مسمی شیخ علی خاں نے دو عربی گھوڑے اور شمشیر بند و باز نقرہ شریف مذکور کی جانب سے جہاں پناہ کے ملاحظہ میں پیش کیا، قبلہء عالم نے قاصد کو خنجر مرصع اور دس ہزار روپیہ و اشرفیاں اور خلعت مرحمت فرمایا، سید محمد رومی فرستادۂ حاکم حبش کے عرائض نظر مبارک سے گزرے ملازمت کے وقت جہاں پناہ نے اسے خلعت عطا فرمایا اور واپسی کی اجازت دیتے وقت بھی اسے خلعت اور دس ہزار روپیہ مرحمت ہوئے۔

پلنگ توش خان بہادر، شمشیر و جمدھر و برچھی و سپر کے گراں قدر عطیات سے سرفراز فرمایا گیا، روح اللہ خاں کے تبادلہ کی وجہ سے ارادت خاں کو آختہ بیگی کا عہدہ عنایت ہوا سعادت خاں قاقشال جو حضور شاہی میں حاضر ہوا تھا، اپنی متعلقہ خدمت پر روانہ ہوا۔

دسویں ذی الحجہ کو نماز قربانی کے مراسم ادا فرمائے گئے نواب قدسیہ پرہز بانو بیگم و گوہر آرا بیگم کو پانچ پانچ ہزار اشرفیاں مرحمت ہوئیں۔

محمد امین خاں حسب الحکم چودہ صفر کو بارگاہ میں حاضر ہوا لطف اللہ خاں و اسد خاں نے دروازۂ غسل خانے تک اس کا استقبال کیا، اور حضور میں لے آئے، محمد امین نے شرف قبولیت حاصل کر کے چار عربی گھوڑے ملاحظہء والا میں پیش کئے، جہاں پناہ نے خلعت مرحمت فرما کر اس کے احوال کی پرسش فرمائی۔

نورس بانو بیگم کی وفات

بائیس محرم کو عفت مرتبت نورس بانو بیگم جہاں پناہ کی خوش دامن زوجہء شاہ نواز خاں صفوی نے رحلت فرمائی، داراب خاں و خانہ زاد خاں فرزندان میرزا ابو سعید کو (نور جہاں بیگم کے بھانجے تھے) خلعت ماتمی مرحمت ہوا۔

امیر الامراء کے پیش کش و تحائف فیل اور دیگر اشیا جنگی قیمت تقریباً دو لاکھ بیس ہزار تھی حضرت کے ملاحظہ میں پیش ہوئے، شادکام چیلا جو قبلہء عالم کا پرانا ملازم تھا فوت ہوا، بادشاہ خدام نواز نے اس کے پس ماندگان کو خلعت و خدمات مرحمت فرمائے۔

ارباب خاں کی وفات

ارباب طرب کے مشہور استاد بسرام خان نے وفات پائی اور اس کے فرزند اور خوش حال خاں کو بھی ماتمی خلعت مرحمت فرمائے گئے، ضیاء الدین حسین و یادگار حسین و محمد حسین (اشرف خاں کے نواسے) ملازمت شاہی میں حاضر ہو کر عطیہء خلعت سے سرفراز فرمائے گئے، چونکہ ان کی فربہی و تنومندی کا ذکر خود زبان مبارک سے ارشاد فرمایا، ہر روز ان میں سے ایک کو شرف باریابی عطا فرمایا گیا۔

علی مرداں خان امیر الامراء کا فرزند محمد علی بیگ ولایت سے ہندوستان وارد ہوا، قبلہء عالم نے اس کو خلعت و شمشیر و خنجر مرصع و علاقہء مروارید دس ہزار روپیہ مرحمت فرمائے، میر محمود برادر اصالت خاں تازہ ولایت سے وارد ہوا اور دوسری تاریخ لآخر کو شاہی حضور میں پیش کیا گیا، خنجر مرصع

وسات ہزارروپیہ کے عطیہ سے سرفراز فرمایا گیا، داؤد خاں کے تبادلہ کی وجہ سے ہوش دار خاں ناظم بُرہان پور مقرر ہوا، داؤد خاں، آستانہءوالا پر حاضر ہوا اور میر خاں کے تبادلہ کی وجہ سے وہ الہ آباد کا ناظم مقرر فرمایا گیا، جہاں پناہ نے داؤد خاں کو خلعت خاص و اسپ باساز طلا و فیل باساز برنجی مرحمت فرمائے۔

عنایت خاں دفتر دار خالصہ کو خلعت مرحمت فرما کر چکلر بریلی کا فوج دار متعین فرمایا۔ اور اس کے بجائے امانت خاں عرف میرک معین الدین کا تقرر عمل میں آیا، اور اس کو ایک بلورین دوات مرحمت ہوئی، محمد علی بیگ کو علی قلی خاں کا خطاب وعلم و نقارہ و اسباب قیمتی بیس ہزار روپیہ کا مرحمت ہوا، یحییٰ بادشاہ جو بجائے حسین پاشا کے شاہ روم کی طرف سے حاکم بصرہ مقرر ہوا تھا، چند وجوہات کی بنا پر بصرہ میں قیام نہ کر سکا اور بادشاہ شرفا نواز نے اس کو خلعت خاصہ تکمہ دار زری، شمشیر و خنجر مرصع اور دس ہزار روپیہ بطورِ انعام مرحمت فرمائے، اس کے علاوہ پاشائے مذکور کو منصب ہزار و پانصدی و ہفت صد سوار پر فائز فرمایا۔

جہاں پناہ نے بارانی خلعت شہزادوں اور امیران دربار و صوبہ جات کو مرحمت فرمائے، مبارز خاں کے تبادلہ کی وجہ سے عابد خاں ملتان کا صوبہ دار مقرر فرمایا گیا۔

روشن آرا بیگم کی وفات

سترہ جمادی الاوّل بروز پنج شنبہ نواب عفت قباب روشن آرا بیگم، قبلہء عالم کی ہمشیرہ نے رحلت فرمائی، بیگم صاحبہ بہترین عادات وعمدہ خصائل کی مجموعہ تھیں، روشن آرا بیگم کو برادر گرامی مرتبت یعنی خود بدولت حضرت جہاں پناہ کے ساتھ بے حد محبت تھی، قبلہء عالم کو ایسی شفیق بہن کی دائمی مفارقت کا بے حد صدمہ ہوا لیکن صبر و شکر کے ساتھ راضی برضائے الٰہی ہوئے اور مرحومہ کی روح کو ثواب رسانی کی غرض سے خیرات ومبرات کے تمام مراسم عمل میں لائے گئے جہاں پناہ نے بیگم صاحب کے تمام متعلقین کو شاہانہ نوازش سے سرفراز فرما کر ان کے بدن سے لباس ماتمی دور فرمایا۔

اعیان ملک کے سرگروہ محمد امین خاں کو عہدۂ وزارت سپرد فرمانے کے لئے حضور میں طلب فرمایا گیا، اگرچہ یہ امیر صائب الرائے اور فہم و فراست و دیانت میں ضرب المثل ہے لیکن اس کے

ساتھ رعونت وخودرائی بھی اس کی سرشت میں داخل ہے۔

محمد امین خاں نے بعض خلاف مزاج معروضات کے منظور فرمانے میں قبلہ عالم سے اصرار کیا اور اُسے روز سیاہ دیکھنا پڑا، جہاں پناہ نے امین خاں کو عہدۂ وزارت سے معزول فرما کر کابل کا صوبہ دار مقرر کیا، اور رخصت کے وقت خلعت خاص و خنجر مرصع با علاقہ مروارید و فیل باساز نقرہ اس کو مرحمت فرمائے۔

افتخار خاں و مفتخر خاں کا قصور معاف ہوا اور ان کے خطابات و مناصب بحال فرمائے گئے۔

افتخار خاں، سیف خاں کے بجائے ناظم صوبہ کشمیر اور مفتخر خاں کو معتمد خاں کے عہدہ پر حصار دہلی کا قلعہ دار مقرر فرمایا گیا، چودہ جمادی الآخر کو میر خاں الہ آباد کے معزول صوبہ دار نے شرف باریابی حاصل کیا، لطف اللہ خاں نے لشکر خاں کی دختر سے نکاح کیا اور اس کو خلعت کتخدائی عطا ہوا۔

کامگار خاں امیر الامراء کی خدمت میں روانہ ہوا، صوفی بہادر، نوشہ خاں والی اور گنج کا حاجب مقرر ہوا، اور اس کو خلعت وجیغہ مرصع و شمشیر و ترکش مرحمت ہوئے، نامدار خاں صوبہ اکبر آباد کا ناظم اور معتمد خاں حصار کا قلعہ دار مقرر کیا گیا۔

جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ خان عالی شان عبداللہ خاں سفر حجاز سے واپس ہو کر بارگاہ شاہی میں دوبارہ حاضر ہو رہا ہے، جہاں پناہ نے الطاف خسروانہ سے اس کی مہمان داری و دل جوئی کے لحاظ سے ایک ہزار اشرفیاں اور ایک نقرئی سپر پوش مرحمت فرمایا۔

جہاں پناہ کا اکبر آباد سے دہلی واپس آنا

دسویں رجب کو قبلہ عالم اکبر آباد سے دہلی روانہ ہوئے، اور تمام راہ صید افگنی میں طے فرمائی، یکم شعبان کو جہاں پناہ خضر آباد پہنچے اور چوتھی تاریخ حضرت خواجہ قطب الدین بختیارؒ و حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی رحمتہ اللہ علیہما کے مزارات پُر انوار کی زیارت سے فیض یاب ہوئے اور ہر دو مقامات متبرکہ کے مجاورین کو ایک ہزار پانچ سو روپیہ مرحمت فرمائے۔

قبلہ عالم سعادت زیارت حاصل فرما کر حرم سرائے شاہی میں تشریف فرما ہوئے۔

بادشاہزادہ محمد اعظم کے محل میں بیگم صاحب کے بطن سے فرزند پیدا ہوا، چھبیس شعبان کو

تولد فرزند کی نذر مبلغ ایک ہزار اشرفی شہزادہ کی جانب سے ملاحظہء عالی میں پیش ہوئی، قبلہء عالم نے نذر قبول فرما کر مولود کو جوان بخت کے نام سے موسوم فرمایا۔

خان والا شان عبداللہ خان قبلہء عالم کے ورود سے قبل دہلی پہنچ چکا تھا، اسد خاں و بہرہ مند خاں مذکور کو بادشاہ کے حضور میں لائے اور جہاں پناہ نے دو ہزار اشرفیاں اور پچاس قاب طعام خان مذکور کی فرودگاہ پر روانہ فرمائے، امیر خان جو اپنے منصب سے برطرف کر دیا گیا تھا دوبارہ عہدہ پر فائز ہوا۔

میر محمود کو خطاب عقیدت خان و منصب یک ہزاری و چہار صد سوار مرحمت ہوا، چوبیس شعبان کو محمد امین خاں کے پیش کش یعنی دو سو اَسّی دانہ ہائے مروارید قیمتی ایک لاکھ پانچ ہزار روپیہ اور پچاس گھوڑے جہاں پناہ کے ملاحظہ میں پیش ہوئے اور امین خاں کو قبول نذر کا شرف حاصل ہوا۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا پندرہواں سال

1082ھ/1672ء

اسی مبارک زمانہ میں رمضان کا مقدس مہینہ آیا اور شاہی جود و احسان کے بارندۂ ابر نے اہل حاجت کی کشتِ امید کو سیراب فرمایا، شہزادوں و امیروں کے مناصب میں اضافہ فرما کر بادشاہ دریا نوال نے نمک خواروں کو طرح طرح کی نعمتوں سے فیض یاب فرمایا۔

عقیدت خاں نے روح اللہ خاں کی دختر سے عقد کیا، اور اسے خلعت کتخدائی مرحمت ہوا، کامگار خاں و جعفر خاں پسران ہوش دار خان ناظم صوبہ برہان پور پسر ملتفت خاں عالم گیری ابن اعظم خاں جہانگیری جس نے برہان پور ہی میں وفات پائی تھی، شاہی ملازمت میں حاضر ہوئے اور طرح طرح کی نوازشوں وعنایات سے سرفراز کئے گئے۔

اعتقاد خاں کی وفات

ہوش دار خاں کے انتقال پر مختار خاں صوبہ خاندیس کا حاکم مقرر فرمایا گیا، اعتقاد خاں اپنے برادر امیر الامراء سے ملاقات کرنے کے لئے گیا تھا، تقدیر الٰہی سے اس امیر نے وہیں وفات پائی، قبلۂ عالم نے اس کے فرزند محمد یار کو خلعت تعزیت مرحمت فرما کر اس کو سوگواری کے غم سے آزاد فرمایا، جہاں پناہ نے اعتقاد خاں کی وفات پر خود امیر الامراءؒ کو بھی خلعت ماتمی و نامۂ تعزیت روانہ فرما کر سرفراز کیا، اعتقاد خاں مرحوم فقیر دوست اور آزاد مشرب امیر تھا، اس کی جدت پسند طبیعت نے بے شمار کلمات وامثال خود ایجاد کی تھیں جو زبان زد عام و خاص ہیں۔

ست نامیوں کی شورش

ناظرین اس واقعہ کو دیکھ کر حیرت کریں گے کہ ایک بے سروپا خون گرفتہ باغی گروہ نے جس

میں، سنار، بڑھئی، خاک روب، موچی اور دیگر کم پیشہ لوگ شامل تھے سرکشی کا ارادہ کیا، اس جہنم نصیب گروہ کے سر پر قضا سوار ہوئی اور خود پرستی نے ایسا دل و دماغ پر قبضہ کر کے عصیان و بغاوت پر آمادہ کیا کہ ان کے سر خود ان کے کاندھوں پر بار گراں ہو گئے۔

بہ مقتضائے مثل مشہور۔۔۔ ''صید راچوں اجل آید سوئے صیاد رود'' اس ناعاقبت اندیش فرقہ نے بادشاہ عالم و عالمیان کے خلاف شورش برپا کی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ایک حشر انبوہ گروہ مفسدوں کا جو میوات کا باشندہ ہے حشرات الارض کی طرح زمین سے دفعتہً نکل پڑا ہے، اور مور و ملخ کی طرح جمع ہو کر سامنے آیا۔

کہتے ہیں کہ ان شورہ پشتوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ گروہ اپنے کو زندۂ جاوید جانتا اور یہ سمجھتا ہے کہ اگر ان میں سے ایک قتل ہوگا تو اس کی جگہ ستر اشخاص پیدا ہوں گے۔

مختصر یہ ہے کہ ایسے پانچ ہزار مفسدوں نے نارنول کے نواح میں فتنہ و فساد کا بازار گرم کیا اور جرأت کر کے شاہی قصبات و پرگنات کو تباہ و برباد کرنے لگے۔

طاہر خاں فوج دار نارنول نے اپنے میں مقابلہ کی طاقت نہ پائی اور آستانۂ شاہی پر حاضر ہو کر سارا واقعہ بیان کیا، جہاں پناہ نے ان بدبختوں کے استیصال پر پوری توجہ فرمائی، چھبیس ذی قعدہ کو رعد انداز خاں توپ خانہ کی فوج و حامد خاں چوکی خاصہ اور نیز اپنے باپ سید مرتضیٰ خاں کے پانچ سو سواروں اور یحییٰ خاں، رومی خاں و کمال الدین ولد دلیر خاں و پردل پسر فیروز خاں میواتی و اسفند یار بخشی و بادشاہ زادہ محمد اکبر مع اپنی فوج کے ان فتنہ پسندوں کے قتل و قید کرنے کے لئے روانہ فرمائے گئے۔

شاہی فوج نواح نارنول میں پہنچی اور فتنہ پردازوں نے ان امیروں کا مقابلہ کیا، باوجود بے سروسامانی بے دینوں نے ان پرانے افسانوں کو جو ہندوؤں کی کتابوں میں مرقوم ہیں، تازہ کر دیا، اور اہل ہند کی اصطلاح کے موافق یہ ہنگامہ کارزار بھی مہابھارت کا نمونہ بن گیا۔

مسلمانوں نے بھی بے حد دلیری کے ساتھ حملہ کیا اور فتنہ پردازوں کے خون سے اپنی تلوار اور معرکہ جنگ کی زمین کو سیراب کر دیا، شدید خوں ریز لڑائی ہوئی جس میں امرائے شاہی نے عام طور پر اور رعد انداز خاں، حامد خاں و یحییٰ خاں نے بالخصوص جوہر مردانگی دکھائے، اکثر شاہی امیر و سپاہی میدان جنگ میں کام آئے، لیکن آخر کار اقبال عالم گیری نے اپنا رنگ دکھایا اور حریف

معرکہء کارزار سے فرار ہو گئے، مسلمانوں نے ان کا تعاقب کر کے ایک بہت بڑے گروہ کو ہلاک کیا، معدودے چند فتنہ پرداز ہلاکت سے بچ گئے اور شاہی فوج کو کامل فتح ہوئی، نواح نارنول ان اشرار کے نجس وجود سے پاک ہوا، اور اہلِ لشکر فتح مندی کے ساتھ حضور شاہی میں حاضر ہوئے۔

بادشاہ خدام نواز نے امیروں کی جاں نثاری کی بے حد تعریف فرمائی، رعد انداز خاں کو شجاعت خاں کا خطاب مرحمت ہوا اور اس کے اصل منصب میں اضافہ ہوا اور اب سہ ہزار پانصدی دو ہزار سوار کے مرتبے پر فائز کیا گیا، حامد خاں یحییٰ خاں رومی خاں ونجیب خاں غرض کہ تمام خورد و بزرگ جنہوں نے اس معرکہء کارزار میں اپنی تلوار کے جوہر دکھائے تھے، اضافہ وخلعت کے عطیات سے سرفراز فرمائے گئے۔

محمد امین خاں کی شکست

دسویں ذی الحجہ کو قبلہء عالم نے عیدگاہ میں نماز پڑھی اور اس کے بعد قربانی کی رسم ادا کی گئی۔

صاحبان بصیرت کو معلوم ہے کہ جس طرح فتح ونصرت عطا کرنا خدا کے قبضہء اقتدار میں ہے اسی طرح دشمن کے مقابلے میں ناکام کرنا بھی اسی قادر مطلق کے اختیار میں ہے کسی فرد کا دنیا میں معزز و باتوقیر ہونا محض فضل الٰہی پر منحصر ہے جس میں انسان کو ذرہ برابر بھی دخل نہیں ہے۔

عام قاعدہ ہے کہ اگر تقدیر نے تدبیر کا ساتھ دیا تو انسان بیدار مغز خوش فکر و بلند طالع کہلاتا ہے اور اگر قسمت نے یاوری نہ کی تو ہر پانسہ الٹا پڑتا ہے، اور غریب انسان کم رائے و تیرہ بخت جیسے دل خراش ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا جملہ صحیح معنوں میں محمد امین خان پر صادق آیا کہ یہ امیر بڑے جاہ وجلال وشوکت و حشمت کے ساتھ کابل روانہ ہوا تھا تاکہ شورہ پشت افغانوں کے فتنہ کو فرو کرے اور اپنی خواہش کے مطابق حریف کے سر پر پہنچ گیا، اور دشمن بالکل اس کے قابو میں آ گیا لیکن تقدیر نے تدبیر کا ساتھ نہ دیا، اور معاملہ قطعاً برعکس ہو گیا۔

اس واقعہ کا تفصیلی بیان یہ ہے کہ محمد امین خان نے تیسری محرم کو کوتل خیبر سے عبور کرنے کا ارادہ کیا، اس امیر کو اطلاع ملی کہ افغانوں نے یہ معلوم کر کے کہ محمد امین خاں کی سرکوبی واستیصال کے لئے آ رہا ہے درّہ کو بالکل بند کر دیا، محمد امین خاں نے اس خبر کو کچھ اہمیت نہ دی اور یہ سمجھ کر کہ

حریف کو پائمال کر دینا بے حد آسان ہے آگے قدم بڑھایا، دوران عبور میں چند بد اندیشہ اشخاص کی سوئے تدبیر سے ان پر وہی حادثہ پیش آیا جو حضرت عرش آشیانی اکبر بادشاہ کے عہد میں، زین خان کوکہ حکیم ابوالفتح و راجہ بیربل کے سامنے آیا تھا۔

افغانوں نے ہر چہار طرف سے گھر کر تیر و تبر کی بوچھار شروع کر دی، اہل لشکر کا مجمع پرا گندہ ہونے لگا، اور گھوڑے اور ہاتھی ایک دوسرے پر گرنے لگے۔

اس حادثہ میں اگرچہ ہزار اشخاص پہاڑ کی بلندی سے غاروں میں گر کر ہلاک ہوئے لیکن محمد امین خاں نے فرط غیرت سے جاں نثاری پر کمر ہمت باندھی مگر اس کے ملازم اس کو چاروں طرف سے گھیر کر معرکہء کارزار سے سلامت لے آئے، رشید خاں فرزند عبداللہ خاں اسی معرکہ میں قتل ہوا، اور امین خاں تمام مال و اسباب سے دست بردار ہو کر بہ حال تباہ لاہور واپس آیا۔

بارہ محرم کو قبلہ عالم نے یہ وحشت انگیز خبر سُنی اور فتح و شکست کو مرضی الٰہی پر محمول فرمایا۔

تیس محرم کو فدائی خاں لاہور سے پشاور روانہ ہوا بیس محرم کو سر بلند خاں، نامدار خاں کے تغیر سے اکبر آباد کا ناظم مقرر کیا گیا اور سر بلند خاں خاں کے بجائے ملتفت خاں داروغہ سپاہیان جلو متعین فرمایا گیا، فیض اللہ خاں کو خلعت خاص و اسپ با سازِ طلا مرحمت ہوا اور یہ امیر مراد آباد روانہ کیا گیا۔

عبداللہ خاں کو بیس ہزار روپیہ مرحمت ہوئے، سیف خاں گوشہ نشین ہو چکا تھا، اس کو دوبارہ عہدۂ ملازمت عطا ہوا اور خلعت و شمشیر کے ساتھ اپنے قدیم منصب پر بھی بحال فرمایا گیا۔

شہزادہ محمد اکبر اور سلیمہ بانو بیگم کا جشنِ کدخدائی

اسی مسرت انگیز زمانہ میں بادشاہ زادہ محمد اکبر کے جشن کدخدائی کا انعقاد ہوا، سلیمہ بانو بیگم دختر شہزادہ سلیمان شکوہ نواب قدسیہ گوہر آراء بیگم نے اپنی فرزندی میں لے کر شہزادی کی پرورش کی تھی، شہزادہ محمد اکبر کا نکاح شہزادی کے ساتھ کیا گیا، اور گوہر آراء بیگم صاحبہ کے در دولت پر جشن منعقد ہوا۔

قبلہء عالم نے شہزادہ موصوف کو چار لاکھ روپیہ نقد و خلعت خاص با نیمہ آستین و کلغی و رہوپ مرصع اور مالا اور سہرہ مروارید دو عربی گھوڑے مرحمت فرمائے۔

دوسری ربیع الاوّل کو مسجد جامع میں حضرت بندگان والا کی وکالت میں قاضی القضاۃ عبدالوہاب نے خطبہء نکاح پڑھا اور پانچ لاکھ کی رقم کابین قرار پائی، حاضرین مجلس نے مبارک

بادعرض کی اور پانچ گھڑی شب گزرنے کے بعد شہزادہ محمد اکبر سوار ہوا اور شہزادہ محمد اعظم و بخشی الملک اسد خاں و میر خاں و نامدار خاں وغیرہ امرائے کبار شہزادہ کے ساتھ ہوئے دہلی دروازے سے قریب نواب قدسیہ بیگم کے محل تک دورویہ بانس کی باڑھ باندھ کر روشنی کا انتظام کیا گیا تھا، جس کی وجہ سے ایک عجیب دل کش نظارہ تھا آتش بازی کی کثرت واقسام سے ناظرین حیرت زدہ تھے، غرض کہ جشن شادی بے حد شان وشوکت و آرائش کے ساتھ انجام پایا اور عروس کا ہودج شہزادہ کے محل میں پہنچادیا گیا۔

معروضہ پیش کیا گیا کہ شہزادہ محمد معظم حسب فرمان شرف قدم بوسی کے لئے روانہ ہوئے ہیں، نویں ربیع الآخر کو شہزادۂ مذکور حضور معلیٰ میں حاضر ہوئے، اور جہاں پناہ نے خلعت خاصہ و شمشیر باساز مرصع و مالائے مروارید واوریسی اور ایک لاکھ روپیہ کی رقم مرحمت فرمائی، بادشاہ زادہ محمد معزالدین و محمد اعظم پر شاہانہ نوازش فرمائی گئی۔

دوسری جمادی الآخر کو محمد شایش بانو بیگم دختر شہزادہ مُراد بخش محمد صالح ولد خواجہ طاہر نقشبندی کے حبالہ ءعقد میں دی گئی، سربلند خاں و قاضی عبدالوہاب وملاّ محمد یعقوب مجلس عقد میں حاضر تھے۔

چھبیس تاریخ کو بارگاہ والا کے دو قدیم نمک خوار وزیر خاں و محمد طاہر نے وفات پائی، میر خاں بجائے وزیر خاں کے مالوہ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا، اور سربلند خاں، ہمت خاں کے تغیر سے صوبہ دار اکبر آباد بنالیا گیا، مغل خاں اس کے تغیر سے خوش بیگی کی خدمت پر مامور ہوا۔

محمد طاہر کی سزائے موت

محمد طاہر قدیمی والاشاہی جو حسب الحکم حسن علی خاں کی دیوان داری پر متعین تھا اپنی بدزبانی و بدافعالی کی وجہ سے واجب القتل ہو چکا تھا، بائیس رجب کو ملاّ عوض وجیہ کے معروضہ کے مطابق شرعاً اس کا قتل واجب سمجھا گیا اور مجرم تہ تیغ کر دیا گیا۔

مہر النساء بیگم کا نکاح

سلطان ایزد بخش ولد سلطان مراد بخش شاہی حکم کے مطابق قلعہ گوالیار سے آستانہ ءوالا پر حاضر کیا گیا تھا، قبلہ ءعالم نے شفقت بزرگانہ سے ملکہ ءعفت جناب مہر النساء بیگم اپنی دختر نیک اختر کو شہزادۂ مذکور کے حبالہ ءعقد میں دیا، قاضی عبدالوہاب و شیخ نظام و بختاور خاں و دریا خاں کے

حضور میں خطبہء نکاح پڑھا گیا۔

ملتفت خاں جو شہزادہ محمد سلطان و سپہر شکوہ کو قلعہ گوالیار سے لینے گیا تھا خدمت شاہی میں حاضر ہوا اور جہاں پناہ نے حکم دیا کہ دونوں شہزادے قلعہء سلیم گڑھ میں سکونت پذیر ہوں۔

انتیس تاریخ کو جہاں پناہ شہزادہ محمد معظم کے مکان پر تشریف فرما ہوئے دروازہ سلیم گڑھ کے پُل سے بادشاہ زادے کی حویلی تک زربفت و دیگر بیش قیمت کپڑوں کا فرش بچھا ہوا تھا جہاں پناہ نے شہزادہ کے پیش کش قبول فرمائے اور حرم سرا کو واپس ہوئے۔

شہزادہ محمد اکبر کے بست ہزاری و دو ہزار سوار کے منصب میں دو ہزاری کا اور اضافہ فرمایا گیا۔

جواہر خاں کی وفات

چوبیس شعبان کو جہاں پناہ کا قدیمی نمک خوار جواہر خاں تحویل دار جواہر خانہ فوت ہوا یہ شخص غربا کا بے حد خیر خواہ تھا خدا غریق رحمت کرے۔

محمد امین خاں کا نیا عہدہ

تیس محرم کو فدائی خاں لاہور سے پشاور روانہ ہوا، چوبیس صفر کو محمد امین خاں احمد آباد گجرات کا صوبہ دار مقرر ہوا اس کا منصب شش ہزاری پنج ہزار سوار تھا، اب پنج ہزاری و پنج ہزار سوار کے منصب پر بحال رہا، جہاں پناہ نے حکم دیا کہ بلا آستانہ شاہی پر حاضر ہوئے اپنی خدمت پر روانہ ہو جائے۔

مہابت خاں جو حضور میں حاضر ہو کر دکن کی مہم پر روانہ ہوا تھا، افغانوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی بنا پر حضوری سے ممنوع قرار دیا گیا، اسلام خاں نے اپنے قبائل و فرزند سوم مسمی مختار بیگ کے طلب کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا تھا، اور اسی پس و پیش کی وجہ سے دولت حضوری سے محروم ہو کر اُجین میں قیام پذیر تھا، عمدۃ الملک بہادر خاں کی سفارش سے منصب پر بحال فرما کر خان مذکور کی فوج میں شامل کیا گیا، اسلام خاں نے اس نوازش کے بعد اپنے قبائل کو بصرہ سے طلب کر لیا۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا سولہواں سال

1083ھ/1673ء

اس مبارک زمانے میں رمضان کا مہینہ آیا اور حکم الٰہی کے مطابق عام مسلمانوں نے اس مقدس ماہ کے برکات حاصل کرنے پر کمر ہمت باندھی۔ بادشاہ دیں پناہ نے تمام ماہ صوم وصلوٰۃ و اعتکاف میں بسر فرمایا، یہ مقدس مہینہ تمام ہوا، اور ہلالِ عید اُفق آسمان پر نمودار ہوا، صدائے مبارک باد کا شور وغل بلند ہوا، قبلہء عالم ہاتھی پر سوار ہو کر نمازِ عید ادا فرمانے کے لئے عید گاہ تشریف لے گئے فراغت نماز کے بعد حرم سرا واپس ہوئے۔

عید کے دوسرے روز بادشاہ دیں پناہ نے تختِ کامرانی پر جلوس فرمایا جہاں پناہ نے شہزادہ محمد معظم کو خلعت بانیمہ آستیں و مالائے مروارید و ایک لاکھ روپیہ و فیل باساز طلاء قیمتی پانچ ہزار روپیہ عطا فرمایا۔

مناصب میں اضافہ

شہزادہ محمد اعظم بھی خلعت بانیمہ آستیں کے عطیے سے سرفراز فرمائے گئے، شہزادہ محمد اکبر کو طرۂ مرصع مرحمت ہوا۔

بخشی الملک اسد خاں و نیز دیگر خورد و بزرگ طرح طرح کی نوازشوں و انعامات سے سرفراز فرمائے گئے اور تمام حاضرین کو حسب مراتب جواہرات و اسپ و فیل و خلعت مرحمت ہوئے، شاہی اراکین کے روزینوں اور مناصب میں مندرجہ ذیل اضافے فرمائے گئے۔

شہزادہ محمد معظم، اصل بست ہزاری و پانزدہ ہزار سوار، اضافہ دہ ہزاری پنج ہزار سوار۔

سلطان معز الدین روزینہ اصل ایک سو پچاس روپیہ، اضافہ پچاس روپیہ۔

سلطان محمد عظیم روزانہ ایک سو روپیہ، اضافہ پچاس روپیہ، بادشاہزادوں وامرائے کبار کے پیش کش ملاحظہء عالی میں گزرانے گئے، تمام تحائف کی قیمت پچاس لاکھ روپیہ اندازہ کی گئی۔

نذرانے

دنیا دار بیجاپور سکندر عادل خاں کے حاجب نے آلات جواہر و مرصع شاہی ملاحظہ میں پیش کئے، عبداللہ قطب الملک دنیا دار حیدر آباد کے حاجب نے اسباب و جواہر وظروف چینی نذر گذرانے، حکم شاہی صادر ہوا کہ ان کے تحائف کے معاوضہ میں تین لاکھ روپیہ نقد مرحمت ہو۔

دکن کا نیا صوبہ دار

شہزادہ محمد معظم کے وکلاء کے تغیر سے بہادر خاں خان جہاں بہادر کے خطاب سے دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا، جہاں پناہ نے خان جہاں کے منصب میں ہزار سواروں کا اضافہ فرما کر خلعت خاصہ وجمدھر مرصع گرز برداروں کی معرفت اس کے لئے روانہ فرمایا۔

میوات کا فوج دار

میر ابراہیم داماد صفیہ بیگم کو میوات کا فوج دار مقرر فرمایا گیا، میر ابراہیم کو کار طلب خاں کا خطاب عطا ہوا، اور اس کے جاہ وحشمت میں ترقی ہوئی، میر ابراہیم کے بھائی مرشد قلی خاں کو داروغہء داغ وتصحیح مقرر فرمایا گیا۔

دیانت خاں کی وفات

دیانت خاں جو فنِ نجوم میں بے نظیر استاد تھا فوت ہوا و یوافگن ورستم افگن وشیر افگن اس کے فرزندوں کو خلعت ماتمی عطا ہوئے۔

شوال کی چھ تاریخ کو بادشاہ شفقت پناہ کے حکم کے مطابق داراب خاں نے شہزادہ محمد سلطان وشہزادہ سپہر شکوہ کو دیوان خواب گاہ میں بادشاہ کے حضور میں پیش کیا دونوں شہزادے شرف قدم بوسی سے بہرہ یاب ہوئے اور جہاں پناہ نے فرزند و برادر زادہ دونوں کو خلعت وسر پیچ زمرد عطا فرمایا۔

محمد سلطان اور دوست دار بانو بیگم کا نکاح

بادشاہ زادہ محمد سلطان نے دوست دار بانو بیگم دختر شہزادہ مراد بخش سے نکاح کیا، اور قبلہء عالم نے شہزادۂ مذکور کو خلعت و شمشیر مرصع وعصائے مرصع واسپ مرصع بازین مرحمت فرمایا، جہاں پناہ نے محل خواب گاہ میں اپنے دست مبارک سے شہزادہ کے سر پر مروارید کا سہرا باندھا اور فرزند کا ہاتھ پکڑے ہوئے مسجد میں تشریف لائے، قاضی القضاۃ قاضی عبدالوہاب نے محمد یعقوب کی وکالت وملا عوض وجیہ ومیر سید محمد قنوجی کی شہادت میں خطبہء نکاح پڑھا اور دو لاکھ روپیہ دینِ مہر قرار پایا، شجاعت خاں شیخ نظام ودریا خاں و بختاور خاں وخدمت گار خاں مجلس عقد میں حاضر تھے۔

زبدۃ النساء بیگم اور سپہر شکوہ کا نکاح

اکیس شوال کو قبلہء عالم نے اپنی دختر ثریا نقاب نواب زبدۃ النساء بیگم کو شہزادہ سپہر شکوہ کے حبالہء عقد میں دیا، جہاں پناہ وقاضی عبدالوہاب وملا محمد یعقوب ودربار خاں و بختاور خاں مجلس عقد میں شریک تھے، شہزادہ سپہر شکوہ کو خنجر مرصع وسر پیچ و مالائے مروارید وسہرۂ مروارید مرحمت فرمائے گئے، ملکہ تقدس نقاب گوہر آراء بیگم وحمیدہ بانو بیگم نے رسوم کتخدائی کو انجام دیا۔

افتخار خاں کشمیر کی خدمت سے علیحدہ ہو کر پشاور روانہ ہوا، بادشاہ زادہ محمد سلطان کو بارہ ہزار، شہزادہ، سپہر شکوہ کو چھ ہزار وشہزادہ ایزد بخش کو چہار ہزار سالانہ کے وظائف مرحمت ہوئے۔

چوتھی ذی قعدہ کو سیف اللہ مشرف قوش خانہ نے عرض کیا کہ ایک میر شکار نے خواب دیکھا کہ ایک شخص شمشیر برہنہ ہاتھ میں لئے ہوئے اس کے مقابلہ کو تیار ہے میر شکار خواب سے بیدار ہوا اور اپنے کو زخمی واپنی شمشیر کو برہنہ پایا۔

سولہ تاریخ کو شہزادہ محمد معظم حکم شاہی کے مطابق حضرت خواجہ قطب الدین بختیار رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پُرانوار کی زیارت کے لئے گئے اور ایک ہزار کی رقم درگاہ میں نذر پیش کی، اسی تاریخ بادشاہ زادہ محمد سلطان بھی درگاہ مذکور پر حاضر ہوئے اور پانچ سو روپیہ نذر پیش کی۔

یکم ذی الحجہ کو اسد خاں نے نیابت دیوانی سے استعفٰی داخل کیا جہاں پناہ نے حکم دیا کہ امانت

خاں دیوان خالصہ و کفایت خاں دیوان تن بھی اپنی مہریں دیوان اعلیٰ کی مہر کے نیچے ثبت کر کے مہمات دیوانی کو انجام دیں۔

ایک خون ناحق

فرجام برلاس نے اپنی دختر کی نسبت اپنے ہمشیر زادہ سے کی تھی لیکن بہن کی بدمزاجی و زبان درازی کی وجہ سے جن صفات میں کہ یہ عورت ضرب المثل تھی اس نسبت کو ترک کر دیا اس زمانہ میں فرجام اٹک کی فوج داری سے معزول ہو کر حضور میں حاضر ہوا فرجام کی بہن نے اپنے فرزند کو اس امر کی ترغیب دی کہ فرجام کو دربار خاص و عام میں بادشاہ کے حضور میں قتل کرے، ورنہ یہ اس کو دودھ نہ بخشے گی۔

عورت نے اپنا برقعہ اس کے چہرہ پر ڈال کر کہا کہ یا تو میرے حکم کی تعمیل کرو ورنہ اس کو پہن کر گھر میں عورتوں کی طرح بیٹھ، لڑکے نے ناچار ماں کے حکم کی تعمیل پر کمر ہمت باندھی، اور جلوس شاہی میں جب کہ خاص و عام اپنی آراستگی میں مصروف تھے۔ یہ شخص کسی نہ کسی طرح فرجام کے قریب گیا اور ایک زخم کاری سے اس بوڑھے وبا توقیر شخص کو خاک وخون میں ملا دیا۔

مجرم نے ارادہ کیا کہ فرار ہو جائے لیکن ظاہر ہے کہ خونِ ناحق اپنا رنگ دکھاتا ہے اور موت قاتل کو بھی مقتول کے پاس سُلاتی ہے یہ شخص گرفتار کر کے قید خانہ بھیج دیا گیا، چوتھی ذی الحجہ کو محکمہ قضا میں مقدمہ پیش ہوا مقتول کے وارث یعنی اس کی زوجہ اور اس کی دختر زوجہ علی قلی برلاس عدالت میں حاضر تھے، جہاں پناہ نے ورثاء مقتول سے درخواست کی کہ خون قاتل سے درگذریں، لیکن ان کو عفو تقصیر کی توفیق نہ ہوئی، اور نوجواں قاتل بھی حوض جلوخانہ پر خاص و عام کے روبرو تہ تیغ کیا گیا، مقتول کی لاش اس کی ماں کو جو قلعہ کے دروازہ پر رتھ پر سوار کھڑی تھی حوالہ کی گئی۔

عید الضحیٰ

دسویں ذی الحجہ کو قبلہء عالم نے نماز عید الضحیٰ ادا فرمائی، چاروں شہزادے بادشاہ کے حضور میں حاضر تھے قبلہء عالم نے اپنے دست مبارک سے گوسفند ذبح فرمائی اور شہزادہ محمد سلطان نے حسب الحکم اونٹ کی قربانی کی۔

جہاں پناہ پر ایک دیوانہ کا حملہ

واپسی میں ایک دیوانہ صورت شخص، سواری مبارک کے قریب آیا اور ایک لکڑی ماری، لکڑی تخت سے اُچھل کر زانوئے مبارک پر لگی۔ گرز برداراس کو گرفتار کر کے حضور میں لائے بادشاہ کرم گستر نے اس کی رہائی کا حکم صادر فرمایا۔

چودہ ذی الحجہ کو بادشاہ زادہ محمد کام بخش کے ختنے کی رسم ادا ہوئی۔

مان سنگھ و مہا سنگھ و انوپ سنگھ پسران راجہ جے سنگھ اپنے باپ کی وفات کے بعد آستانہء شاہی پر حاضر ہوئے، ہر سہ اشخاص کو خلعت مرحمت ہوا، میرزا خان منوچہر فوج دار ارابرج نے وفات پائی۔

نئے عہدے

فرمان والا شان صادر ہوا کہ خان جہاں بہادر کو ماہی مراتب مرحمت فرمایا گیا وہ خود اس کا انتظام کرلے۔

روح اللہ خاں ولد فیض اللہ خاں دھامونی کا فوج دار مقرر فرمایا گیا، باقی خاں بخشی صوبہء دکن نے وفات پائی اور مرشد قلی خاں اس کی جگہ مقرر ہوا۔

سولہ محرم کو جہاں پناہ کو معلوم ہوا کہ مہابت خاں حوالی پشاور یعنی باغ ظفر سے کوچ کر کے کابل روانہ ہوا، سربلند خاں کو حکم ہوا کہ دفتر سررشتہ والا شاہی کی بھی نگرانی کرے۔

سورج گرہن

گیارہ ربیع الاوّل کو معروضہ پیش ہوا کہ دوپہر سے دو ساعت پیشتر آفتاب کے گرد قوس و قزح کا ہالہ نمودار ہوا اور سات گھڑی قائم رہا۔

تیرہ ربیع الآخر کو بادشاہ زادہ محمد معظم کی زوجہ یعنی دختر عبدالمومن نے وفات پائی، جہاں پناہ مسجد جامع سے شہزادہ کے مکان میں تشریف فرما ہوئے اور فاتحہ مغفرت پڑھ کر کشتی پر دولت خانہ کو واپس آئے۔

اٹھائیس تاریخ کو واقعات دکن کے معروضہ سے معلوم ہوا کہ کیرت سنگھ ولد جے سنگھ فوت ہوا۔

ستره جمادی الاوّل کو بادشاہ زادہ محمد اکبر کے محل میں فرزند پیدا ہوا اور مولود عبدالوہاب کے نام سے موسوم کیا گیا، بائیس جمادی الآ شاہ زادہ محمد معظم کی محل سرا میں لڑکا پیدا ہوا اور جہاں پناہ نے نو وارد بچہ کو بختہ اختر کے نام سے موسو یا۔

زمیندار کمایوں اپنے ملک میں شاہی لشکر کی آمد اور ان کی تاخت و تاراج کی وجہ سے بے حد خوف زدہ ہو گیا تھا، سید مرتضٰی کی سفارش سے جہاں پناہ نے عفو تقصیر فرما کر زمیندار مذکور کو مطمئن فرمایا۔

سید مرتضٰی خاں نے حامد خاں کو ہدایت کی کہ زمیندار کمایوں کے فرزند کو بارگاہ شاہی میں حاضر کرے حامد خاں نے دوسری رجب کو امیدوار مکرمت شاہی کو بارگاہ والا میں حاضر کیا، فرزند زمیندار نے ایک ہزار اشرفیاں اور تین ہزار روپے رقم پیش کی اور عطائے خلعت سے سرفراز فرمایا گیا۔

دیار ایران کے وقائع سے معلوم ہوا کہ شہر نیشا پور و ہرات و شیراز زمین میں دھنس گئے۔

سیواجی کی شکست

خان جہاں نے چھ کوس کا دھاوا کر کے سیواجی کو فاش شکست دی، اور حریف کو مغلوب و پسپا کر کے بے شمار مال غنیمت حاصل کیا، خان مذکور نے تمام مال غنیمت دلیپ کنور کے ہمراہ بارگاہ عالی میں ارسال کیا، اکتیس رجب کو مال مرسولہ شاہی ملاحظے میں پیش ہوا اور خان جہاں کے منصب میں ایک ہزار سواروں کا اضافہ فرمایا گیا۔

حامد خاں بگلہ جس کے تین پاؤں تھے کوہستان کمایوں سے حضور شاہی میں حاضر کیا گیا۔

فیض اللہ خاں مراد آباد سے حاضر ہو کر شرف ملازمت سے سرفراز ہوا۔

کابل کی مہم

مہابت خاں نے افغانوں کو قرار واقعی تنبیہ کرنے سے چشم پوشی کی اور اس باغی گروہ کو جیسا کہ چاہئے تھا پامال نہ کیا بلکہ حریف سے ''ما بخیر و شما بہ سلامت'' کہہ کر کابل روانہ ہو گیا قبلۂ عالم کو خان مذکور کی یہ ادا پسند نہ آئی، اور جہاں پناہ کے حکم سے ستره شعبان کو شجاعت خاں ان بدبختوں کی

سرزنش وتنبیہ کے لئے کثیر فوج وساز وسامان کے ساتھ رخصت ہوا، قبلہء عالم نے خان مذکور کو خلعت خاص وجیغہء مرصع واسپ عربی باساز طلا مرحمت فرما کر اس کے منصب میں پانصدی پانصد کا اضافہ فرمایا۔

سرفراز خاں توپ خانہ کی نیابت پر متعین ہوا اور خدمت گار خاں قلعہ داری اور دربار خاں غسل خانہ کی نیابت پر مامور فرمائے گئے۔

شجاعت خاں کے تمام ہمراہی اعلیٰ قدر مراتب، خلعت وشمشیر واسپ واضافہء منصب کے عطیات سے سرفراز کئے گئے۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا سترہواں سال

1084ھ/1674ء

رمضان کا مقدس مہینہ شروع ہوا اور آستانہء شاہی سے غلغلہء شادمانی بلند ہوا، ماہ صیام کی آمد نے اہل عالم کو ہر طرح کے دینی و دنیاوی برکات کا امیدوار بنایا۔

بادشاہ حقیقت شناس و حق پسند نے تمام ماہ رمضان شبانہ روز عبادت و طاعت میں بسر کیا، کارپردازان سلطنت نے جشن جلوس کے انعقاد کا انتظام شروع کیا، صیام کا زمانہ ختم ہوا، اور بادشاہ دین پناہ نے نماز عید الفطر ادا فرمائی نماز کے بعد جود و سخا کا بازار گرم ہوا، اہل حاجت کی آرزوئیں بر آئیں، اور خورد و بزرگ جواہرات و اضافہء مناصب و خلعت و اسپ و فیل وغیرہ مختلف عطیات سے سرفراز فرمائے گئے شہزادگان والا قدر و امیران نامدار کے تحائف حضور میں پیش ہوئے اور ان کو شرف قبولیت عطا ہوا۔

میر قوام الدین کی ہندوستان میں آمد

میر قوام الدین صدر قلمرو ایران برادر خلیفہ سلطان وزیر مملکت ایران کے طالع بلند نے یاوری کی اور اسے ہندوستان جنت نشان لے آیا، چھ شوال کو صدر موصوف نے شرف ملازمت حاصل کیا اور قبلہء عالم کی مرحمتِ خسروانہ سے سرفراز ہوا، جہاں پناہ نے میر اقوام الدین کو خلعت خاص و جمدھر مرصع با پھول کٹارہ و علاقہء مروارید و شمشیر با ساز طلا و سپر باگلِ مرصع با پھول کٹارہ و علاقہء مروارید و شمشیر با ساز طلا و سپر باگلِ مرصع و عصا و دس ہزار روپے نقد مرحمت فرمائے۔

میر قوام الدین رفتہ رفتہ خطاب خانی و منصب سہ ہزاری و ہزار پانصد سوار سے سرفراز کیا گیا، قوام الدین کے فرزند مسمی صدر الدین کو خلعت و شمشیر با ساز مرصع و منصب ہفت صدی و ایک صد

سوار مرحمت ہوا۔

میر ابراہیم ولد شیخ میر زیارت حرمین شریفین سے بہرہ اندوز ہو کر آستانہء والا پر حاضر ہوا اور منصب ہزار و پانصدی سوار کی مرحمت خسروانہ سے سرفراز ہوا۔

حکیم صالح خاں نے وفات پائی، اور حکیم محسن و دیگر فرزندان مرحوم و نیز دوسرے اعزا کو خلعت ماتمی عطا ہوئے، حکیم مرحوم کے بجائے محمد علی خاں پسر نصرت خاں داروغہء کو کیراق خانہ مقرر ہوا۔

میر عبدالرحمٰن ولد اسلام خاں مرحوم حاجب حیدر آباد مقرر فرمایا گیا، دسویں ذی الحجہ کو قبلہء عالم نماز و رسم قربانی ادا فرمانے کے لئے عید گاہ تشریف لے گئے۔

کوتل خیبر سے عبور کی کیفیت

قبلہء عالم کو معلوم ہوا کہ سترہ ذیقعدہ کو شجاعت خاں کنداب سے گزر کر کوتل کھر پہ سے عبور کرنے کا خواہاں تھا، اس امیر نے لشکر آراستہ کر کے قدم آگے بڑھائے۔

افغانوں کا گروہ جو کمین گاہ میں مقیم تھا ایک تنگ پہاڑی راہ پر شجاعت خاں کے مقابلے کے لئے آیا، بہادر سپاہیوں نے ہر چند کوشش کی کہ دشمن کو پامال و زیر کریں، لیکن چونکہ اکثر بندگان درگاہ کی قضا آ چکی تھی، شجاعت خاں اور اس کے ہمراہیوں کی تدبیر کارگر نہ ہوئی اور یہ امیر مع سپاہیوں کی ایک معقول تعداد کے میدان جاں نثاری میں کام آیا۔

بندہ پرور کو ایسے با اخلاص و نمک حلال ملازم کی موت و فوجِ شاہی کی شکست کے بے حد صدمہ ہوا، اور جہاں پناہ نے خود سفر کرنے کا مصمم ارادہ فرمایا۔

گیارہ محرم کو قبلہء عالم نے حسن ابدال کی طرف کوچ کیا شجاعت خاں کی وفات کے باعث صف شکن خان داروغہء توپ خانہ اور شجاعت خاں کے بھائی ہمت خاں داروغہء غسل خانہ مقرر فرمائے گئے، سیف خاں ناظم اکبر آباد دہلی کی نظامت پر مامور ہوا اور اکبر آباد کی نظامت شہر کی قلعہ داری میں ضم فرما دی گئی۔

فیض اللہ خاں کو خلعت مرحمت فرما کر مراد آباد روانہ ہونے کی اجازت عطا ہوئی، اہتمام خاں داروغہء عمارت و تخت گاہ کے دیگر عمال و کار پردازان کو متعلقہ خدمت پر روانہ ہونے کی

اجازت مرحمت ہوئی۔

قوام الدین اور اس کے فرزند کو حکم ہوا کہ دو ماہ کے بعد بادشاہ کی ملاقات میں حاضر ہو جائیں۔

شیخ عبدالعزیز فوج دار سرہند کو دلاور خاں کا خطاب مرحمت ہوا، جہاں پناہ نے حکم دیا کہ سربلند خاں دو ہزار پانچ سو سواروں اور توپ خانہ کی جمعیت کے ساتھ دامن کوہ سے راستہ طے کرے۔

نامدار خاں منصب سے برطرف کیا گیا اور چالیس ہزار روپیہ سالانہ اس کو وظیفہ عطا ہوا، محمد صالح خطاب خانی سے سرفراز فرما کر اپنے باپ کے پاس روانہ کیا گیا۔

رحمت خاں کو لاہور جانے کا حکم ہوا تا کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عرس مبارک کا انتظام کرے۔

میر خاں کی برطرفی

میر خاں ولد خلیل خاں نے ایرج کی فوج داری قبول کرنے میں پس و پیش کیا جو منصب سے برطرف کیا گیا، نویں ربیع الاول کو اسمٰعیل زمیندار کو نواح ملتان کو واپس جانے کی اجازت مرحمت ہوئی، اسمٰعیل مذکور خطاب خانی و عطیہء اسپ سے سرفراز فرمایا گیا، افتخار خاں و عقیدت خاں فدائی خاں کی امداد کے لئے جموں سے روانہ ہوئے، راجہ عنایت اللہ کو خلعت رخصت مرحمت ہوا۔

اٹھارہ ربیع الاوّل کو سربلند خاں بدیع سلطان و ناصر خاں وغیرہ کے ہمراہ پشاور روانہ فرمایا گیا۔

بیس ربیع الاوّل کو مہاراجہ جسونت سنگھ اپنے تھانہ سے شاہی حضور میں حاضر ہو کر شرف قدم بوسی سے بہرہ مند ہوا، قبلہء عالم نے جسونت سنگھ کو خلعت خاص دار بھی قیمتی سات ہزار روپے مرحمت فرمائی۔

جسونت کو اس کے محلات پر روانہ ہونے کی اجازت مرحمت ہوئی، اور رخصت کے وقت شمشیر باساز مرصع و فیل کے عطیہ سے سرفراز فرمایا گیا۔

دوسری ربیع الثانی کو قبلہ عالم حسن ابدال پہنچ گئے۔

ایک ضعیفہ پر عنایات خسروانہ

مقام حسن ابدال میں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جو قبلہء عالم کی معدلت گستری و غربا

نوازی کی ایک بین دلیل ہے۔

جہاں پناہ کو باغ حسن ابدال میں قیام فرمائے ہوئے دو تین روز گزرے تھے کہ خاکسار مئولف کے ملازمین نے مجھ سے آ کر بیان کیا کہ دولت خانہ ءشاہی کے زیر دیوار ایک ضعیفہ رہتی ہے، اس پیرزال کے پاس ایک پانی کی چکی ہے جو اس کا ذریعہ معاش ہے، چکی اس پانی سے چلتی ہے جو باغ سے نکل کر نالے میں گرتا ہے، چونکہ یہ مقام عملہ نظارت کی نگرانی میں ہے اس لئے اس سررشتہ کے ملازمین نے پانی کی گذرگاہ بند کردی ہے، جس کی وجہ سے چکی کا چلنا بند ہو گیا ہے، ہم سپاہی آٹے کے نہ ملنے سے پریشان ہیں اور غریب ضعیفہ کی روزی کا دروازہ بند ہے، راقم الحروف نے یہ قصہ بے کم وکاست خان والا شان بختاور خان سے بیان کیا، خان مذکور نے حاضری کے وقت سارا ماجرا قبلہ ءعالم سے عرض کیا، بادشاہ غربا نواز سے اُسی وقت خان مذکور سے فرمایا کہ تم خود جا کر پانی کی گزرگاہ کھول دو، اور تاکید کردو کہ کوئی فرد بھی پیرزال کی روزی میں سدراہ نہ ہو، شاہی حکم کی فوراً تعمیل کی گئی، اور خان مذکور اپنے مکان واپس آئے، اسی دوران میں قبلہ ءعالم خاصہ تناول فرمانے کے لئے دسترخوان پر بیٹھے اور دو قاب طعام اور پانچ اشرفیاں شیخ ابوالخیر ولد شیخ نظام کو جو شرف حضوری سے باریاب تھا عطا کر کے فرمایا کہ یہ اشیاء لے کر بختاور خاں کے پاس جاؤ وہ اس ضعیفہ کا مکان جانتا ہے اس سے دریافت کر کے تم ہمارا یہ ہدیہ پیرزال تک پہنچاؤ، ضعیفہ سے ہمارا سلام کہو اور یہ پیغام دو کہ تم ہماری ہمسایہ ہو، ہمارے یہاں کے درود وقیام سے جو تکلیف تم کو پہنچی ہے اس کو معاف کرو، شیخ نظام، خان مذکور کی خدمت میں آئے اور ضعیفہ کا مکان دریافت کیا معلوم ہوا کہ پیرزال مذکور ایک دوسرے ٹیلے پر جہاں ایک چھوٹا گاؤں آباد ہے سکونت پذیر ہے، آدھی رات کو شیخ نظام و بختاور خاں ضعیفہ کے مکان پر پہنچے اور اس کو خواب سے بیدار کر کے بادشاہ کا تحفہ و پیغام اس کو پہنچایا۔

۔ دوسرے روز قبلہ ءعالم نے دربار خاں ناظر کو حکم دیا کہ پالکی روانہ کر کے پیرزال کو لے آؤ، اور اس کو محل میں پہنچادو اس غریب بوڑھی نے اپنی تمام عمر نقرئی پالکی کا نام بھی نہ سُنا تھا، بہرحال ضعیفہ حضور والا میں حاضر ہوئی، اور بادشاہ غریب پرور نے اس کا حال دریافت فرمایا، اس نے عرض کیا اس عورت کی دو ناکتخدا لڑکیاں ہیں اور دو لڑکے ہیں جو فاقہ کش و سر و پا برہنہ ہیں اور آوارہ گردی میں میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

قبلہء عالم نے ضعیفہ کو دو سو روپیہ مرحمت فرمائے یہ عورت دو شب محل میں مقیم رہی، اہل حرم کے لئے یہ عجوبہء روزگار ہوگئی اور تمام ساکنانِ حرم نے اس کو نقد وزیور ولباس عنایت کیا۔

اس بوڑھی نے کسی شخص سے یہ سُن لیا کہ راقم الحروف نے اس کا قصہ بختاور خاں سے بیان کیا تھا میرے خیمے کے سامنے شکر گزاری کے لئے آئی، کیا دیکھتا ہوں کہ دلق پوش ضعیفہ دوشالہ اوڑھے کناری دامن کی پشواز پہنے کھڑی ہے اس کے پاؤں میں کمخواب کی جوتیاں ہیں اور سارا جسم زیور سے لدا اور دامن اشرفیوں سے بھرا ہوا ہے، میں نے دریافت کیا کہ تو کون ہے، اس پیرزال نے جواب دیا کہ میں وہی ضعیفہ ہوں جو تمہاری اور تمہارے خان کے بدولت اس مرتبہ کو پہنچی ہوں۔

خاکسار مئولف اس بوڑھی عورت کو بختاور خاں کے پاس لے گیا، خان مذکور نے بھی اس کے ساتھ رعایت فرمائی۔

دو یا تین روز کے بعد قبلہء عالم نے ناظر کو دوبارہ حکم دیا کہ ضعیفہ اور اس کی لڑکیوں کو محل میں لے آئے، خواجہ سرا پالکیاں لے کر گئے اور ضعیفہ مع اپنی بیٹیوں کے محل سرا میں آئی، قبلہء عالم نے اس مرتبہ دو ہزار روپیہ کنیا دان مرحمت فرمائے، اہل محل نے اس مرتبہ پہلے سے دو چند نقد وزیور و لباس وطرح طرح کی پوشاکیں ضعیفہ اور اس کی دونوں لڑکیوں کو نہایت خوشی سے عطا کیں، جہاں پناہ نے دوسری چکی پانی کی پیرزال کو بطور انعام مرحمت فرمائی اور ناظر کو حکم دیا کہ معافی محصول و دیگر مزاحمت کی ممانعت کے اسناد دفتر معلیٰ سے لکھ کر پیرزال کے پاس روانہ کرے۔

قبلہء عالم کے حکم کے مطابق حکیم سبحان پیرزال کے مکان پر اس کی آنکھوں کا علاج کرنے کے لئے برابر جانے لگا، پیرزال کو شہزادہ محمد سلطان و محمد معظم و محمد اعظم و محمد اکبر و نیز اسد خان و بلنگ توش خاں کے مکانوں پر لے گئے اور اس ضعیفہ کو اتنی رقم ملی کہ بڑی دولت مند ہوگئی، اس عورت نے اپنی لڑکیوں کا نکاح کیا، اور اس کے لڑکے جو برہنہ و بے سروپا پھرتے تھے زربفت ومخمل پہننے لگے، اس کا شوہر بھی صاحب دولت ہوکر پھر جوان ہوگیا اور سارے موضع کا چودھری اور مکھیا قرار پایا۔

شباب کے عود کرنے کی آرزو اس میں شبہ نہیں کہ تمنائے محال ہے لیکن اس واقعہ نے ثابت کر دیا کہ عجوزہ بوریہ نشیں کا ظل اللہ کے فیض رحمت سے جوان ہونا ممکن ہے بلا مبالغہ عرض کرتا ہوں کہ اس کے چہرے کی جھریاں مٹ گئیں اور بے رونق چہرے پر پھر جوانی کی آب وتاب آ گئی، بے نور آنکھوں میں بصارت عود کر آئی، اور جسم کے تمام اعضا میں قوت وچستی پیدا ہوگئی۔

اعز خاں، نصرت خاں میر سلطان و دیگر امراء کی جمعیت کے ہمراہ ساز و سامان کے ساتھ جمرود کے افغانی گروہ کی تنبیہ کے لئے روانہ کیا گیا، رائے لعل چند خالصہ کابل کے مقدمات کی تحقیق کے لئے مامور ہوا۔

شہزادہ محمد اکبر کی کوہاٹ کو روانگی

قبلہء عالم کی رائے یہ قرار پائی کہ بادشاہ زادہ محمد اکبر و اسد خاں کوہاٹ کی راہ سے کابل روانہ ہوں، چنانچہ چوبیس جمادی الآخر کو شہزادۂ مذکور کو خلعت خاصہ و پرکنگ کی کلغی و شمشیر و سپر مرصع اور پچاس عدد عربی، عراقی، ترکی و کوہی گھوڑے و فیل باساز نقرہ مرحمت ہوئے، اسد خاں بھی خلعت خاصہ و شمشیر و اسپ و فیل کے عطیہ سے سرفراز فرمایا گیا۔

شہامت خاں و غیرت خاں وغیرہ امرائے دربار شہزادہ کے ہمراہ ہوئے، اور ہر امیر اپنے مرتبہ کے موافق خلعت و شمشیر و اسپ کے عطیات سے سرفراز کیا گیا۔

فدائی خاں صوبہ دار کابل

ساتویں رجب کو فدائی خاں، مہابت خاں کا بھائی صوبہ دار کابل مقرر فرمایا گیا اور خلعت عطا کر کے بہترین فوج اور ساز و سامان کے ساتھ روانہ فرمایا گیا، بختاور خاں کے ذریعہ سے یہ ہدایت فرمائی گئی کہ جب فوج کا ورود کوتل میں ہو تو سب سے پہلے فوج ہراول عبور کر کے اس جانب مقام کرے، دوسرے روز بہیر وغول کے سپاہی راستہ طے کریں اور چنداول کا دستہ کوتل کے اسی جانب مقیم رہے، اگر یرانغار کے سپاہیوں کے لئے راہ نہ ہو تو یہ حصہ ہراول کے ساتھ رہے اور فوج یرانغار چنداول کے ساتھ عبور کرے۔

ستائیس تاریخ مہابت خاں شرف قدم بوسی سے فیض یاب ہوا، اور بیر سنگھ نیرہ تھیل واس کور کی تنبیہ کے لئے روانہ فرمایا گیا۔

شیخ عبدالعزیز کی پریشان حالی

شیخ عبدالعزیز داروغہء عرضِ مکرر اس زمانہ میں منصب ہفت صدی دوصد سوار کے مرتبہ تک فائز ہو چکا تھا لیکن اسراف کی وجہ سے معاش سے بے حد تنگ و پریشان رہتا تھا، باوجودیکہ قبلہء عالم

نے چند دیگر جاگیریں اور نقدی انعامات سے بھی وقتاً فوقتاً سرفراز فرمایا، لیکن اس کے افکار دُور نہ ہوئے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عبدالعزیز مذکور سے احکام کی تعمیل پوری نہ ہوسکتی تھی، اور حاضری دربار کا بھی پابند نہ رہ سکا، چونکہ خدا کی مرضی یہ تھی کہ اس کی موجودہ حالت بھی قائم نہ رہے، اس نے جہاں پناہ سے درخواست کی کہ چند روز لاہور میں قیام کرنے کی اجازت عطا فرمائی جائے، قبلہء عالم نے قرآن شریف کی ایک آیت تلاوت فرمائی جس کا مفہوم یہ تھا کہ عبدالعزیز اس ارادہ سے باز رہے اور اپنے کو مزید پریشانی میں مبتلا نہ کرے، جہاں پناہ نے عبدالعزیز کو خلعتِ رخصت مرحمت فرمایا اور حکم دیا کہ لطف اللہ خاں اس کی نیابت میں حاضرین کو حضور والا میں لائے اور بختاور خاں معروضات دستخط مبارک کے لئے پیش کرے۔

شیخ عبدالعزیز لاہور پہنچ کر بے حد پریشان ہوا جیسا کہ اس کی ایک غزل ہے جو اس نے بختاور خاں کے نام لکھ کر بھیجی تھی واضح ہوا۔

☆☆☆☆☆

جلوس عالمگیری کا اٹھارہواں سال

1085ھ/1675ء

رمضان کا مقدس مہینہ شروع ہوا اور بادشاہ دین پناہ نے طاعتِ پروردگار پر کمر ہمت باندھی، شبانہ روز صوم وصلوٰۃ میں میں بسر فرمایا۔

عطیات

غرۂ شوال کا مسرت خیز روز آیا، کارپردازان سلطنت نے جشن کو بہترین زیب و زینت کے ساتھ منعقد کیا، قبلہء عالم نے تخت کامرانی پر جلوس فرمایا، اور پیش کش وتحائف نظر انور سے گزرنے لگے، اراکین شاہی و امیران دربار طرح طرح کی نوازش ومراحم خسروانہ سے سرفراز فرمائے گئے۔

شہزادہ محمد سلطان کو منصب بست ہزاری دو ہزار سوار کے علاوہ خلعت بانیمہ آستین و مالائے مروارید وگلوآویز لعل قیمتی چودہ ہزار روپیہ وایک لاکھ روپیہ نقد و دو گھوڑے باساز طلا و مینا کار ودو زنجیر فیل باساز نقرہ، نقارہ وطوغ وعلم مرحمت ہوئے۔

شہزادہ محمد معظم کو خلعت و مالائے مروارید وگلوآویز لعل وطرۂ مرصع و پانچ لاکھ روپیہ مرحمت فرمایا گیا۔

شہزادہ محمد اعظم کو خلعت بانیمہ آستین عطا ہوا۔

شہزادہ محمد اکبر کے لئے خلعت بانیمہ آستین روانہ فرمایا گیا۔

سلطان معزالدین کو خلعت بانیمہ آستین وسلطان محمد عظیم کو خلعت مرحمت ہوئے، ان ہر دو شہزادگان گرامی قدر کو منصب ہفت ہزاری ودو ہزار سوار وطوغ وعلم مرحمت فرمائے گئے۔

رانا راج سنگھ مرزبان کو فرمانِ عنایت عنوان کے ہمراہ خلعت خاص و جمدھر مرصع ارسال فرمایا گیا، مہاراجہ جسونت سنگھ بھی ارسال خلعت کے شرف سے بہرہ اندوز ہوا، ہمّت خاں و اشرف خاں خان صدر الصدور رضوی خاں و سید مرتضیٰ خاں و تربیت خاں و صف شکن خاں و نیز دیگر خدام خورد و بزرگ ہر فرد عطیہ خلعت سے سرفراز کیا گیا۔

بخشی الملک سربلند خاں کے منصب میں پانصد سواروں کا اضافہ ہوا، میر خاں برطرفی کے بعد امیر خاں کے خطاب سے چہار ہزار و پانصد سوار کا منصب دار کیا گیا، قوام الدین و نیز کامگار خاں و محمد علی خاں کے مناصب پانصدی میں اضافے فرمائے گئے۔

خطابات

خواجہ شاہ کو شریف خاں کا خطاب عطا ہوا، اور کمال الدین ولد دبیر خاں، باقر خاں کے مناصب میں بھی اضافہ ہوا، اور ہر سہ امیر ہزاری منصب و صد سوار کے منصب دار قرار پائے، قابل خاں برہان الدین برادرزادہ فاضل خاں مرحوم کو اعتماد خاں کا خطاب عطا فرمایا گیا، محمد شریف نشی داروغہ ڈاک دار الانشاء، برادر ابوالفتح قدیمی والا شاہی بلحاظ مناسبت خطاب کے یک صدی کے اضافہ سے سرفراز فرمایا گیا۔

بختاور خاں اصل و اضافہ سے ایک ہزاری دوصد و پنجاہ سوار کے منصب پر فائز ہوا، سید علی حاجب شریفِ مکہ معظّمہ و محمد امین سالار اسپان کو خلعت رخصت و پانچ ہزار روپیہ کی رقم عطا ہوئی۔

خواجہ محمد یعقوب کو جو خود عالی نسب شریف و نیز نذر محمد خان والی بلخ کا داماد تھا اور جس پر بادشاہ شرفا نواز ہمیشہ مراحم خسروانہ فرماتے تھے دس ہزار روپے عنایت فرمائے گئے، قبلہء عالم نے حکم دیا کہ ہر ماہ کے آغاز پر رقم مذکور خواجہ کے مکان پر پہنچا دی جایا کرے۔

دلیر خاں شرف قدم بوسی سے فیض یاب ہوا اور عابد خاں کے تبادلہ کی وجہ سے اس کی جگہ ناظم صوبہء ملتان مقرر فرمایا گیا۔

حسین بیگ خان، علی مردان خاں کا داماد جونپور کا فوج دار مقرر کر کے اپنی خدمت پر روانہ کیا گیا، پرتھی سنگھ زمیندار جموں لودی خاں کے ہمراہ کابل کی مہم پر متعین کیا گیا۔

محمد وفا و عبداللہ خاں مرحوم گذر رینسی و کوہاٹ کی تھانہ داری پر مامور کر کے اپنے مستقر کو

روانہ فرمایا گیا۔

مہابت خاں کی وفات

بہرام وفرہام پسران مہابت خاں کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ ان کے پدر مسمی مہابت خان نے امن آباد میں چوتھی شوال کو وفات پائی عرضی گذار حضور میں طلب کر کے مطمئن فرمائے گئے۔

راگھو داس جھالا رانا کا ملازم آستانہء والا پر حاضر ہو کر ہفت صدی پنج ہزار سوار کے عطیہ منصب سے سرفراز فرمایا گیا۔

محتشم خاں، میر ابراہیم پسر کلاں شیخ میر ملتفت خاں کے تغیر سے لنگر کوٹ کا فوج دار مقرر کیا گیا، محتشم خاں کو خلعت وعلم واسپ با ساز طلا مرحمت ہوا۔

بائیس ذی الحجہ کو عابد خاں ملتان کی خدمت سے علیحدہ ہو کر شرف حضوری سے بہرہ یاب ہوا۔

میر عباس برادر سلطان کربلائی وخویش محمد امین خان نے وطن جانے کی اجازت طلب کی، قبلہء عالم نے میر عباس کو خلعت رخصت ودو ہزار روپیہ مرحمت فرمایا، اورنگ خواجہ چوراغاسی کو بخارا کی واپسی کے وقت خلعت وجیغہء مرصع وفیل مادہ کے علاوہ دس ہزار روپیہ کی رقم بھی عطا کی گئی۔

خواجہ محمد طاہر نقش بندی پدر خواجہ محمد صالح خویش شہزادہ مراد بخش نے خلوت میں وطن واپس جانے کی درخواست کی، جہاں پناہ نے خواجہء مذکور کو پانچ سو اشرفیاں عنایت فرما کر ان کا معروضہ قبول کیا۔

بکرم سنگھ گوالیاری کو خلعت وجمدھر مرصع واسپ با ساز طلا مرحمت فرما کر اس کو ہم جنسوں میں سرفراز فرمایا، اور عہدۂ تھانہ داری مرحمت ہوا جہاں پناہ نے حکم دیا کہ بکرم سنگھ دو ہزار پانچ سو کوہی پیادے اپنے ہمراہ لے آئے۔

صف شکن خان کی وفات

مجاہد خاں کے تغیر سے عنایت خاں خیر آباد کا فوج دار مقرر کیا گیا، نویں ربیع الاوّل کو صف شکن خاں نے وفات پائی، ملتفت خاں اس کے انتقال کی وجہ سے غائبانہ اس کے بجائے داروغہء

توپ خانہ مقرر ہوا اور گرز بردار کی معرفت اس کو خلعت روانہ کیا گیا۔

سیوا جی کا دکن کی سمت فرار ہونا

خاں جہاں بہادر نے اپنے پے در پے حملوں سے سیوا جی کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اور متواتر دھاووں سے اس کو مغلوب و مجروح کر کے ولایت دکن کے دیگر فتنہ پرداز افراد کو بھی پامال و برباد کیا۔

خان جہاں بہادر کے منصب میں اضافہ

خان جہاں نے مرہٹوں کے استیصال کے علاوہ دنیادار دکن و بیجاپور و حیدرآباد سے پیش کش وتحائف وصول کر کے بارہا خدمت سلطانی میں روانہ کیا، بادشاہ خادم نواز و قدر شناس نے اپنے بہترین و باوفا امیر کو خان جہاں بہادر ظفر جنگ کے خطاب سے سرفراز فرما کر منصب میں ایک ہزار اضافہ فرمایا، خان جہاں بہادر اب منصب ہفت ہزار سوار پر فائز ہوا، اس کے علاوہ خان جہاں کو ایک کوور دام بھی بطور انعام مرحمت فرمائے گئے۔

خان جہاں کے فرستادہ امیر محمد صالح کو جو خزانہ و اسپ فیل ہمراہ لے کر بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوا تھا، خلعت مرحمت ہوا اور اس کے ہمراہیوں کو ایک ہزار روپیہ بطور انعام مرحمت فرمائے گئے، قبلہء عالم نے عمدۃ الملک خان جہاں بہادر اور اس کے فرزندان باوفا کے لئے خلعت فاخرہ روانہ فرما کر تمام خاندان کو اضافہ و خطابات سے سرفراز فرمایا، جہاں پناہ نے فرمان تحسین وخلعت وغیرہ محمد میرک گرز بردار کی معرفت روانہ فرمایا۔

سنبھا پسر سیوا جی

خان جہاں کے معروضے کے مطابق سنبھا پسر سیوا جی کو شش ہزاری و شش ہزار سوار کا منصب دار مقرر فرما کر اَسّی لاکھ دام بطور انعام و نقارہ و علم مرحمت فرمائے فرمان وخلعت بھی محمد میرک کے توسط سے روانہ فرمائے گئے، اشرف خان خانِ سامان نے صدر الصدور رضوی خان کو گوشہء ماتم سے باہر نکالا اور حضور شاہی میں لے آیا، قبلہء عالم نے صدر الصدور کو خلعتِ تعزیت مرحمت فرما کر تخت گاہ روانہ ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

سکندر نشاں کی پیدائش

نو جمادی الاوّل کو بادشاہ زادہ محمد اعظم کے محل میں فرزند پیدا ہوا، جہاں پناہ نے مولود کو سکندر نشاں کے نام سے موسوم فرمایا اور شہزادہ کو خلعت و بچہ کو مالائے مروارید اور جہاں زیب بانو بیگم کو دس ہزار روپیہ مرحمت فرمائے۔

ہر سال جو رقم نذر حرمین شریفین کو روانہ کی جاتی تھی وہ اس سال بھی روانہ فرمائی گئی، عابد خاں میر حاج مقرر فرمایا گیا اور اسے خلعت رخصت مرحمت ہوا، قاضی عبدالوہاب اپنے مرضی کی وجہ سے تخت گاہ روانہ گئے اور سید علی اکبران کی نیابت میں کام کرنے کے لئے مامور ہوئے۔

عبداللہ خاں کاشغری اور عبداللہ قطبُ الملک کی وفات

عبداللہ خاں کاشغری جو جہاں پناہ کے سایہء عاطفت میں تخت گاہ میں زندگی بسر کر رہا تھا دوسری شعبان کو فوت ہوا، ناصر خاں اور مرحوم کے دیگر اعزاء خلعت کے عطیہ سے ماتم سے آزاد فرمائے گئے۔

انیس تاریخ کو معلوم ہوا کہ عبداللہ قطب الملک دنیادار حیدر آباد نے وفات پائی اور ابوالحسن اس کا برادرزادہ و داماد اس کا جانشین ہوا، سیادت خاں کے تغیر سے نامدار خاں منصب چہار ہزاری دو ہزار سوار پر بحال ہو کر اودھ کا صوبہ دار مقرر فرمایا گیا، مختار بیگ پسر اسلام خاں جو خانِ مذکور کے متعلقین کے ہمراہ جین میں قیام پذیر تھا، غائبانہ منصب ہفت صدی و دو صد سوار پر فائز فرمایا گیا۔

امانت خاں خالصہ مبارک کی خدمت سے سبکدوش ہوا اور دارالسلطنت لاہور کے عہدۂ حراست پر فائز ہوا، کفایت خاں پیش دست دفتر تن پیش دستی خالصہ کی خدمت پر بھی مقرر فرمایا گیا، خان زمان ولد اعظم خاں مرحوم صوبہ دار برار مقرر رہا، اور اصل و اضافہ کے اعتبار سے پنج ہزاری و سہ ہزار سوار کے منصب پر فائز ہوا۔

ابوالحسن دنیادار حیدر آباد نے قوام الدین حاجب کے ہمراہ نو لاکھ روپیہ و جواہر و فیل بطور پیش کش روانہ کئے، قوام الدین کو ملازمت و رخصت کے وقت خلعت عطا ہوئے۔

روح اللہ خاں منصب ہزار و پانصدی و چہار صد سوار پر بحال ہو کر سہارن پور کا فوج دار مقرر

کیا گیا۔

تربیت خاں، مکرم خاں، محمد اسحاق پسر دوم شیخ میر کے داروغہ بندہائے جلو مقرر فرمایا گیا۔

مکرم خاں اپنے بھائی شمشیر خاں محمد یعقوب کے ہمراہ ایک شائستہ فوج لے کر اس امر پر مامور ہوا کہ کتل جلوس (خابوش) کی سمت سے افغانوں پر حملہ آور ہو۔

مکرم خاں کی شکست

ستائیس ربیع الاوّل کو معلوم ہوا کہ مکرم خاں نے مکرر غنیم پر حملہ کیا اور اُن کے اکثر گھروں کو تاراج اور بے شمار باشندوں کو نظر بند کیا، ایک روز فتنہ پردازوں کی ایک قلیل جماعت نمودار ہوئی، مکرم خاں نے اس گروہ کو قلیل سمجھ کر اس پر حملہ کیا، حملہ کے بعد دو دستے حریف کے کمر کوہ کے ہر دو جانب سے نکل کر شاہی فوج پر حملہ آور ہوئے، شمشیر خاں و میر عزیز اللہ داماد شیخ میر نے غیرت و مردانگی سے کام کیا اور مردانہ وار میدان جنگ میں کام آئے، سپاہیوں کی بھی ایک کثیر تعداد قتل ہوئی اکثر سوار و پیادے بے آبی و برگشتہ راہی کی وجہ سے ہلاک ہوئے، شاہی لشکر کو شکست فاش ہوئی، اور ہر خرد و بزرگ مبتلائے مصیبت ہو رہا ہے۔

مکرم خاں معدودے چند زندہ سواروں کے ہمراہ اس سرزمین کے واقف کاروں کی رہنمائی سے عزت خاں تھانہ دار باجوڑ کے پاس پناہ گزیں ہے، عزت خاں جو ہمیشہ سے افغانوں کی سرکوبی کرتا رہا ہے اپنی برادری کے ہمراہ باجوڑ میں مقیم ہے، اس نے مکرم خاں اور اس کے ہمراہیوں کو اپنے دامن میں پناہ دے کر ہر طرح ان کی امداد و اعانت کی ہے، خاقان خدام پرور کو ایسے کار آموز بہادروں کی ہلاکت خصوصاً شمشیر خاں جیسے جواں مرگ بہادر کی موت سے بے حد رنج ہوا اور عزت خاں کی کارگزاری پسند آئی، قبلہء عالم نے حکم دیا کہ مکرم خاں حاضر بارگاہ ہو اور محتشم خاں کو فرمان تسلی عنوان و خلعت ماتمی روانہ فرمائے گئے۔

ربیع الاوّل کی تیس تاریخ بخشی الملک سر بلند خاں نو ہزار کی ایک جرار فوج اور ساز و سامان کے ساتھ شورہ پشت افغانوں کی تنبیہ کے لئے روانہ کیا گیا۔

سفید خاک اور بازارک کے ناموں کی تبدیلی

اعز خاں جلال آباد کی تھانہ داری پر مامور ہوا اور ہزبر خاں جگدلک کا تھانہ دار مقرر فرمایا گیا،

فراق جان لفانات کا اور اللہ داد خان غریب خانہ کے تھانے دار مقرر ہوئے، سہراب ولد گرشاسپ کو دنکلی کی اور خنجر خاں کو بنگشات کی فوج داری مرحمت ہوئی جہاں پناہ نے حکم دیا کہ آئندہ سے سفید خاک کو مغل آباد اور بازارک کو فتح آباد کے نام سے موسوم کریں۔

افغانوں کی شکست

فوج فدائی خاں کے واقعہ نویس نے اطلاع دی کہ سترہ ربیع الآخر کو کابل روانہ ہوا، خان مذکور نے اپنے بہادر سپاہیوں کی مدد سے افغانوں کو بے حد پامال کیا، اور ان کے مکانوں اور ملک کو بخوبی تاخت و تاراج کر دیا، اور حریف کو برباد کرنے میں پوری جاں نثاری و مردانگی سے کام لے کر ان کو نیست و نابود کیا، جہاں پناہ اس امیر کی کوشش و کارگزاری سے بے حد خوش ہوئے اور بادشاہ خدام نواز نے خان مذکور اعظم خاں کوکہ کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔

دوبارہ مقابلہ

چودہ جمادی الآخر کو معلوم ہوا کہ ہژبر خاں تھانہ دار جگدلک اور افغانوں میں مقابلہ ہوا، وہ مع اپنے فرزند و دیگر سواروں کے میدان جنگ میں کام آیا اور عبداللہ خاں خویشگی بارنگ تھانہ کو چھوڑ کر فرار ہوا اور ایک گروہ کثیر اس کے ہمراہیوں کا قید و قتل ہوا۔

افغان قیدی

نویں شعبان کو امین خان کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ عالم خاں و اسمٰعیل خاں و دیگر شاہجہاں پُور و کانت گولہ کے شورش انگیز افغانوں کو شاہی فوج نے گرفتار کر لیا ہے اور قیدی ابراہیم خاں کے ہمراہ جو بنگالہ سے آ رہا ہے حضور شاہی میں روانہ کر دیئے گئے ہیں۔

بختاور خاں نے بادشاہ دین پناہ و حق آگاہ کے حکم سے بادشاہی نجومیوں و شہزادوں کے ملازم اختر شناسوں سے اس مضمون کے مچلکے حاصل کئے کہ سالِ نو کے آغاز پر جنم پتریاں نہ بنائیں، اور نیز اسی مضمون کے احکام دیگر صوبہ جات کو بھی روانہ کئے گئے۔

شہزادہ محمد سلطان کے میر سامان محمد شفیع کی حویلی کے کنویں میں ایک ڈول گر پڑا اور دو اشخاص پیہم ڈول نکالنے کے لئے کنویں میں اُترے اور فوراً مر گئے، تیسرا شخص کنویں میں اُتارا گیا،

فکشن ہاؤس کی نئی کتابیں

1- تہذیب کی کہانی:(1) پتھر کا زمانہ	ڈاکٹر مبارک علی	200/-
2- تہذیب کی کہانی:(2) کانسی کا زمانہ	ڈاکٹر مبارک علی	250/-
3- تہذیب کی کہانی:(3) لوہے کا زمانہ	ڈاکٹر مبارک علی	250/-
4- جاگیرداری	ڈاکٹر مبارک علی	180/-
5- سہ ماہی تاریخ نمبر(29)	ایڈیٹر: ڈاکٹر مبارک علی	100/-
6- گاندھی جی بادشاہ خاں کے دیس میں	پیارے لال	140/-
7- سقراط	اسلم گورداسپوری	280/-
8- ازدواجی زندگی	قاضی جاوید	180/-
9- چلتے رہیے تندرست رہیے	ستیش گوئل/ترجمہ: ڈاکٹر اقبال کاردار	120/-
10- ذیابیطس سے خوف کیوں؟	ڈاکٹر اشونی بھردواج/ ترجمہ: ڈاکٹر اقبال کاردار	120/-
11- افلاس، سماجی ناہمواریاں اور ترقی کا تصور	ریاض احمد شیخ	100/-
12- دہشت گردی اور سامراج	معظم کاظمی	100/-
13- اقبال نامہء جہانگیری	میرزا محمد عرف معتمد خاں/ ترجمہ: محمد زکریا	160/-
14- تذکرۃ الواقعات	جوہر آفتابچی/ترجمہ: سید معین الحق	140/-
15- بھگت کبیر (نیا ایڈیشن)	ہری اودھ	200/-
16- دردر ٹھوکر کھائے (نیا ایڈیشن)	ڈاکٹر مبارک علی	120/-
17- برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا المیہ (نیا ایڈیشن)	ڈاکٹر مبارک علی	90/-
18- تاریخ اور عورت (نیا ایڈیشن)	ڈاکٹر مبارک علی	120/-
19- تاریخ کی روشنی (نیا ایڈیشن)	ڈاکٹر مبارک علی	120/-

فکشن ہاؤس کی نئی کتابیں

20- انقلاب اور ردِ انقلاب	رانا شوکت محمود	600/-
21- میرے حصے کی روشنائی	نور ظہیر	100/-
22- فلسفہ کیا ہے: ایک نئی مادی تعبیر	اشفاق سلیم مرزا	100/-
23- رفتہ (ناول)	سلیم شاہد	300/-
24- بسواس (افسانے)	آکاش	100/-

English Books

1. **The English Factory In Sindh**
   Dr. Mubarak Ali......................Rs:150.00
2. **Essays On The History of Sindh**
   Dr. Mubarak Ali......................Rs:200.00
3. **Sindh Observed**
   Dr. Mubarak Ali......................Rs:350.00
4. **A Social And Cultural History Of Sindh**
   Dr. Mubarak Ali......................Rs:450.00
5. **Ulema, Sufis And Intelectuals**
   Dr. Mubarak Ali......................Rs:300.00
6. **Sikh History From Persian Sources**
   J.S.Grewal / Irfan Habib..................Rs:300.00
7. **Prehistory (1)**
   Irfan Habib..Rs:180.00
8. **The Indus Civilization (2)**
   Irfan Habib..Rs:250.00
9. **The Vedic Age (3)**
   Vijay Kumar Thakur / Irfan Habib......Rs:200.00
10. **Mauryan India (4)**
    Irfan Habib / Vivekanand Jha......Rs:450.00

اس شخص نے آدھے ہی راستے چلانا شروع کیا کہ مجھ کو نکالو یہ شخص اوپر کھینچ لیا گیا، اور معلوم کیا کہ قطعاً بے ہوش ہے تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آیا اور بیان کیا کہ کنویں میں ایک سیاہ رنگ کی بلا رہتی ہے مجھ کو دیکھتے ہی زور سے چلاّئی کہ کہاں آتا ہے۔

پرہز بانو بیگم کی وفات

تخت گاہ کے واقعہ نویس نے اطلاع دی کہ نواب قدسیہ پُرہز بانو بیگم جہاں پناہ کی خواہر علاتی نے وفات پائی، بیگم مرحومہ حضرت فردوس آشیانی کی وہ دختر تھیں جو قندھاری محل یعنی مرزا حسین صفوی کی دختر کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں اور اعلیٰ حضرت کی تمام اولاد میں بہ اعتبار عمر کے سب سے بڑی تھیں، صفی خان ناظم و دیگر حکام صوبہ نے مرحومہ کو خود انہیں کے نصب کردہ باغ میں دفن کیا۔

❁❁❁❁❁

ماہنامہ بدلتی دنیا کراچی

ایڈیٹر: یاسین شیخ

اسسٹنٹ ایڈیٹر: میاں آفتاب احمد کم ذات

رابطہ آفس: 513 یونی شاپنگ سینٹر عبداللہ ہارون روڈ صدر، کراچی